سازش

طارق اسمٰعیل ساگر



بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں قارئین کے مطالعے اور دعوتی واصلاحی مقاصد کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔



واپسی

گھڑی کی سوئیاں رات کا ایک بجا رہی تھیں اور دُور دُور تک کسی ذی نفس کا نام ونشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

گہری رات کا اسرار بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

شام سے چلنے والی پُروائی ہَوا اچانک رُک گئی تھی جس سے جنگلی گھاس کی سرسراہٹ بھی تھم گئی تھی اور جب کوئی جنگلی جانور گھاس کے اس طویل سلسلے میں بہت فاصلے سے بھی داخل ہوتا تو معمولی سی کھڑکھڑاہٹ پر وہ چوکس ہو جاتے۔

لیکن ——

ابھی تک وہ نہیں آیا تھا جس کا انھیں انتظار تھا۔

جس کے لیے انھوں نے یہاں خصوصی ناکے لگا رکھے تھے۔ مُخبر بڑے اعتماد کا آدمی تھا۔ اس بات کا سوال ہی نہیں اُٹھتا تھا کہ اس نے غلط اطلاع دی ہو۔ اِس سے پہلے موہن کی فراہم کردہ اطلاع کبھی غلط ثابت نہیں ہوئی تھی ——

"اِس مرتبہ موہنا غلطی تو نہیں کھا گیا ——"

انسپکٹر چُونی لال نے اپنے سکھ حوالدار بھگت سنگھ کے کان میں سرگوشی کی۔

"سَر! ایسا ممکن نہیں —— بی ایس ایف (بارڈر سیکورٹی فورسز) کے پاس اس سے زیادہ قابلِ اعتماد مُخبر اس علاقے میں اور کوئی نہیں ہے ——"

بھگت سنگھ نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہُوئے کہا

"مَیں بھی حیران ہوں۔ رات کے دو بج رہے ہیں اور ابھی تک . . ."

انسپکٹر چُونی لال اچانک کچھ کہتے کہتے رُک گیا۔

اُس کے حسّاس کانوں نے شاید وہ مخصوص آہٹ سُن لی تھی جس کے لیے شام چھ بجے کے بعد سے وہ لوگ یہاں مورچہ بند ہوکر بیٹھے ہُوئے تھے۔

بارڈر سیکورٹی فورسز کے کیمپ ہیڈ کوارٹر میں تعینات انسپکٹر چُونی لال اپنے ہم کاروں میں "چُونی قصائی" کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اُس کے متعلق مشہور تھا کہ اُس کی چھری کے نیچے آنے والا بکرا کبھی بچ کر نہیں جاسکتا۔

بھارت کی ہزاروں میل لمبی سرحد پر اُس نے قریبًا ہر بڑی جگہ ڈیوٹی دی تھی، جہاں بھارت کی سرحدی فورس کا پایا جانا ممکن ہوسکتا تھا۔ چُونی لال بی ایس ایف میں سپاہی کے عُہدے سے ترقی کرتے ہُوئے انسپکٹر بنا تھا۔

جب سے پنجاب میں سمگلروں نے زور پکڑا تھا تب سے اُس کی مستقل ڈیوٹی پنجاب کے ہی سرحدی علاقوں میں لگائی جارہی تھی اور گزشتہ دس سال سے اُس نے گنگا نگر سے جموں تک کی سرحد پر ہر حسّاس مقام پر پہرہ دیا تھا۔

گزشتہ تین سال سے اسے انسپکٹر کے عہدے پر ترقی دے کر بی ایس ایف کی خصوصی چھاپہ مار ٹیم میں شامل کرلیا گیا تھا۔ اس ٹیم کی حیثیت بی ایس ایف میں وہی تھی جو جرمن افواج میں گسٹاپو کی ہُوا کرتی تھی۔

افسروں کا چہیتا ہونے کی وجہ سے کوئی بھی چُونی لال کے مُنہ لگنا پسند نہیں کرتا تھا سب جانتے تھے کہ وہ افسروں کا مُنہ چڑھا ہے اور اس کی بات کو افسران خواہ مخواہ زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

چُونی لال کسی بھی پوسٹ کے نزدیک ناکہ لگانے سے پہلے کبھی متعلقہ پوسٹ کو خبردار نہیں کرتا تھا نہ ہی کسی کو اعتماد میں لینے کی ضرورت سمجھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر اُس نے متعلقہ پوسٹ ہی کی مدد سے ناکہ بندی کرنی ہے تو پھر خصوصی ناکہ لگانے کا تو مقصد ہی فوت ہوجاتا تھا۔

یہ بات تھی بھی سچ ــــ!

بی ایس ایف میں لوگ جانتے تھے کہ بیشتر سمگلر پوسٹ کمانڈروں کو "ناکہ بھرنے" کے بعد ہی اپنا مال اِدھر سے اُدھر یا اُدھر سے اِدھر لایا اور لے جایا کرتے تھے۔ اگر انھیں یہ خبر ہوجاتی کہ اُن پر خصوصی نگرانی کے ساتھ ناکہ لگایا جارہا ہے تو وہ اپنے دوست سمگلروں کو صورت حال سے باخبر کردیتے اور ناکے کا مقصد ہی فوت ہوجاتا۔ اس روز بھی جب چُونی لال چھٹی کاٹ کر واپس ڈیوٹی پر آیا تو ڈپٹی کمانڈنٹ نے اُسے فوراً رپورٹ کرنے کو کہا تھا۔

چُونی لال کے لیے اس اچانک حکم کا مطلب واضح تھا ــــ!

وہ جانتا تھا کہ اسے کوئی نئی مہم سونپی جارہی ہے ــــ

"آگئے چُونی لال ــــ"

ڈپٹی کمانڈنٹ نے اُس کے سلیوٹ کی آواز پر نظریں اٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔

"یس سر!" ــــ

چُونی لال مؤدب تھا۔

ڈپٹی کمانڈنٹ نے اپنے سامنے دھری فائل بند کرکے ایک طرف رکھ دی اور وہاں کھڑے حوالدار کلرک کو وہاں سے جانے کا اشارہ کرنے کے بعد انسپکٹر چُونی لال کو اپنے سامنے کُرسی پر بٹھا لیا۔

"چُونی لال ــــ اس مرتبہ معاملہ ذرا مختلف ہے ــــ"

"مَیں سمجھا نہیں سر!" ــــ

انسپکٹر چُونی لال نے قدرے حیرانگی سے پوچھا۔

"دیکھو چُونی لال آج سے پہلے تم جاسوسوں اور سمگلروں کو ہی پکڑتے آتے ہو۔ لیکن اس مرتبہ تمھیں بڑے خطرناک چور کو گرفتار کرنا ہے ــــ"

ڈپٹی کمانڈنٹ نے کہا اور چُونی لال مُسکرا دیا کیونکہ یہ اُس کے لیے کوئی ایسا کام نہیں تھا جسے وہ پہلے سے کوئی مختلف کام سمجھتا۔

"سر! یہ تو معمول کی بات ہے۔ چور بھی انسان ہی ہوتے ہوں گے۔ سمگلروں

اور جاسوسوں سے زیادہ خطرناک تو ہونے سے رہے ۔۔۔"
انسپکٹر چُونی لال نے کہا۔

"نہیں انسپکٹر ۔۔۔ اگر عام قسم کے ملزم ہوتے تو سرحد پر کتنی ایجنسیاں موجود ہیں کوئی نہ کوئی تو اسے پکڑ ہی لیتا ۔۔۔ اس مرتبہ تم نتھو خاں کو پکڑنے جا رہے ہو ۔ کہنے کو تو وہ عام قسم کا اٹھائی گیرا ہے لیکن گزشتہ پندرہ سال سے اُس نے بھارتی علاقے میں موجود دیہاتوں میں دہشت پھیلا رکھی ہے ۔۔۔ بڑے مضبوط پہرے سے بھی وہ بڑی آسانی سے ڈھور ڈنگر کھول کر لے جاتا ہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ اُسے گرفتار کرنے کے لیے گزشتہ پانچ سال سے تو کتنی کوششیں مَیں خود کر چکا ہوں ۔ لیکن ہر دفعہ ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا ۔۔۔ چُونی لال یہ نتھو خاں انسان نہیں چھلاوہ ہے چھلاوہ خطرے کی بُو میلوں دُور سے سُونگھ کر یوں غائب ہوتا ہے جیسے اُسے زمین نے نگل لیا ہو یا آسمان نے اُچک لیا ہو"
ڈپٹی کمانڈنٹ نے کہا۔

"حیرت ہے سر ! آپ کو بھی ۔۔۔"

چُونی لال حیران تھا کہ ایک معمولی جانور چور بھی بی ایس ایف کے قابو نہیں آ رہا تھا اُس نے احتراماً اپنی بات نامکمل ہی چھوڑ دی تھی ۔

"چُونی لال اس کمبخت نتھو خاں کی چوریوں سے تنگ آ کر پندرہ سولہ دیہاتوں کے رہنے والوں کا ایک نمائندہ وفد دلّی تک جا پہنچا ہے ۔ ان لوگوں نے باقاعدہ شکایت کی ہے کہ اگر اس مصیبت سے ان کو چھٹکارہ نہ دلایا گیا تو وہ اس پر زبردست احتجاجی تحریک شروع کر دیں گے ۔"

ڈپٹی کمانڈنٹ کی سنجیدگی دیکھ کر انسپکٹر چُونی لال بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ واقعی دال میں کچھ کالا ہے ۔ اگر یہ کوئی عام قسم کا سمگلر ہوتا تو کم از کم اُسے زحمت نہ دی جاتی ۔ حالانکہ اُس کے ذہن نے ابھی تک اس بات کو تسلیم نہیں کیا تھا کہ کوئی مویشی چور اتنا طاقتور ہو سکتا ہے کہ بھارت کی بارڈر سکیورٹی فورس ہی کو نچا کر رکھ دے ۔

"مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں سر ! کہ اگر واقعی یہ اطلاع صحیح ہے جس پر ہم سرحد کی خصوصی ناکہ بندی کرنے جا رہے ہیں تو پھر دُنیا کی کوئی طاقت نتھو کو اس مرتبہ بچا نہیں سکے گی ۔۔۔"
اُس نے بڑے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"چُونی لال ۔۔۔ تم حیران تو ہو گے کہ آج مَیں کیسی باتیں کر رہا ہوں لیکن اپنی سابقہ نوکری اور تجربے کی بنیاد پر تم سے یہی کہوں گا کہ فی الحال کوئی دعویٰ نہ کرو ۔۔۔ اِس بات میں کوئی شک نہیں کہ تم ہماری فورس کے لیے سرمایۂ افتخار ہو اور کئی ناممکن اور بظاہر انتہائی مشکل مہمیں تم نے سَر کی ہیں ۔۔۔ لیکن اس مرتبہ معاملہ مختلف ہے۔ مَیں تمھیں یہی نصیحت کروں گا کہ اپنی چوکسی میں کمی نہ آنے دینا اور مقامی پوسٹ والوں کو اعتماد میں لیے بغیر ہی کوئی کارروائی کرنا ۔۔۔ مَیں نے کمپنی ہیڈکوارٹر کو ہدایت کر دی ہے کہ تمھیں جتنی فورس کی ضرورت ہو تمھاری درخواست پر دے دی جاتے اور ہاں انھیں بھی مَیں نے اندھیرے میں رکھا ہے ۔۔۔ اور یہ بتایا ہے کہ اس مرتبہ ناکہ بندی جاسوسوں کے ایک گروہ کے لیے کی جا رہی ہے ۔۔۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے کہ تم نتھو خاں کی سرکوبی کے لیے جا رہے ہو ۔۔۔ سمجھ گئے ناں ۔۔۔"
ڈپٹی کمانڈنٹ نے اس طرح سرگوشی کے انداز میں اس کی طرف جھکتے ہوئے بات کی تھی جیسے اُسے دیواروں سے بھی خطرہ ہو ۔

جس طرح کمپنی کمانڈنٹ نے انسپکٹر چُونی لال کی شکل میں اپنا خصوصی فورس کا دستہ بنا رکھا تھا اسی طرح بی ایس ایف کی انٹیلی جنس نے بھی اس علاقے میں اپنے مُخبروں کا خصوصی جال بچھا رکھا تھا ۔ یہ مُخبر مقامی پوسٹوں سے رابطہ نہیں رکھتے تھے اور کوئی بھی اہم اطلاع ملنے پر براہِ راست مقامی کمانڈر سے رابطہ کرتے تھے ۔

موہن سنگھ کا شمار بھی ایسے ہی مُخبروں میں ہوتا تھا ۔۔۔

ڈپٹی کمانڈنٹ کا خاص آدمی ہونے کے سبب اُسے بہت سی رعایتیں حاصل تھیں۔ مقامی پوسٹ والوں کو تو کبھی اس کی طرف میلی نظر سے دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی ۔

انھیں سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ موہن کے خلاف کوئی بھی کارروائی کرنے سے پہلے وہ کمپنی کمانڈر سے اجازت لیں گے جس کے بعد ہی انھیں کچھ کرنے کا اختیار ہوگا۔

موہن سنگھ کو اپنی اہمیت کا احساس تھا اور اُس نے بی ایس ایف کی اس کمزوری کا فائدہ اُٹھا کر مُخبری کے چکر میں اپنا دھندہ بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ مقامی سمگلروں سے اس کام میں باقاعدہ حصّہ لیتا تھا اور جو کوئی اُسے حصّہ دینے سے انکار کرتا اُس کے خلاف "ناکہ" لگوا کر اُس کو گرفتار کروا دیتا۔

موہن کو ڈپٹی کمانڈنٹ نے بطورِ خاص یہ مہم سونپی تھی اور آج اُس کی طرف سے فراہم کردہ اطلاع کی بنیاد پر اُس نے انسپکٹر چُونی لال کی کمان میں اس علاقے میں ناکہ بندی کی ہوئی تھی۔

O

چُونی لال نے اچانک ہی بھگت سنگھ کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اُن کا شکار اس طرف آ رہا ہے۔

جس جگہ اُن لوگوں نے ناکہ لگایا تھا وہاں سے تقریباً ایک فرلانگ کی دُوری پر زمین میں وہ خصوصی آلات دبا دیئے گئے تھے جو بہت دُور سے آنے والے قدموں کی چاپ کئی گنا بڑھا کر انھیں سُنا سکتے تھے۔

یہ آلات حال ہی میں بی ایس ایف نے درآمد کیے تھے اور انھیں خاص موقعوں پر ہی استعمال کیا جاتا تھا۔

"ہوشیار"

انسپکٹر چُونی لال نے اپنے ہاتھ میں پکڑے واکی ٹاکی کے ذریعے اپنے جوانوں کو سگنل پاس کر دیا اور اس کے ساتھی ایک خاص ترتیب سے پھیلائے گئے مورچوں میں چوکس ہو کر بیٹھ گئے ——

انھیں اب چُونی لال کے اگلے اشارے کا انتظار تھا جس کے بعد ہی انھوں نے فائرنگ شروع کرنی تھی۔ یہ تمام نوجوان ڈسپلن کے سختی سے پابند اور کسی بھی ہنگامی

صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ہر دم تیار رہتے تھے۔

انسپکٹر چُونی لال نے اب اپنی آنکھوں سے وہ دُوربین لگا لی تھی جس کے شیشے رات کے اندھیرے میں دن کی روشنی کی طرح منظر عیاں کرنے کی طاقت رکھتے تھے —!!

جس طرح ڈپٹی کمانڈنٹ صاحب نے اُسے ملزمان سے متعلق اطلاعات منتقل کی تھیں اس کے بعد سے انسپکٹر چُونی لال نے تو یہی سمجھا تھا کہ آنے والے ایک گروپ کی صورت میں ہوں گے اور ان کے پاس جدید ترین آٹومیٹک اسلحہ ہوگا۔

لیکن ——

اچانک ہی اگر وہ خود پر قابو نہ رکھتا تو اس کی ہنسی نکل جاتی کیونکہ اب دو ہیولے دُوربین کے شیشوں کی مدد سے نمایاں ہونے لگے تھے ——

یہ دونوں ایک دوسرے کے تعاقب میں لیکن بڑی ہوشیاری کے ساتھ ایک دوسرے سے تقریباً پندرہ بیس فٹ کا فاصلہ درمیان میں رکھنے کے بعد بھارتی علاقے میں ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔

دونوں نے عام سی رائفلیں اُٹھا رکھی تھیں ——

آگے چلنے والے نے سٹین گن اور اُس کے تعاقب میں آنے والے نے شاید کلاشنکوف تھام رکھی تھی۔

دونوں سیدھے انسپکٹر چُونی لال کے پھیلائے ہوئے جال کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اچانک ہی چُونی لال نے انھیں رُکتے دیکھا۔ آگے چلنے والے نے رُک کر اپنا بایاں ہاتھ بلند کیا تھا۔ یہ شاید کوئی اشارہ تھا جو اس نے اپنے تعاقب میں آنے والے کو دیا اور وہ اس طرح اچانک رُکا تھا جیسے بجلی کے بٹن سے اسے چلایا جا رہا ہو ——

آگے چلنے والا اب زمین پر اکڑوں بیٹھا شاید فضا میں خطرے کی بُو سُونگھنے میں کوشاں تھا یا پھر اپنے کانوں کی مدد سے کوئی آہٹ سُننے کا منتظر تھا۔

اگلا لمحہ چُونی لال کو چونکا دینے والا تھا جب آگے چلنے والے نے بیٹھے بیٹھے اپنے ساتھی کو دائیں ہاتھ میں پکڑی سٹین گن لہرا کر خدا جانے کیا سگنل دیا اس نے بجلی کی سی

پھرتی سے اپنی کمر سے بندھے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر شاید اُس میں سے گرنیڈ نکال لیا تھا۔!
چُونی لال کو اب سمجھ آگئی تھی کہ اُس کے ڈپٹی کمانڈنٹ اتنے سیریس کیوں تھے!
انسپکٹر چُونی لال تو بڑے اطمینان سے ان کے لیے جال بچھاتے بیٹھا تھا کہ دونوں بکرے اُس کی مرضی کے مطابق اس میں پھنس جائیں گے اور وہ انہیں " ہالٹ " کہہ کر گرفتار کر لے گا۔

لیکن ——

یہ تو انسان کم اور چھلاوے زیادہ دکھائی دے رہے تھے۔ جنھوں نے اچانک ہی اپنا رُخ بدل لیا تھا اور اب تربیت یافتہ فوجیوں کی طرح ایک دوسرے کی سمت اپنی پُشت کر کے اچانک ہی دائیں ہاتھ گھوم رہے تھے ——

اس کا مطلب یہ تھا کہ انھوں نے اپنا موجودہ راستہ اچانک بدل کر اور ایک لمبا چکر کاٹ کر اس طرف آنے کا منصوبہ بنایا ہوگا اور اُن دونوں کے خالی ہاتھوں میں پکڑے دستی بم اس بات کا اشارہ دے رہے تھے کہ وہ زمین پر بیٹھی بطخوں کی طرح بی ایس ایف کے قابو آنے والے بھی نہیں ہیں ——!

انسپکٹر چُونی لال کے دل کی دھڑکن اچانک ہی اس وقت بڑھ گئی جب اُس نے دیکھا کہ دونوں نے دائیں سمت چلتے چلتے اپنا رُخ اچانک بدلا اور اب اس انداز میں بائیں طرف ایک دائرہ سا بنا کر گھومے تھے کہ اپنی دانست میں انھوں نے کم از کم سوڈیڑھ سو گز دُور دُور تک پھیلے ناکہ بندوں سے خود کو محفوظ کر لیا تھا ——

یہ بڑا اہم جنگی داؤ تھا جو انھوں نے کھیلا — دونوں کی پسپائی کا انداز تو یہ بتا رہا تھا جیسے وہ کسی انتہائی تربیت یافتہ فوج کے کمانڈو گروپ سے تعلق رکھتے ہیں اور کسی بھی قسم کی اچانک پیش آمدہ صورتحال سے نمٹنے کی انھوں نے خصوصی تربیت حاصل کر رکھی ہے۔

جس طرح انھوں نے دائیں ہاتھ دائرہ کاٹ کر اپنا رُخ اچانک انسپکٹر چُونی لال کے بائیں ہاتھ موڑا تھا۔ اگر وہ اسی طرح کا ایک اور سوڈیڑھ سو گز کا دائرہ اس طرف سے بھی کاٹ جاتے تو پھر انسپکٹر چُونی لال اور اُس کے مورچہ بند ساتھی سوائے ان کا منہ دیکھنے

کے اور کچھ نہ کر پاتے۔
اُن کی تمام تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتیں ——!
وہ تو اپنی دانست میں اس طرح جال پھیلائے بیٹھا تھا کہ دونوں مچھلیوں کا بچ جانا ممکن ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

اگر وہ چند منٹ اور شش و پنج میں مبتلا رہتا تو دونوں بڑے اطمینان سے اس کی گرفت سے نکل جاتے گو کہ انسپکٹر چُونی لال کے طے شدہ پلان کے مطابق ابھی یہ لوگ اس مقام پر نہیں پہنچے تھے کہ وہ حملہ آور ہوتا۔

لیکن ——

وہ اس طرح بے بسی سے اپنی شکست کا تماشا تو نہیں دیکھ سکتا تھا۔

" موو " ——

اُس نے چلاتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی۔

" ہالٹ —— ہالٹ " ——

تمام مورچوں سے آوازیں بلند ہوئیں۔

لیکن ——

دونوں نے ہتھیار پھینک کر ہاتھ کھڑے کرنے کے بجائے اپنے ہاتھوں میں پکڑے دستی بم ایک دوسرے کے مخالف سمت میں بلند ہوتی للکار کے تعاقب میں اس طرح پھینکے تھے کہ پہلے ہی ہلے میں بی ایس ایف کے دو جوان ٹھنڈے کر دیئے۔ ان بیچاروں کو ایک گولی بھی فائر کرنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔

اس کے ساتھ ہی اُن کے بازوؤں میں بجلیاں بھر گئیں ——

انھوں نے وقفے وقفے سے اس طرح دستی بم پھینکے تھے کہ انسپکٹر چُونی لال اور اس کے ساتھی بوکھلا کر رہ گئے۔ شاید اس کی زندگی میں پہلی مرتبہ یہ موقعہ آیا تھا کہ اُس کے ہمراہی نشانہ باندھے بغیر اندھا دُھند فائرنگ کر رہے تھے۔

انھیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ دونوں گئے کس طرف ہیں اور وہ فائرنگ کس طرف

کر رہے ہیں ——

انسپکٹر چُونی لال نے دُور بین گلے میں لٹکالی تھی اور بھگت سنگھ کو اشارہ کر دیا تھا جس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی گن سے "روشنی راؤنڈ" فائر کرنے شروع کر دیئے۔ اس طرح کم از کم وہ لوگ دونوں کی صحیح پوزیشن کا اندازہ تو کر لیتے ——

لیکن ——

انھیں تو جیسے زمین نگل گئی تھی یا پھر آسمان نے اُچک لیا تھا کیونکہ فضا تو دن کی طرح روشن ہو گئی تھی لیکن وہاں سوائے گھاس کے چاروں طرف پھیلے جنگل کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اس لمبی جنگلی گھاس کے آگے جس میدانی علاقے میں انھوں نے ناکہ بندی کر رکھی تھی وہاں سے دونوں اچانک غائب ہو کر شاید اسی جنگلی گھاس میں داخل ہو گئے تھے ——

سرحد کے دونوں اطراف میلوں تک پھیلتی اس جنگلی گھاس میں ان کے داخل ہو جانے کا مطلب یہ تھا کہ اب بھارت کی ساری فوج بھی اگر انھیں تلاش کرنے کے مشن پر نکل جاتی تو انھیں ڈھونڈھ نہ پاتی ——

یہ جنگلی گھاس کا سلسلہ جسے مقامی لوگ "بیلا" کہتے تھے۔ بانس کے درخت کی طرح بڑھتا اور جنگل کی آگ کی طرح پھیلتا چلا جاتا تھا۔

انسپکٹر چُونی لال کو کچھ اور تو نہ سُوجھی اُس نے اپنی گن اٹھائی اور مورچے سے باہر نکل آیا۔ اُس کے ساتھی بھی اس کے تعاقب میں لپکے اور سب لوگ اندھا دھند گھاس کے اُس طویل سلسلے پر گولیوں کا مینہ برسانے لگے جس میں اُن کے خیال کے مطابق دونوں اچانک غائب ہو گئے تھے۔

آہستہ آہستہ آسمان کی بلندی سے گرتے روشنی راؤنڈز کی زندگی ختم ہوتی چلی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک مرتبہ پھر اندھیرا اُن کا مقدر بن گیا ——

انسپکٹر چُونی لال کو زندگی میں پہلی مرتبہ اس نوعیت کی بے بسی کا احساس ہوا تھا۔

اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اُس کا مقابلہ واقعی انسانوں سے تھا یا جنّوں سے ——!

اس طرح تو جنّ بھی اس کے بچھائے جال سے نکل کر نہیں جا سکتا تھا جس طرح وہ دونوں نکل گئے تھے۔

اپنے بیس جوانوں کے خصوصی دستے کے ساتھ وہ سر جھکائے مقامی پوسٹ کی طرف جا رہا تھا۔ پوسٹ کمانڈر نے اُس کی ایک جھلک دیکھتے ہی اندازہ کر لیا تھا کہ اِس مرتبہ چُونی لال کو ہزیمت اٹھانی پڑی ہے۔

اُس کے دِل میں خوشی کے لڈو پھُوٹنے لگے تھے۔

یہی حال پکٹ پر موجود باقی جوانوں کا تھا ——

انھوں نے طویل مدت کے بعد پہلی مرتبہ چُونی لال کو ناکام لوٹتے دیکھا تھا۔

"کیا بات ہے انسپکٹر صاحب آپ اور خالی ہاتھ ——"

"پکٹ کمانڈر لکھی رام نے طنزیہ انداز سے کہا۔

"لکھی رام — کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے —— خصوصاً جب گھر کے بھیدی لنکا ڈھانے پر تُل جائیں تو یہی صورت حال پیش آیا کرتی ہے" ——

انسپکٹر چُونی لال نے کہا ——!

"میں دوسری بات کہوں گا مہاراج —— بُرا مت مانیئے گا کبھی کبھی گھر کے لوگوں کو بھی گھر کے بھید میں شامل کر لینا ہی بہتر ہوتا ہے —— اس طرح اپنی طاقت بڑھ جاتی ہے ——"

لکھی رام بھی پرلے درجے کا شاطر تھا۔

انسپکٹر چُونی لال نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور پکٹ کمانڈر سے ملحقہ کمرے میں چلا گیا۔

اُسے رہ رہ کر دونوں کے ہاتھ سے نکل جانے کا غم کھائے جا رہا تھا۔ دونوں کی روانگی بھی جنّوں کی طرح ہوئی تھی ——

جس طرح جنّ کسی انسان کے جسم سے نکلتے ہوئے عامل کو کوئی نشانی دے کر جایا کرتے ہیں اسی طرح وہ دونوں بھی جاتے جاتے اُسے دو لاشوں کا تحفہ بھی دے گئے

تھے ___!

اس کے دو جوان مارے گئے تھے اور دشمن کا کوئی نقصان نہیں ہوا تھا ___

یہ پچھتاوہ اُس کی جان کو آ گیا تھا ___

اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کے جال کی طرف آتی یہ دونوں مچھلیاں اچانک کس طرح کھلے سمندر میں واپس لوٹ گئیں ___

"کہیں مقامی پکٹ سے تو انھیں خطرے کا سگنل نہیں مل گیا تھا"؟

اس نے سوچا پھر خود ہی "ناں" میں گردن ہلا دی ___

اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ___

اس نے اپنے سابقہ تجربے کی بنیاد پر اس بات کا تو بطورِ خاص خیال رکھا تھا اور پکیٹ پر کڑی نظر رکھی تھی۔ یوں بھی اگر ایسا ہوتا تو وہ دونوں اس طرف کا رُخ ہی نہ کرتے اور سرحد سے ہی واپس لوٹ جاتے۔

انھوں نے تو پاکستانی سرحد سے قریبًا ایک کلومیٹر اندر ناکہ لگایا تھا اتنے نزدیک آ کر اُن کے واپس لوٹنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ___

کہیں اس کے اپنے ساتھیوں میں تو کوئی آستین کا سانپ موجود نہیں "___؟

کچھ دیر تک اس مفروضے پر ذہن لڑانے پر بھی اسے نفی میں جواب ملا اُس نے اپنی آنکھوں سے دُوربین لگا رکھی تھی اگر کسی نے کوئی سگنل دیا تھا تو اُسے ضرور نظر آ جاتا ___!

اچانک ایک خیال اُس کے ذہن سے ٹکرایا اور اُس نے فوراً بھگت سنگھ کو اپنے پاس طلب کر لیا۔

"تین نمبر مورچے پر کون کون تھا"

اُس نے بھگت سنگھ کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

"سر! دونوں بہاریئے . . . "

"بلاؤ انھیں ___"

چُونی لال نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

حوالدار بھگت سنگھ اُلٹے قدموں واپس لوٹ گیا اور اگلے ہی لمحے دونوں "بہاریئے" اُس کے سامنے تھے۔

اُن دونوں کا تعلق صوبہ بہار سے تھا اور حال ہی میں انھیں انسپکٹر چُونی لال کے خصوصی سکواڈ میں شامل کیا گیا تھا۔

"تم کون سی بیڑی پیتے ہو ___"

انسپکٹر چُونی لال نے اچانک ہی اُن میں سے ایک سے سوال کیا۔

"سر! مَیں تو سگریٹ پیتا ہوں ___ یہ بیڑی پیتا ہے" ___

ایک نے گھبرا کر دوسرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"بے وقوف آج تمھاری وجہ سے دو اہم سمگلر ہمارے دو ساتھیوں کو مار کر نکل گئے ___ تمھاری معمولی غلطی کی وجہ سے" ___

اُس نے قدرے غصیلی آواز میں کہا۔

"صاحب! مَیں سمجھا نہیں ___ وِشنو ماں کی سوگندھ ہے صاحب اَپن نے کچھ نہیں کیا ___"

بیڑی نوش بہاریئے نے اُس کے سامنے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

"دیکھو مَیں چاہوں تو ابھی تمھیں یہاں سے جیل کی کال کوٹھڑی میں پہنچا سکتا ہوں لیکن مَیں اپنے ہر ساتھی کو ایک موقعہ سنبھلنے کا ضرور دیا کرتا ہوں ___ تم آسام رائفل سے آئے ہو شاید تمھیں پنجاب کی طرف رہنے کا اتفاق نہیں ہوا ___ اُلو کے پٹھے گدھے کے بچے ___ ہوا پچھم سے پُورب کی سمت چل رہی تھی ___ تم نے بیڑی سُلگا رکھی ہو گی جس کا دُھواں اُس طرف گیا تھا جدھر سے وہ دونوں آئے تھے ___ تمھارے مورچے سے بمشکل پندرہ گز کی دُوری پر وہ رُکا تھا ___ شاید اُس نے دھویں کی بُو سونگھ لی تھی ___ ان لوگوں کی حسیات بہت تیز ہوتی ہیں ___ سمجھے تم ___"

انسپکٹر چُونی لال نے اِتنے زور سے چلّا کر یہ بات کی تھی کہ اُس کے باقی ساتھی

بھی اپنی جگہ لرز کر رہ گئے تھے۔

جس جوان نے یہ غلطی کی تھی وہ اچانک ہی زمین پر گرا اور اُس کے قدموں میں اپنا سر رکھ کر معافی مانگنے لگا۔

"ٹھیک ہے —— ٹھیک ہے —— اُٹھو اور آئندہ کبھی ناکہ بندی کے دوران سگریٹ یا بیڑی نہ پینا —— سمجھے ——"

انسپکٹر چُونی لال جانتا تھا کہ اُس نے دانستہ ایسا نہیں کیا۔

یُوں بھی اُس نے اپنے ساتھیوں کو اِس نوعیت کی کوئی ہدایت جاری نہیں کی تھی نہ ہی اُسے اس بات کا اندازہ تھا کہ مفرور ہونے والوں کی قوّتِ شامہ اتنی تیز ہو گی اور وہ آئیں گے بھی اس مورچے کے سامنے سے ——

علی الصبح اپنے دونوں ساتھیوں کی لاشوں کے ساتھ بڑے بوجھل دل سے وہ بی ایس ایف کے ٹرک میں کمپنی ہیڈ کوارٹر کی طرف واپس جا رہا تھا ——

دونوں باپ بیٹا گھنے درخت کی شاخوں میں بندروں کی طرح چُھپے بیٹھے تھے——!!

سارا ڈرامہ اُن کی آنکھوں کے سامنے ہُوا تھا اور اس کے اختتام پر جب بی ایس ایف کے سُورمے اپنی شکست خوردہ گردنیں لٹکاتے واپس پوسٹ کی طرف جا رہے تھے تو بھی وہ اسی گھنے اور تناور درخت کے قریب سے گزُر کر واپس لوٹے تھے —— اُن کے فرشتوں کو بھی اِس بات کا گمان نہیں رہا ہو گا کہ اُن کے مجرم لمبی جنگلی گھاس میں ہیں بلکہ اُن کی آنکھوں میں دُھول جھونک کر غائب ہوتے ہیں۔

نتھو خاں اور اس کا بیٹا حنیف عام قسم کے سمگلر نہیں تھے ——

وہ تو کبھی سمگلر نہیں رہے تھے ——

ان معنوں میں ضرور سمگلر تھے کہ انھیں مہینے میں دو تین مرتبہ سرحد کے آر پار آنا جانا پڑتا تھا لیکن وہ پاکستان سے ہمیشہ خالی ہاتھ آتے اِدھر اُدھر سے مال لے کر واپس جایا کرتے تھے ——

لیکن ——

یہ مال بھی وہ قیمتاً نہیں خریدتے تھے ——

مفت حاصل کیا کرتے تھے ——

تقسیم سے پہلے نتھو کا گاؤں سرحد کے پار بھارتی علاقے میں تھا۔ گورداسپور کے اس گاؤں میں اُس کے آباؤ اجداد صدیوں سے رہتے آتے تھے۔ نتھو چوری کے اس پیشے سے کب سے منسلک تھا۔

اس سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا!

اُسے یاد تھا کہ بچپن ہی سے اُن کے گھروں میں فرنگی پولیس کا آنا جانا رہتا تھا۔ کبھی پولیس والے اُس کے کسی چچا کو گرفتار کرنے آتے تھے اور کبھی اس کے باپ کو لے جاتے ——

دو تین مرتبہ اُس نے اپنے دادا کو بھی اُن کے ساتھ جاتے دیکھا تھا ——

لیکن ——

حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ سب لوگ دو تین ماہ بعد ہی گھروں کو واپس لوٹ آیا کرتے تھے۔ یہ الگ بات کہ واپسی کے بعد کم از کم ایک مہینہ تک وہ ہلنے جُلنے کے قابل نہیں رہتے تھے کیونکہ پولیس اُن پر وحشیانہ تشدّد کرتی تھی اُن سے چوری کا مال نکلواتے اور سچ اُگلوانے کے لیے اُن پر تھرڈ ڈگری طریقے آزمائے جاتے تھے —— کوئی ایسی اذیت نہیں تھی جو انہیں جسمانی طور پر نہ پہنچائی جاتی ہو ——

اُن کے ایک کے بجائے پانچ پانچ ریمانڈ لیے جاتے تھے اور ہر ریمانڈ پر نیا آفیسر اُن پر مشقِ ستم ڈھایا کرتا تھا۔

لیکن ——

نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ہوتا۔

کیا مجال جو کبھی انھوں نے اپنی زبان کھولی ہو —— حیرت کی بات تھی کہ وہ لوگ جانے کب سے چوری کے دھندے سے وابستہ تھے لیکن اُن میں سے کسی نے کبھی

اس الزام میں جیل نہیں کاٹی تھی کیونکہ اُن پر پولیس کبھی الزام ہی ثابت نہیں کر سکی تھی۔

حوالاتی کی حیثیت سے اُن کا قیام اُسی وقت تک جیل میں ہوتا جب تک اُن کا مقدمہ عدالت کے سامنے نہ جاتا ——

انگریز کا دَور تھا انھیں بے شمار قباحتوں کے ساتھ ایک خوبی اس دَور کی وہاں کا عدالتی نظام بھی تھا۔

جب تک ملزم کے خلاف پولیس ٹھوس ثبوت فراہم نہ کرتی عدالت سزا نہیں دیتی تھی اور ان کے خلاف ثبوت چوری کا مال ہی ہو سکتا تھا جو کبھی برآمد نہیں ہوتا تھا جہاں تک پولیس کے بنائے گواہوں کا تعلق تھا اُن میں سے بیشتر گواہ تو وہ تھے جو عدالت میں نتھو کے بزرگوں کی دہشت ہی سے اپنے بیان تبدیل کر لیا کرتے تھے۔

پاکستان بنا تو نتھو اکیلا ہی زندہ رہ گیا تھا۔

اُس کا ایک ہی بھائی تھا جو ادھر دشمنی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ باقی تین بہنیں تھیں جن کے خاوند شریف اور کاروباری لوگ تھے ——

نتھو نے پاکستان بننے سے پہلے شادی کی تھی لیکن اپنے دھندے سے کبھی تائب نہ ہوا۔ وہ لوگ ادھر بھی ایک سرحدی گاؤں میں ہی آباد ہوتے تھے۔

سرحد کے پار بھارتی علاقے میں اُن دنوں ہزاروں کی تعداد میں گائیں اور بھینسیں آوارہ پھرتی رہتی تھیں۔ نتھو کا جب دل چاہتا سرحد پار سے آٹھ دس جانور ہانک کر ادھر لے آتا اور نزدیکی منڈی میں فروخت کر کے اپنا کام چلاتے رکھا۔

دونوں طرف سرحدوں کی حد بندی ہو گئی اور کچھ چوکیاں بھی بن گئیں۔

لیکن ——

نتھو خاں کے لیے کچھ بھی سدِراہ نہ بن سکا۔

اُس کے لیے اس سرحدی لکیر کی اہمیت اس سے زیادہ کچھ نہیں رہی تھی کہ اب اُسے ایک کے بجائے دو ممالک کی پولیس سے بچنا ہوتا تھا۔

تیرہ سال حنیف کی عمر تھی جب اس نے پہلی مرتبہ اپنے باپ کے ساتھ سرحد

عبور کی اور کامیاب واپس لوٹا —— پھر تو ہر تیسرے چوتھے چکر میں نتھو خاں اُسے اپنے ساتھ لے جانے لگا ——

ایک سال میں اُن کے دو مقابلے بی ایس ایف سے ہوئے تھے لیکن دونوں میں بھارتی سرحدی پولیس اُن کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔

بھارتی سرحد سے وہ مال کسی نہ کسی طرح نکال لاتے تھے لیکن پاکستانی سرحد میں جب بھی رات کو گزرنے والے مویشیوں کا صبح کھوجی کھرا اُٹھاتے تو سیدھے نتھو خاں کے گاؤں جا پہنچتے ——

پندرہ سال کی عمر میں حنیف نے اپنے ملک کی تفتیش بھی کاٹ لی —— جُرم اُس کے خون میں رچ بس گیا تھا۔

اُس نے اپنے بڑوں سے ایک ہی بات سیکھی تھی کہ جب بھی پولیس کے قبضے میں آؤ خالی ہاتھ آؤ۔ اور پولیس کو کبھی کچھ نہ دو ——

اُس کا چاچا کہا کرتا تھا دس دن کا پولیس ریمانڈ دس سال جیل میں چکّی پیسنے سے ہزار گُنا بہتر ہے ——

یہ وہ اُصول تھا جو اُسے اپنے باپ یعنی حنیف کے دادا کی طرف سے ملا تھا اور اب نسل در نسل انھیں منتقل ہو رہا تھا۔

چن شاہ جو اُس علاقے میں نیا نیا تعینات ہُوا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے نتھو خاں کی شہرت سُن چکا تھا اُس نے اپنی پولیس تربیت کے مطابق اپنی دانست میں مُجرم کے بڑے کمزور پہلو پر حملہ کیا تھا اور ایک روز جب نتھو خاں بھارتی علاقے میں چوری کرنے گیا ہُوا تھا تو اُس کی غیر موجودگی میں گاؤں کے سکول سے واپس لوٹتے حنیف کو اپنے ساتھ ہانکتا ہُوا تھانے لے آیا۔

سالا! چور کی اولاد۔ سکول میں پڑھنے جاتا ہے —— ابھی کرتا ہوں تیری پڑھائی ——

اوئے کہاں گیا ہے تیرا باپ ——

چن شاہ نے پولیس کی مخصوص زبان میں نتھو خاں کو تین چار گالیاں سنا دیں۔

لیکن ——

اس کے جواب میں مغلظات کا جو طومار حنیف نے باندھا اُس نے چن شاہ کو غصّے سے پاگل ہی کر دیا۔ وہ اپنا ڈنڈا سنبھالتا اِس طرح حنیف پر حملہ آور ہوا جیسے اُس کے جسم کی ساری ہڈیاں ایک ایک کر کے توڑ ڈالے گا ——!!

تھانے کا باقی عملہ نیا نہیں تھا ——

اُن کے مُنہ نتھو خاں نے بند کر رکھے تھے اور ان میں سے بیشتر وہ تھے جو سرکار کے کم اور نتھو خاں کے زیادہ وفادار تھے۔ انھوں نے پہلے تو یہی کوشش کی کہ چن شاہ اکیلا ہی حنیف سے نمٹے۔

لیکن ——

جب تھانیدار صاحب نے انھیں گالیاں دیتے ہوئے اپنی مدد کے لیے پکارا تو بادلِ نخواستہ وہ بھی اس کی مدد کے لیے ہاتھ چلانے لگے۔ یہ الگ بات کہ انھوں نے پولیس کی زبان میں اپنے محسن کا حقِ نمک اَدا کرتے ہوئے "ہاتھ ہلکا" رکھا ——

حنیف خاں جب تک ہوش میں رہا تھانیدار کو گالیاں دیتا رہا ——

تین مرتبہ وہ اب تک بے ہوش ہو چکا تھا اور چن شاہ کو خطرہ پیدا ہونے لگا تھا کہ اگر چوتھی مرتبہ بھی وہ بے ہوش ہو گیا تو دوبارہ کبھی ہوش میں نہیں آئے گا ——

یوں بھی اگر اس کی کوئی ٹانگ یا ہاتھ تشدد سے ٹوٹ جاتے تو نتھو خاں اُسے ننگی کا ناچ نچا دیتا ——

اُس کے ہمکاروں نے بتایا تھا کہ نتھو خاں بڑا سیاسی بدمعاش ہے ——!

اُس نے انگریز کی پولیس کو نچا کر رکھ دیا تھا یہ لوگ اس کے سامنے کس باغ کی مولی تھے ——!

مقامی تھانے کا حوالدار ہی سب سے پہلے رات گئے نتھو خاں کے گھر پہنچا تھا ——

"ماں جی ——"

اُس نے نتھو کی بیوی سے کہا۔

"شیر کا بچّہ ہے تمھارا حنیفا —— کیا مجال جو اُس نے ذرا کمزوری دکھائی ہو —— بالکل باپ پر گیا ہے۔ باپ کی طرح اُس نے بھی پولیس کا ناطقہ بند کر رکھا ہے —— لیکن بچّہ ہے ماں جی —— چن شاہ بڑا ظالم تھانیدار ہے۔ رحم تو اُس کو چھو کر نہیں گزرا —— کہیں طیش میں کوئی ہڈی پسلی نہ توڑ ڈالے —— آپ کوئی بندوبست کر ہی لیں تو بہتر ہے —— جانے نتھو خاں کب واپس لوٹے ——"

حنیف کی ماں نے ایک مرتبہ تو کلیجے کو ہاتھ ڈالا۔

لیکن ——

دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل گئی ——

وہ نتھو خاں کی چچازاد بھی تھی اور بچپن ہی سے یہ کچھ دیکھتی آ رہی تھی۔ اُس کے لیے یہ خبر کوئی گھبرا دینے والی خبر نہیں تھی لیکن اپنے لختِ جگر پر اور وہ بھی اِتنی کم عمری میں ایسا وحشیانہ تشدّد —— ایک مرتبہ تو وہ سہم گئی۔

نتھو خاں ہی گھر پر نہیں تھا۔

اگر وہ خود یہاں ہوتا تو پولیس کی کیا مجال تھی کہ اُس کے بیٹے پر ہاتھ ڈالتی۔

انھوں نے نتھو خاں کی غیر موجودگی کا فائدہ ہی تو اُٹھایا تھا ——!

اُسے اور تو کچھ نہ سُوجھا اپنے دو نوکروں کو ساتھ لے کر ساتھ والے گاؤں میں اُس وکیل کے گھر پہنچ گئی جو نتھو خاں کا مستقل وکیل تھا۔

یہ کوئی معمولی وکیل نہیں تھا۔

نتھو خاں کے ساتھ رہ کر اُسے پولیس سے نمٹنے کا فن بڑی اچھی طرح آ گیا تھا۔ اُس نے دوسرے ہی لمحے شہر کا رُخ کیا اور راتوں رات عدالت عالیہ سے بیلف لے کر اگلے روز دوپہر سے پہلے تھانے پہنچ گیا ——

تھانے کا عملہ نتھو خاں کا وفادار تھا انھوں نے بیلف کو اُس کمرے کے دروازے

تک پہنچا دیا جس میں حنیف خاں کو جن شاہ نے ہتھکڑی لگا کر بٹھایا ہُوا تھا ——
جن شاہ خود تھانے سے باہر کسی کام سے گیا ہوا تھا جب عدالتی بیلف وہاں
آپہنچا اور اُس کی واپسی تک بیلف نے حنیف خاں کو ہتھکڑیوں سمیت برآمد کر لیا تھا۔
جن شاہ چکرا کر رہ گیا ——

" تھانیدارا —— اس کا باپ یہاں ہوتا تو مَیں عدالت کی مدد بھی حاصل نہ کرتی
مَیں نتھو خاں کی بیوی ہوں —— پولیس تو جائز شکایت پر ہمارے گاؤں کا رُخ
نہیں کیا کرتی تُو نے میرے بیٹے کو ناجائز گرفتار کر کے اُس پر تشدد کیا ہے ——
جب تک تیری بیٹی نہ اُتروائی چین سے نہیں بیٹھوں گی —— یاد رکھنا" ——
نتھو خاں کی بیوی نے جو بیلف کے ساتھ ہی تھانے میں آئی تھی اسے للکارتے
ہُوئے کہا۔

جن شاہ نے اپنی بیس سالہ ملازمت میں ایسی ناقص غلطی نہیں کی تھی۔ اُس
نے روزنامچے میں کوئی اندراج کیے بغیر حنیف کو حبس بے جا میں رکھا تھا ——
یہ تو اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اسے اتنے شدید ردِ عمل کا سامنا کرنا ہو
گا ——

تھانیدار جن شاہ کو تو زمین اپنے قدموں تلے سرکتی محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے
جیسے تیسے وقت کو ٹالا اور نتھو خاں کی واپسی پر بڑی بڑی پنچایتیں بھیج کر اس سے معافی
کا خواستگار ہوا ——
نتھو خاں کسی صورت اسے معاف نہ کرتا اگر مسجد کے مولوی فاضل شاہ صاحب
اس کی طرف سے منت دار نہ ہوتے۔
" ٹھیک ہے شاہ جی —— اگر آپ کا حکم ہے تو اُسے کہہ دیں کہ اس تحصیل
سے اپنا تبادلہ کروا لے اور زندگی میں دوبارہ کبھی اِدھر کا رُخ نہ کرے —— "
بالآخر اُس نے فاضل شاہ صاحب کی بات مان لی۔
جن شاہ یوں بھی اب اس قابل نہیں رہ گیا تھا کہ دوبارہ اسی علاقے میں جھک

مارتا یہاں کے چور بھی پولیس پر غالب رہتے تھے اس نے بھی اس میں عافیت
جانی کہ عزت بچا کر یہاں سے نکل جائے۔

بات کچھ بھی رہی ہو نتھو خاں نے اپنے بیٹے کا ٹسٹ لے لیا تھا۔
اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ حنیف اس کا صحیح جانشین ثابت ہو گا اب وہ اعتماد
سے اُسے اپنے ساتھ کسی بھی مہم پر لے جا سکتا تھا۔
جب نتھو خان نے اس کام کا آغاز کیا تھا تو کسی بھی مہم پر روانگی کے وقت وہ
لوگ اپنے ساتھ ایک چھوٹی سی رسّی کا ٹکڑا اور کلہاڑی لے کر سرحد عبور کیا کرتے تھے۔
لیکن ——
اب زمانہ بدل گیا تھا۔
ڈانگ سوٹے کی لڑائی کا دَور ختم ہو چکا تھا اور جدید اسلحہ بدمعاشوں کا ہتھیار
بن گیا تھا۔
جب نتھو خان کے بزرگ یہ کام کرتے تھے تو نہتے دشمن پر حملہ کرنا اپنے لیے
گالی سمجھتے تھے لیکن اب دَور ایسا آ گیا تھا کہ لوگ اپنے دشمن کے نہتّے ہونے کے منتظر
ہُوا کرتے تھے ——
تب پشت سے حملہ کرنا بزدلی اور اب مردانگی جانا جاتا تھا۔
بدمعاش اپنے دشمن کی عورتوں کو اپنے گھروں کی عورتوں کی طرح عزت اور
مان دیا کرتے تھے لیکن اب دشمن کی ماں بہن کو سر بازار رُسوا کرنا بہادری خیال کیا
جانے لگا تھا۔
نتھو خاں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ انھیں اسلحے کے بَل بوتے پر اپنا دھندہ جاری
رکھنا پڑے گا —— وہ اپنے خاندان کا پہلا فرد تھا جس نے کلاشنکوف ہاتھ میں اٹھائی
تھی ورنہ وہ لوگ تو ایک نالی یا دو نالی بندوق سے زیادہ اپنے گھروں میں کچھ
نہیں رکھا کرتے تھے۔

حنیف بھی یوں بڑھا جیسے بانس کا پودا بڑھتا ہے ——
اس کی جوانی قابلِ رشک تھی۔ نجانے کسی طرح مولوی صاحب کے مجبور کرنے پر اس نے سکول کی آٹھ جماعتیں پڑھ لی تھیں پھر کبھی سکول کا منہ نہ دیکھا۔ نزدیکی دیہاتوں کے چھوٹے موٹے بدمعاش تو ان لوگوں سے سلام دُعا رکھنا ہی اپنے لیے باعثِ شرف جانتے تھے۔

حنیف خاں نے کم عمری میں اسلحے کا استعمال سیکھ لیا تھا اور اپنے باپ کا بازو بن گیا تھا ——

نتھو خاں نے اب اپنے ساتھ اسلحہ لے کر سرحد عبور کرنا شروع کر دی تھی اور بی ایس ایف کے ساتھ دو تین مقابلوں کے بعد سے اس نے مقامی سمگلروں کی طرح نیا کام سیکھ لیا تھا اسے وہ "ناکہ بھرنا" کہا کرتے تھے۔

سرحد پار سے جن چوروں کے ساتھ ان کا یارانہ تھا وہ لوگ "مال" سرحد تک پہنچا کر اپنی طرف کا ناکہ لکیر دیا کرتے تھے جبکہ اس طرف سے ناکہ نتھو خاں دے دیا کرتا اور دھندہ آرام سے چل رہا تھا۔

اب اس نے آنا جانا بھی کم کر دیا تھا۔

لیکن ——

اُس روز جب اچانک موہن سانسی اس سے ملنے آیا تو نتھو خاں لالچ میں آ گیا موہن سانسی اس کے دیرینہ ساتھی مکھے سانسی کا رشتہ دار تھا اور نتھو خاں کے پاس سرحد پار سے بڑی اہم اطلاع لے کر آیا تھا۔

"نتھو خاں —— تین گھوڑیاں ہیں۔ ریس میں دوڑنے والی۔ ایک ایک کی قیمت لاکھ لاکھ روپے بنتی ہے۔ لاکھ روپیہ تو میرا اُٹھ چکا ہے اب تک —— تجھ سے بہتر نائب مجھے نظر نہیں آیا۔ مکھے سے تیرا ایڈریس لے کر اپنی جان پر کھیل کر تجھ تک پہنچا ہوں —— آگے تیری مرضی ——"

موہن سانسی نے کہا۔

"موہن سیہاں۔ مَیں ناواقفوں کے ساتھ دھندہ نہیں کیا کرتا لیکن تو مکھے سانسی کا رشتہ دار ہے تو تیرے ساتھ کام کی ہامی بھر رہا ہوں —— سرحد تک مال تو پہنچا دے۔ اُس سے آگے میری ذمہ داری —— مَیں زبان کا بندہ ہوں —— جو قیمت لگی آدھا تیرا اور آدھا میرا۔ نقصان میں بھی ہم آدھے آدھے کے ذمہ دار ہوں گے مال خواہ اِدھر پکڑا جائے یا اُدھر پکڑا جائے ——"

"نتھو خاں —— تیرا حکم سر آنکھوں پر۔ میرا یہ پہلا چکر ہے۔ مَیں نے مال اپنے قبضے میں کر رکھا ہے ——
دو گھوڑیوں پر تم باپ بیٹے بیٹھ جانا —— میں سنبھال لوں گا۔ ہم اکٹھے اِدھر آئیں گے اور جب تک مال فروخت نہ ہو میں —— یہاں رہوں گا —— میری بات مان اور "ناکہ بھرنے" کا چکر جانے دے —— جو بیس تیس ہزار ان لوگوں کو دینے ہیں وہی ہمارے بچوں کے مُنہ میں جائیں گے —— اور ہاں یہ کوئی عام گائیں بھینسیں نہیں ہیں —— نسل دار گھوڑیاں ہیں کسی کا بھی دل بے ایمان ہو سکتا ہے۔ آگے تیری مرضی —— مَیں ایک بات کی گارنٹی دیتا ہوں کہ جس راستے سے تمھیں لاؤں گا وہاں سے تالیاں بجاتے آنا کوئی تمھاری ہوا کی طرف نہیں دیکھے گا ——"

موہن سنگھ نے اُسے مطمئن کر دیا۔

نتھو خاں ایسا کچا بدمعاش نہیں تھا ——

اُس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا تھا اور جانتا تھا کہ موہن سنگھ اُسے دھوکہ نہیں دے سکتا۔

"ٹھیک ہے موہنے —— مَیں پرسوں ہی آتا ہوں ——"

نتھو خاں نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

تم مکھے سانسی کے گھر کی طرف آنا —— گاؤں کے باہر والی "بہک" (بیٹھک) پر مَیں تمھارا منتظر ہوں گا —— رات کا پہلا پہر ہو تو بہتر ہے ہم صبح ہونے تک مال سمیت واپس پہنچ سکتے ہیں۔"

موہنے نے اپنی طرف سے مکمل جال بچھا دیا تھا۔

اُسی رات انھوں نے موہنے کو سرحد عبور کروا دی۔

حنیف اب بیس بائیس سال کا گھبرو جوان تھا ——

جوانی بھی اُس پر ٹوٹ کر آئی تھی —— نتھو خاں نے شروع ہی سے اُس کی پرورش اِس انداز سے کی تھی کہ حنیف کا جسم بھی اُس کے ارادوں کی طرح مضبوط بنا دیا تھا۔ گاؤں کے جس راستے سے وہ گزرتا۔ کئی جوانیاں اُس کے قدموں میں بچھتی چلی جاتیں ——

لیکن ——

نتھو خاں نے بھی عقل مندی کی تھی۔

"بچہ! کبھی عورت، شراب اور جوئے کے چکر میں نہ پڑنا —— کتّے کی موت مارے جاؤ گے۔"

اُس نے یہ فقرہ اتنی مرتبہ حنیف سے کہا تھا کہ اُس کے لاشعور میں بس کر رہ گیا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ حنیف نے اب تک ان تینوں قباحتوں سے احتراز برتا تھا۔ یہی سبب تھا کہ وہ فولاد کی طرح مضبوط اور ارادوں کا دھنی نکلا تھا ——

بی ایس ایف کے ساتھ دو مقابلوں کے بعد سے نتھو خاں نے خود کو زیادہ ہی مسلح رکھنا شروع کر دیا تھا اور آج بھی جب اُس نے سرحد عبور کرنا چاہی تو نجانے کیوں زندگی میں پہلی مرتبہ اُس کا جی اپنے بیٹے کو ساتھ لے جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

"حنیفے! یار تو آج اِدھر ہی اٹک جا ——"

اُس نے سرِ شام ہی اپنے بیٹے سے کہا۔

"چاچا —— تیرے مُنہ سے ایسی بات —— کمال ہے —— کیا میرے خون پر شک کرنے لگا ہے —— کیا کہہ رہا ہے تُو ——"

حنیف خاں نے حیرانگی سے باپ کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

"نہیں بچے! جانے کیوں آج دل نہیں چاہ رہا —— یوں بھی اب ہمیں اکٹھے

کسی مہم پر نہیں جانا چاہیئے —— تُو جانتا ہے کہ اکیلی سنتان (اولاد) ہے تو میری —— اور مَیں نہیں چاہتا کہ —— یار مَیں نے اپنے حصّے کی عمر گزار لی —— تُو سمجھتا کیوں نہیں۔"

اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اپنے بیٹے کو کس طرح سمجھائے۔

"دیکھ چاچا —— یہ پارٹی نئی ہے اور سودا بھی بڑا ہے —— آج تو مَیں رُکنے والا نہیں —— پھر کبھی اِس مسئلے پر بات کریں گے، اب منزل کھوٹی نہ کر اور اللہ کو یاد کرکے چل دے۔"

حنیف نے بالآخر فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

"اچھا پتّر تیری مرضی —— تیاری مکمل رکھنا۔"

دونوں نے تیاری مکمل کی تھی ——

دونوں کے پاس کمر سے بندھے تھیلوں میں پانچ پانچ گرنیڈ رکھے تھے —— اس نے اپنے بیٹے کو ایک ہی سبق پڑھایا تھا ——

"جیسے ہی ہالٹ کی آواز آئے سالوں پر بم پھینک دینا —— یہ "ہالٹ" کا فراڈ ہی ہوتا ہے —— ہم سے بہت تنگ ہیں یہ —— کبھی سالے زندہ نہیں چھوڑیں گے اگر کبھی قابو آ گئے —— حنیفے بچّہ اپنی تو ان سے ۴۷ء سے ہی جنگ چل رہی ہے سمجھ گیا ناں ——"

چاچا —— بے فکر ہو جا —— انھوں نے ابھی حنیفے کے ہاتھ نہیں دیکھے" ——

اُس نے باپ کو اعتماد دلایا۔

دونوں تربیت کے مطابق سفر کر رہے تھے۔ آگے نتھو خاں تھا اور اس کے پیچھے پندرہ بیس گز کا فاصلہ چھوڑ کر حنیف آ رہا تھا —— مکھے سانسی کے گاؤں کا راستہ سب محفوظ تھا انھیں آدھے سے زیادہ سفر "بیلے" ہی میں طے کرنا پڑتا تھا اس کے بعد کھیتوں کے ایک مختصر سلسلے سے گزر کر وہ گاؤں کی حدود میں داخل ہو جایا کرتے تھے ——"

"بیلے" کے خاتمے پر درختوں کے گہرے جُھنڈ آتے تھے جہاں سے ایک مرتبہ پہلے

بھی دونوں بی ایس ایف کا مقابلہ کر کے فرار ہو چکے تھے۔

ابھی وہ درختوں کے جھنڈ کے نزدیک ہی پہنچے تھے جب اچانک ہی نتھو خاں ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اُس نے کہیں دُور سے اپنی سمت آتے سگریٹ کے دھوئیں کی بُو سونگھ لی تھی ——

حساس ناک اور کان اُسے ورثے میں ملے تھے ——

ان حالات میں تو یوں بھی اُن کی کارکردگی کئی گنا بڑھ جاتی تھی ——

یہ کوئی کھیتوں کا سلسلہ نہیں تھا جہاں رات کو کسان موجود ہوں —— یہاں سوائے بی ایس ایف کے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا یا پھر اُن کے قبیلے کا کوئی فرد ہوتا لیکن اس کے بھی امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔

نتھو خاں نے اپنے بڑوں سے سیکھا تھا کہ معمولی سا خطرہ محسوس کرتے ہی اپنا راستہ بدل لو —— گو کہ دھوئیں کی بدبُو اُسے ایک لمحے کے لیے محسوس ہوئی تھی۔

لیکن ——

اُس نے دوسرے ہی لمحے راستہ تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ابھی وہ چند قدم ہی چل پائے تھے جب اچانک "ہالٹ" "ہالٹ" کی آوازیں بلند ہوئیں جس کے ساتھ ہی دونوں باپ بیٹے نے پہلے سے احتیاطاً ہاتھوں میں پکڑے دستی بموں کے پن نکال کر آوازوں کی سمت اُچھال دیئے اور اِس عمل کو تب تک دُہراتے رہے جب تک اُن کے پاس بموں کا ذخیرہ ختم نہیں ہو گیا ——!

اندھیرا، بموں کے دھماکے اور اُڑنے والی دُھول نے انھیں چند سیکنڈ کی مہلت دلا دی اور یہ مہلت ان کے کام آئی۔ نتھو خاں کے تعاقب میں حنیف بھی لنگور کی سی پھرتی سے نزدیکی درخت پر چڑھتا چلا گیا ——

جب انسپکٹر چُونی لال کے حکم پر "بھگت سنگھ نے روشنی راؤنڈ پھینکنے شروع کیے تو دونوں نے اپنے جسموں کو درخت کے گھنے پتوں اور ٹہنیوں میں اس طرح چھپا لیا تھا کہ وہ درخت ہی کا حصّہ دکھائی دینے لگے تھے۔

بی ایس ایف کے جوانوں نے اپنے افسر کے تعاقب میں جنگلی گھاس پر اپنا غصّہ نکال لیا تھا۔ کسی نے آسمان کی طرف نظر اُٹھانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اگر وہ ایسا کرتے بھی تو انھیں نہ دیکھ پاتے۔

یہ ضرور تھا کہ اگر انسپکٹر چُونی لال طیش میں آ کر جنگلی گھاس کی بھینٹ چڑھانے والی گولیوں کا کچھ حصّہ —— درختوں پر بھی پھینک دیتا تو اسے زندہ نہیں تو دو لاشیں ضرور مل جاتیں۔

دونوں نے بڑے اطمینان سے بی ایس ایف کی بھاگ دوڑ دیکھی تھی اور مکمل سکون ہونے پر ہی درخت سے نیچے اُتر آئے تھے۔

اب کوئی اِس بات کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا کہ دونوں دوبارہ یہیں سے گزریں گے —— جبکہ نتھو خاں کوئی اور ہی فیصلہ کر چکا تھا۔

موہن سنگھ کی غدّاری نے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ نتھو خاں موہنے کو سزا دینے پر تُلا ہُوا تھا۔ اُس نے غدّار کو معاف کرنا تو سیکھا ہی نہیں تھا۔

"حنیف —— تو واپس چلا جا"

"لیکن کیوں چاچا"

حنیف نے باپ کے بدلتے تیوروں سے حالات کا اندازہ تو کر لیا تھا لیکن اتمامِ حُجت کے لیے پوچھ لینا ضروری سمجھا تھا۔

"دیکھ بچے —— ہر بات میں ضد نہیں کرتے —— تو کیا چاہے گا کہ میری نسل ہی ختم ہو جائے —— مَیں موہنے کو معاف نہیں کر سکتا۔ اگر مَیں مارا گیا تو میرا بدلہ ضرور لینا —— ان سالوں نے کیا سمجھ رکھا ہے نتھو خاں کو —— کیا یاد کریں گے یہ بھی ——"

اس نے موٹی سی گال دیتے ہوئے کہا ——

"چاچا —— دل تو نہیں مانتا لیکن تیرا حکم ہے تو واپس جاتا ہوں" ——

حنیف نے آج پہلی مرتبہ اپنے باپ کو اِس موڈ میں دیکھا تھا۔

"جا بچہ ـــــ اللہ تیرا حافظ ہو ـــــ"

اُس نے اپنے بیٹے کی پیٹھ تھپکی اور اُس کی طرف دیکھے بغیر دائیں طرف گھوم گیا۔

حنیف خاں اپنی جگہ کھڑا اُس وقت تک اپنے باپ کو نظریں جمائے دیکھتا رہا جب تک کہ اُسے اندھیرے کی چادر نے نہیں نگل لیا۔

اس کے بعد ہی وہ بوجھل قدموں سے چلتا پاکستانی سرحد کی طرف واپس آیا تھا۔ سرحد عبور کرنے کے بعد وہ اپنے باپ کے انتظار میں گاؤں سے باہر بھی اُس راستے پر چُھپ کر بیٹھ رہا جس سے گزر کر اُس کے باپ نے واپس آنا تھا۔

نتھو خاں غصے کی آگ میں جل رہا تھا۔

اگلے ایک گھنٹے بعد وہ اپنے دیرینہ ساتھی مُکھے سانسی کے گھر موجود تھا۔

مُکھا اسے اچانک اپنے ہاں دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"نتھو ـــ تُو! اس طرح اچانک ـــــ"

"تجھے میرے آنے کی خبر نہیں تھی کیا" ـــــ

نتھو خاں نے حیران پریشان مُکھے سانسی کی بات کاٹتے ہوئے کہا ـــــ

"یار تیرا گھر ہے جب جی چاہے آ ـــ لیکن آج تو اس طرف نہ ہی آتا تو بہتر تھا۔ آج تو بہت گولی چلی ہے ـــ بڑی فائرنگ ہوئی ہے"

مُکھے نے اُسے مکان کے اندر ایک محفوظ کمرے میں لے جاتے ہوئے کہا ـــــ

"جانتے ہو مُکھے یہ گولی کس پر چلی ہے؟"

نتھو خاں نے اپنے دیرینہ دوست سے پوچھا۔

"کیوں پہیلیاں بجھوا رہا ہے یار ـــ کُھل کر بات کر ـــ مسئلہ کیا ہے۔ تو نے مجھے پریشان کر کے رکھ دیا ہے" ـــــ

مُکھا واقعی پریشان ہو رہا تھا۔

"مُکھے یہ فائرنگ مجھ پر ہوئی تھی ـــ بس یوں جان لے کہ ابھی کچھ دن کی زندگی باقی ہے جو بچ گیا اور یہ سارا کیا دھرا تیرے اس رشتہ دار موہنے کا ہے"

نتھو خاں نے کہا ـــــ

"موہن سنگھ کا ـــ وہ تو سیکورٹی والوں کا پُرانا ٹاؤٹ ہے۔ وہ سالا تیرے پاس کہاں پہنچ گیا۔

نتھو خاں تُو نشے میں تو نہیں بول رہا ـــــ"

نتھو خاں نے اندازہ کر لیا تھا کہ مُکھے کو کسی بات کی خبر نہیں اور موہن سنگھ نے اُسے بھی دھوکہ دیا ہے۔ اُس نے مُکھے سانسی کو ساری کہانی سُنا دی۔

نتھو خاں ـــ وقت کھوٹا نہ کر ـــ یہ حساب ابھی برابر ہو جائے تو بہتر ہے ورنہ صبح تک وہ ہماری پہنچ سے باہر ہو جائے گا ـــ اُٹھ میرے ساتھ چل ـــ"

مُکھا سانسی بھی یاروں کا یار تھا ـــــ

اُس کا اور نتھو خاں کا تیس برس کا یارانہ تھا۔ وہ اس دوستی کو داؤ پہ نہیں لگا سکتا تھا۔ موہنا اسی گاؤں کا رہائشی تھا اور گاؤں کے باہر اپنی حویلی میں گہری نیند کے مزے لے رہا تھا جب موت کے دونوں فرشتے اس کے سرہانے جا کھڑے ہوتے انھوں نے حویلی کے اس کمرہ کا جس میں موہنا سو رہا تھا دروازہ ایک ہی جھٹکے سے توڑ ڈالا ـــــ

حویلی میں شاید اور کوئی نہیں تھا نہ ہی موہن سنگھ نے اس کی ضرورت محسوس کی تھی کہ وہ کسی اور کو اپنے ساتھ رکھتا۔

دونوں کو وہاں اچانک دیکھ کر ہی اُس کی آدھی جان نکل گئی تھی ـــــ

"کیا بات ہے موہن سیہاں گھبرا گیا ـــ اوئے مَیں تیرا رشتہ دار ہوں اور یہ میرا یار نتھو خاں، ڈرنے والی کیا بات ہے بھئی" ـــــ

مُکھے سانسی نے اپنے ہاتھ میں پکڑی کلہاڑی اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

"مم ہیں کچھ سمجھا نہیں بھاؤ جی ___"

موہنے نے بمشکل آواز نکالی۔

"خبردار جو مجھے کسی رشتے سے پکارا ___ کتے کی اولاد ___ تو نے کیا نھتو خاں کو بھی کوئی عام سا سمگلر سمجھ لیا تھا" ___

مکھے نے اُس کے منہ پر اتنا زوردار تھپیڑ مارا تھا کہ وہ چارپائی سے اُلٹ کر دُور جا گرا اور اب دیوار کے ساتھ ہی ٹک گیا تھا۔

"کہاں ہیں گھوڑیاں موہن سیہاں ___ دیکھ لو ہم تو اپنے وعدے کے مطابق آگئے ہیں لیکن لگتا ہے تُو نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا" ___

اس مرتبہ نھتو خاں کی باری تھی ___!

"نھتو خاں ___ میری حویلی پر بندھے سارے جانور کھول لو ___ مَیں تمھیں خود سرحد تک چھوڑ کر آؤں گا لیکن پرماتما (خدا) کے لیے مجھے شما (معاف) کر دو۔ مجھ سے غلطی ہو گئی ___"

موہن سنگھ نے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں موہن سیہاں غلطی تجھ سے نہیں مجھ سے ہوئی ہے ___ مَیں نے تجھے پہچاننے میں غلطی کی۔ میری عقل پر پردہ پڑ گیا تھا۔ تُو نے میرے یار کا نام لے کر مجھے دھوکہ دیا ___ لیکن اب مَیں غلطی نہیں دُہراؤں گا" ___

نھتو خاں نے پھنکارتے ہوئے کہا ___

"کہ کہ کیا مطلب ___"

موہن سنگھ کا رنگ مرنے سے پہلے ہی زرد پڑ گیا تھا۔

"موہن سیہاں ہم تیرے اُن مالکوں کے لیے جن کا تُو کتا ہے۔ تیری لاش کا تحفہ چھوڑ کر جائیں گے تاکہ انھیں اس بات کا علم ہو کہ کبھی کبھی وقت کا پہیہ اُلٹا بھی گھوم جاتا ہے ___"

نھتو خاں کی آواز اُسے کسی ڈراؤنے کھنڈر سے بلند ہوتی بھوتوں کی چیخ کی

طرح سنائی دی اور موہن سنگھ کے سارے بدن میں خوف سرایت کر گیا۔

"مکھے ___ تو ___ تو ایک مسلے کے ساتھ مل کر اپنے دھرم کے بندے کو قتل کرے گا ___ تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا ___ دیکھ لے ___ تُو بھی بچ نہیں سکے گا ___ یہ تجھے بھی مار ڈالے گا ___

موہن سنگھ نے ابھی تک اپنے حواس قائم رکھے تھے اور چاہا تھا کہ دھرم کے نام پر ہم دونوں کو آپس میں ٹکرا کر اپنی جان بچا لے ___

"تیرے جیسے ہزار ذلیل انسان مَیں اس ایک مسلے پر نچھاور کر سکتا ہوں موہنے ___!"

مکھے کا پارہ آسمان کو چھو رہا تھا۔

"مکھے تُو بھی بچ نہیں سکے گا۔ اگر مَیں مارا گیا تو صبح ہونے سے پہلے بی ایس ایف والے تیری بھی تکا بوٹی کر دیں گے۔ مَیں نے انھیں بتا دیا تھا کہ اگر مجھے کچھ بھی ہوا تو یہ تیرے کارن ہو گا ___ اب بھی وقت ہے تو نکل جا اسے بھی لے جا ___ میں کالی ماں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمھیں کچھ نہیں کہوں گا ___"

حرام خور ___ موت کو سامنے دیکھ کر بھی تُو مکاری اور حرام خوری سے باز نہیں آ رہا ___ تجھے تو بہت پہلے مر جانا چاہیئے تھا" ___

اتنا کہہ کر اُس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی کلہاڑی کو دونوں ہاتھوں سے تھاما اور زوردار وار اس کے سر پر کیا ___

"بس ___ مکھے یار بس کر ___ مَیں نے بھی اس سے حساب برابر کرنا ہے"

نھتو خاں نے مکھے کے ہاتھ سے کلہاڑی پکڑ لی ___

موہنا کے سر سے خون کا فوارہ اُبل پڑا تھا ___

وہ بزدلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔

لیکن ___

نھتو خاں کے ایک ہی وار نے اس کی ساری چیخوں کا گلا گھونٹ دیا ___

اُس کی گردن تن سے جدا ہو کر دُور جا گری تھی ___

دونوں دوست اطمینان سے باہر آگئے ——
انھوں نے دروازے کو دوبارہ بند کردیا تھا اور اب سرحد کی طرف واپس جا رہے تھے ——

"مکھا سیہاں —— جیوندیاں دے میلے۔ تُو واپس لوٹ جا یار —— "
اُس نے اپنے دوست سے گاؤں کی حدود سے نکلتے ہی کہا۔

"نہیں نتھو خاں —— میرا دل نہیں مانتا۔ تجھے سرحد تک چھوڑ کر جاؤں گا۔"
مکھئے نے کہا۔

نتھو خاں کو اچانک ہی خیال آیا تھا کہ صبح جب بی ایس ایف والوں کو موہن سنگھ کی لاش ملے گی تو وہ فوراً مکھئے سانسی کو پکڑیں گے کیونکہ مکھئے کا نام ہی اُس نے استعمال کیا تھا اور اِس قتل کا شک بھی اس پر ہی جائے گا۔
کہیں بی ایس ایف والے طیش میں آکر اُسے مار ہی نہ ڈالیں یہی سوچ کر اُس نے اپنے دوست سے کہا تھا۔

"مکھے —— تو چل میرے ساتھ۔ ابھی تیرا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔"

"پاگل ہوگیا ہے کیا —— مَیں جانتا ہوں جو تُو سوچ رہا ہے —— لیکن میرے اچانک غائب ہوجانے سے تو ان کا کیس میرے خلاف اور زیادہ مضبوط ہوجائے گا —— نہیں نتھو خاں —— مَیں واپس اپنے گھر جاؤں گا —— مجھے یہ لوگ جان سے نہیں مار سکتے —— سرپنچ میرا خاص آدمی ہے اور لڑکے بھی سیانے ہیں وہ تھانے کچہری کو سنبھال لیں گے —— میرا ایک آدھ ریمانڈ لیں گے یہ لوگ —— مَیں کاٹ لوں گا —— مجھے اِس کی پرواہ نہیں —— اور ہاں۔ اگلے مہینے شادی ہے نرملا کی —— کہیں بے وقوفی نہ کر بیٹھنا مَیں نے یہ بات تجھ سے چُھپائی ہوئی تھی۔ اِن لوگوں نے نرملا کی شادی پر تیرے لیے جال بچھا رکھا ہوگا —— خیال رکھنا۔"
مکھئے نے کہا ——

"یار مکھئے اب مجھ پر اتنی پابندیاں تو نہ لگا —— اپنی بیٹی کی شادی میں بھی نہ

آؤں —— "
نتھو کو اِس بات کا دُکھ ہُوا تھا۔

"نتھو یار وقت بڑی تیزی سے نکل رہا ہے۔ پہلے والے حالات نہیں رہے۔ اب سرحدیں بھی بہت غیر محفوظ ہوگئی ہیں —— مَیں تو کہتا ہوں میری بات مان لے۔ حنیف اکیلا ہے اُس کی خاطر اب تو سرحد پار آنا جانا چھوڑ دے —— یار ابھی مَیں تو نہیں مرگیا —— مَیں ہر ماہ باقاعدگی سے تجھے مال پہنچا دیا کروں گا۔ مَیں نے اب دُنیا سے کیا لینا ہے —— پانچ بیٹے ہیں۔ میری جگہ سنبھالنے کو —— نتھو خاں یار اس مقابلے کے بعد تو اب تیرے لیے یہاں آنا خودکشی کے مترادف ہوگا۔"
چلتے چلتے مکھئے نے کہا۔

"مکھئے —— مجھے بزدل بنا رہا ہے کیا۔"
نتھو نے گِلہ کرنے کے انداز میں کہا۔

"نہیں نتھو یار —— تُو غلط نہ سمجھ۔ مَیں نے کہا ناں کہ حالات بدل رہے ہیں۔ اب یہ سالے جس کو پکڑتے ہیں اُس پر جاسوسی کا مقدمہ بنا دیتے ہیں اور موہنے کی موت کے بعد تو وہ فوراً یہی مقدمہ بنائیں گے —— بس کام چلنا چاہیئے نتھو خاں —— وہ تو چل ہی رہا ہے۔ میری زندگی تک تو چلتا رہے گا —— "
نتھو خاں نے اس کی طرف زخمی نظروں سے دیکھا اور خاموشی اختیار کرلی —— !
وہ بڑے بوجھل دل اور قدموں سے سرحد تک آیا تھا۔ راستہ ایسا تھا کہ جس پر رُک کر وہ بات نہیں کرسکتے تھے۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ اپنے ۳۰ سال پُرانے یار سے بہت باتیں کرے اور اُسے کہے کہ وہ اپنے یہ الفاظ واپس لے —— لیکن ——
کوئی ایسی طاقت تھی جس نے اُسے بولنے سے مانع رکھا۔
خُدا جانے آج وہ اِتنا بزدل کیسے ہوگیا تھا ——
اُس کے دل و دماغ نے اُس سے کہنا شروع کردیا تھا کہ مکھا جو کچھ کہہ رہا ہے

وہی سچ ہے اور وہ اُس کی بات مان لے ——

واقعی اس نے کبھی اس پہلو پر تو غور ہی نہیں کیا تھا ——

حنیف خاں اُس کی واحد اولاد تھی۔ دو بیٹیاں یکے بعد دیگرے پیدا ہو کر مر گئی تھیں جن کے بعد ڈاکٹر نے اُسے سختی سے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ اپنی بیوی کو بھی اپنی بیٹیوں کے پاس نہیں پہنچانا چاہتا تو آئندہ ساری زندگی اس کے بطن سے اولاد کی خواہش نہ کرے ——

صغراں اس کی بیوی ہی نہیں ——

دُکھ سُکھ کی پُرانی ساتھی تھی ——

اُس کے چچا کی بیٹی تھی دونوں نے بچپن سے جوانی تک کا وقت بھی اکٹھے ہی گزارا تھا۔ جرائم کی اِس دُنیا میں رہتے ہوئے بھی وہ ابھی اتنا بے حس نہیں ہوا تھا کہ صغراں سے متعلق اس کے احساسات کو موت ہی آ جاتی ——

وہ تو تصور میں بھی اُسے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ خدا جانے اس نے کتنی مرتبہ صغراں سے کہا تھا کہ وہ اُسے خود سے پہلے اللہ تعالیٰ کے ہاں نہیں جانے دے گا۔ اُسے اس بات کا علم تھا کہ صغراں نے اپنی ہوش میں کبھی کوئی نماز قضا نہیں کی ——

اُسے اپنے خاوند سے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں تھی ——

اُس نے زندگی بھر نتھو خاں کو کسی بات پر نہیں ٹوکا تھا —— اُسے کبھی نہیں کہا تھا کہ وہ سرحد پار نہ جایا کرے۔

لیکن ——

جیسے ہی وہ گھر سے اپنے قدم باہر رکھتا تھا۔ صغراں سجدے میں گر کر خدا کے حضور گڑگڑا کر اس کی سلامتی کی دُعائیں مانگنے لگتی تھی ——

کسی نادیدہ طاقت نے متعدد مرتبہ اُس کے کانوں میں سرگوشی کی تھی کہ نتھو خاں تم اپنی بہادری، چالاکی یا مکاری کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف اپنی بیوی کی دعاؤں

کے صدقے زندہ پھرتے ہو ——

اُس نے دوبارہ صغراں کے بطن سے بچہ نہیں پیدا ہونے دیا۔ ساری زندگی صغراں اُس کی منت سماجت کرتی رہی کہ مزید اولاد کے لیے وہ دوسری شادی کر لے۔

لیکن ——

نتھو خاں کبھی نہ مانا۔ وہ اس بات کا تصور ہی نہیں کر سکتا تھا صغراں کے ہوتے ہوتے وہ کبھی اپنی زندگی میں کسی دوسری عورت کو قدم بھی رکھنے دے گا۔

آج اچانک کھٹے نے اُس کی توجہ اس اہم مسئلے کی طرف دلائی تو وہ لرز کر رہ گیا۔

واقعی اس کے لیے حنیف کی زندگی بہت قیمتی تھی ——

اگر حنیف کو کچھ ہو گیا تو صغراں مر جائے گی ——

پھر اس کی زندگی کا مقصد ہی کہیں باقی رہ جائے گا؟

اس نے سوچا اور گردن جھکا لی ——

دونوں سرحد کے نزدیک پہنچ گئے تھے ——

"بس یار کھٹے —— بڑا ساتھ ہو گیا —— اب تو جا —— وہ سامنے تو ہے سرحد"

اس نے اپنے دیرینہ دوست کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"نتھو خاں ——"

فرطِ جذبات سے مغلوب ہو کر کھٹے نے اُسے گلے لگا لیا اُس کے مُنہ سے اور کوئی لفظ نہیں نکل رہا تھا۔

جانے کیوں اُسے یوں لگتا تھا جیسے وہ آخری مرتبہ ایک دوسرے کو مل رہے ہیں۔

"اللہ بیلی"

نتھو خاں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"رَب راکھا" ——

مکھنے سانسی نے رُندھے ہوئے گلے سے کہا

دونوں دوستوں نے ایک دوسرے کو بھیگتی آنکھوں سے رُخصت کیا تھا۔

رات دو پہر ڈھل چکی تھی جب نتھو خاں اپنے گاؤں پہنچا۔ سرحد سے اُس کے گاؤں کا فاصلہ بمشکل آٹھ دس کلومیٹر تھا۔

گاؤں کے باہر ہی حنیف اس کا منتظر تھا۔

دونوں باپ بیٹا اکٹھے گھر میں داخل ہوئے تو صغراں نے خدا کا شُکر ادا کیا تھا۔

ریاست شاہ

نتھو خاں کو مکھنے سانسی نے جو بات کہہ دی تھی اُس نے ایک مرتبہ تو نتھو کو ہلا کر رکھ دیا اُس روز زندگی میں پہلی مرتبہ نتھو نے سنجیدگی سے سوچا کہ واقعی اُس کے پاس حنیف کے علاوہ اور کیا ہے۔

یہ تو خودغرضی کی انتہا ہوتی اگر وہ حنیف کو بھی اپنے ساتھ کسی سرحدی مقابلے میں مروا دیتا۔ پھر زندگی کی گاڑی کو کس طرح گھسیٹے؟ اُس نے تو اپنے بڑوں سے زندگی میں جینے کا یہی ایک طریقہ سیکھا تھا۔

یہ تو صغراں کی عقل مندی تھی کہ اُس نے گاؤں کی خاصی زمین خرید کر اپنے بیٹے کے نام لگا دی تھی تاکہ مستقبل میں اُسے معاشی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے ورنہ تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اُن کے پاس کچھ جمع بھی رہتا۔ کیونکہ نتھو خاں نے جو کمایا جس طرح کمایا اُسی طرح اُڑا بھی دیا۔

اس روز پہلی مرتبہ اس نے ریاست علی کی پیش کش پر غور کیا تھا ــــ!

ریاست علی اُن کے علاقے کا ایم پی اے اور نزدیکی دیہات کا رہنے والا تھا۔ اس نے دوسرے عیاشی سیاست دانوں کی طرح اپنی کوٹھی تو شہر کی ماڈرن آبادی میں بنا رکھی تھی لیکن اپنا حلقہ انتخاب نہیں بدلا تھا۔

ریاست علی کے آباؤ اجداد نسل در نسل حکمرانوں کی غلامی کرتے آئے تھے ــــ اُس کے حلقہ انتخاب کے بڑے بوڑھے بتایا کرتے تھے کہ اُن لوگوں نے قیام پاکستان سے چند سال پہلے اپنی ذات بدل لی تھی اس سے پہلے ان کا تعلق چھوٹی ذات کے لوگوں سے

تھا جنھیں گاؤں کے لوگ اپنی زبان میں "کمی کمین" کہتے ہیں ۔

ریاست علی کے پردادا نے انگریزوں کے لیے خدمات انجام دیتے ہوئے اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کر دیا تھا۔ وہ انگریزوں کا ٹاؤٹ تھا اور اس علاقے میں سرگرم عمل تحریک آزادی کے مجاہدوں کی جاسوسی کیا کرتا تھا۔ اپنی انہی خدمات کے عوض وہ مزارعے سے مالک کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

اُس نے اس علاقے کے بڑے بڑے ڈاکو انگریز پولیس کو گرفتار کروائے تھے۔ ایک ایسے ہی ڈاکو کو جسے مقامی لوگ اپنے لیے رحمت خداوندی خیال کرتے تھے لیکن جو انگریزوں کے نزدیک ڈاکو اور قاتل کی حیثیت رکھتا تھا۔ ایک روز ریاست علی کے پردادا نے بہانے سے اپنے ہاں بلایا اور کھانے میں زہر دے کر مار ڈالا۔

اس کی اس حرکت کو اس ڈاکو کے ساتھیوں نے معاف نہیں کیا اور اتنی اذیت ناک موت سے دوچار کیا کہ اگر اس خاندان میں غیرت نام کی کوئی چیز ہوتی تو دوبارہ کبھی اس ذلیل کام میں ہاتھ نہ ڈالتے۔

لیکن ـــــ

پردادا کی موت کا جو انعام انھیں ملا۔ اُس نے تو خاندان کی آنکھیں ہی کھول کر رکھ دیں۔ ایک دن علاقے کا انگریز ڈپٹی کمشنر وہاں آیا اور اُس نے ریاست علی کے دادا کو گھوڑی پر چڑھ کر اُسے بھگاتے رہنے کی تلقین کی اور چند گھنٹوں کے اندر وہ لوگ سینکڑوں ایکڑ اراضی کے مالک بنا دیئے گئے۔ اراضی کے حقیقی مالکوں کو اُن کے مزارعے بن کر باقی زندگی گزارنے پر مجبور ہونا پڑا۔

ریاست علی کے دادا کے ہاتھ اتنی بڑی جاگیر کیا لگی اُس کے تو خون کا خمیر ہی بدل گیا اور لوگ حیران رہ گئے کہ اب سرکار دربار میں اُس کے نام کے ساتھ شاہ کا لاحقہ بھی استعمال ہوتے لگا ہے

بندو اُس کا نام تھا جو اب بندے علی شاہ میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی جاگیر پر بسنے والوں کو سختی سے اِس بات کا پابند کر دیا تھا کہ اُسے شاہ صاحب کہہ کر

پکارا جائے اگر کسی نے اُس کا شجرہ جاننے کی کوشش کی تو بندے علی شاہ نے اُسے تھانے بھجوا دیا ـــــ!

ریاست علی کے والد کی زندگی میں چند لوگ ہی ایسے زندہ رہ گئے تھے کہ جنھیں ان کی اصلیت کا علم ہو۔ اسی دوران پاکستان کی تحریک آزادی نے زور پکڑنا شروع کیا تو ریاست علی کا باپ انگریز کا پشتینی غلام ہونے کے ناطے جی جان سے اُن کی خدمت میں جُت گیا۔ پھر اُس نے کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی۔

سرکار دربار سے تعلقات کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ اُسے سیاست کی سُدھ بُدھ ہو گئی اور اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ پاکستان کو معرض وجود میں آنے سے اب دُنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی کیونکہ قدرت اس فیصلے پر صاد کر چکی ہے۔

انگریز نے برصغیر سے جانے کا فیصلہ کیا تو قیام پاکستان سے بمشکل چند ماہ پہلے ریاست علی شاہ کے والد نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی ـــــ

اُس کے انگریز آقا اسے ایسے ایسے سیاسی داؤ پیچ سکھا گئے تھے کہ جن سے اُس زمانے کے سیدھے سادھے مسلمانوں کی آشنائی نہیں تھی۔ شاہ صاحب نے وہ سارے سیاسی ہتھکنڈے استعمال کیے اور دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں کی سطح سے اُٹھ کر تحصیل اور پھر ضلع کی سطح کے لیڈر بن گئے ـــــ

جن بے چاروں کے ساتھ اُن کے بڑوں نے ظلم کیے تھے اُن کی آواز سیاست کے نقار خانے میں طوطی کی آواز جتنی حیثیت بھی اختیار نہ کر سکی نہ ہی کسی کے پاس اتنا وقت تھا کہ بیٹھ کر اُن کی دُکھوں بھری داستان سناتا رہے ـــــ

شاہ صاحب نے اپنی ماضی کی تربیت کے بل بوتے پر اس علاقے کی لیڈرشپ سے تعلقات قائم کر لیے وہ بھی کوئی بہت اچھے لوگ نہیں تھے۔ ان میں زیادہ تعداد اُن موقع پرستوں کی تھی جو ہوا کے بدلتے رُخ کے ساتھ اُڑتے ہوئے مسلم لیگ کے دامن میں آ گرے تھے اور اب اُس کی ڈفلی بجا رہے تھے۔

بڑے اور چھوٹے چوہدریوں نے مل کر مقامی عوام کا استحصال شروع کیا اور یہ

رسم پاکستان بننے کے بعد زیادہ زور شور سے جاری رکھی۔
ریاست علی شاہ کا باپ جب تک زندہ رہا علاقے میں ایم پی اے، ایم این اے،
کونسلر، چیئرمین وغیرہ وغیرہ کے عہدوں پر فائز ہو کر حکومت کے مزے لوٹتا رہا۔ سترہ
اٹھارہ سال کی عمر سے اس نے ریاست علی کو بھی اپنے ساتھ لگا لیا تھا اور عہدوں کی
بندر بانٹ باپ اور بیٹوں کے درمیان ہی رہتی تھی۔ اس علاقے کے تمام بڑے عہدوں
پر شاہ خاندان ہی قابض رہتا جن لوگوں نے قیامِ پاکستان کے لیے اپنی جانوں کے
نذرانے پیش کیے تھے اپنی لاکھوں کی جائیدادوں سے ہاتھ دھوتے تھے وہ بے بس
یہ تماشا دیکھتے رہتے۔ کبھی کبھی کوئی زبان اگر ان کے خلاف زہر اُگل دیتی تو اپنی مکارانہ
سیاست کے بل بوتے پر یہ لوگ بولنے والے کا منہ دولت کے زور سے بند کر دیتے
اگر دولت کام نہ آتی تو ڈنڈا کام آجاتا اور ان کے اکثر مخالفین حادثاتی موت
کا شکار ہو جاتے۔

کوئی ایکسیڈنٹ میں مارا جاتا ——
کوئی دریا میں ڈوب جاتا ——
کسی کو سانپ ڈس لیتا ——
لیکن ——

اصل میں یہ سب شاہ فیملی کا شکار ہوتے تھے۔ اُن کے مخالفین ان کے خلاف
طوفان کھڑا کرتے۔

تھانے کچہریوں میں مقدمات چلتے ——
وکیلوں کی بحثیں ہوتیں ——
لیکن ——

نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ آخر میں یہی ثابت ہوتا کہ مرنے والا اتفاقی
یا حادثاتی موت سے دوچار ہوا ہے کسی نے اُسے نہیں مارا ——
ریاست علی شاہ کا باپ اور باقی خاندان کسی ایک پارٹی سے کبھی وابستہ نہیں

رہے۔ اُن کی پارٹی "سرکاری پارٹی" ہوتی تھی ——
جو پارٹی برسرِ اقتدار ہوتی یہ لوگ اُس کے نمکخوار اور عہدے دار ہوتے تھے۔
جیسے ہی اقتدار سے رخصتی ہوتی یہ بھی اُس سے رخصت مانگ لیتے ——
اپنے ماضی کے تجربے کی بنیاد پر بڑے شاہ صاحب کو اس بات کا گیان ہو جاتا
تھا کہ موجودہ سرکار کی کب چھٹی ہونے والی ہے اور چھٹی ہونے سے چند ماہ پہلے وہ
اپوزیشن میں شامل ہو کر اگلی حکومت میں اپنی سیٹ محفوظ کر لیتے ——
بڑے شاہ صاحب کو بھی اپنے بزرگوں کی طرح ہر شرعی عیب لگا ہوا تھا۔ اُس
زمانے میں حکیم، وید اور سنیاسی شاید اصلی نسخہ جات تیار کرتے ہوں۔ اب ہر چیز نقلی
ہو رہی تھی جب خوراک اصلی نہ رہی تو نسخے اور کشتے کہاں اصلی رہتے ——
بڑے شاہ صاحب کی عمر ستّر سال ہونے کو آ رہی تھی
لیکن ——
ابھی تک وہ جنسی بے راہروی سے نہیں ہٹے تھے ——
انھوں نے اپنی زندگی میں باقاعدہ شادیاں پانچ کی تھیں۔ اب بھی ان کی تین
شریکِ حیات زندہ تھیں تیسری کو تو وہ چار پانچ سال پہلے ہی بیاہ کر لائے تھے
یہ سب کچھ "آن دی ریکارڈ" تھا ——
آف دی ریکارڈ وہ کیا کیا گُل کھلاتے تھے۔ اس کا علم ہر کسی کو تو نہیں تھا پھر بھی
اُن کے حلقہ احباب کو ضرور تھا۔ شاہ صاحب کے شہر کی طوائفوں سے تعلقات کوئی
راز کی بات نہیں تھی۔ انھوں نے اپنے جسم کو قائم دائم رکھنے کے لیے اپنے بڑوں کی
طرح کشتہ جات کا استعمال بھی شروع کر دیا تھا یہی ایک ذریعہ تھا جس سے وہ اپنی
جنسی حِس کو تسکین پہنچا سکتے تھے۔
لیکن ——
اب پہلے والا زمانہ نہیں رہا تھا —— !
تب تو گاؤں کا حکیم بھی کوئی کام کی دوا دے دیتا تھا۔

شاہ صاحب نے دوسرے ضلع کے ایک گاؤں سے ایک سنیاسی کو اس کی شہرت سُن کر طلب کیا تھا اور اُسے اپنے ہاں مہمان رکھ کر اُس سے چاندی کا کُشتہ تیار کروا رہے تھے ----!

سنیاسی نے اپنی دانست میں تو کوئی غلطی نہیں کی تھی اور ہر دفعہ محنت سے چاندی کو آنچ دی۔

کبھی کوئی آنچ کم یا زیادہ رہ گئی ہوگی شاید اسی کے سبب کشتہ چاندی کشتہ زہر میں تبدیل ہو گیا۔

شاہ صاحب نے پہلی خوراک خالص مکھن کے ساتھ کیا لی اُن کا تو کلیجہ ہی کٹ گیا ----!!

بستر پر لیٹے لیٹے کپڑے گندے کرتے رہتے۔ ایک وہ وقت بھی آگیا جب ریاست علی شاہ نے جو بڑی بے چینی سے اپنے والد صاحب کی موت کا منتظر تھا۔ اُن کی چارپائی دوسری حویلی میں جہاں اس کی تیسری والدہ صاحبہ فروکش تھیں پہنچا دی ----

شاہ صاحب نے اس حویلی میں اسی حالت میں دم توڑا کہ اُن کے جسم سے بدبو کے بھبھوکے اُٹھ رہے تھے۔

اُن کے مخالفین تو اسے مکافاتِ عمل سے تشبیہ دیتے تھے لیکن سنیاسی کا کہنا تھا کہ شاہ صاحب نے اُس کی ہدایت کے برعکس کشتہ زیادہ مقدار میں کھا لیا تھا یہی اُن کی موت کا سبب بن گیا۔

ریاست علی شاہ نے سنیاسی کی ٹھکائی اپنے غنڈوں سے اچھی طرح کروانے کے بعد ایک روز اُسے کرایہ دے کر اس شرط پر جانے کی اجازت دے دی کہ وہ آئندہ ساری زندگی نزدیک و دُور کے کم از کم سو دیہاتوں میں اپنی شکل نہیں دکھائے گا۔

باپ کی موروثی گدی پر بیٹے کا حق ہی بنتا تھا۔ ریاست علی شاہ یونین کونسل کا چیئرمین تھا اور بڑے شاہ صاحب ایم پی اے تھے۔ اب اُن کی موت پر جو گدی خالی ہوتی تھی اُس پر ضمنی الیکشن ہونے والے تھے۔

یہ ضمنی الیکشن بھی معمول کی کارروائی ہوتے۔ ریاست شاہ جانتا تھا کہ اس علاقے میں آئندہ ہزار سال تک بھی اگر الیکشن ہوتے رہے تو اس کے خاندان سے ایم پی اے، ایم این اے اور چیئرمین شپ کوئی نہیں چھین سکتا۔

وہ تو نجانے کب سے بڑے شاہ صاحب کی موت کے خواب دیکھ رہا تھا۔

لیکن ----

شاہ صاحب نے تو حد کردی تھی اور مرنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ اُلٹا شادی پر شادی کیے چلے جا رہے تھے ----

والد کی موت کی رسومات سے فارغ ہوتے ہی ریاست شاہ نے پہلا کام یہی کیا کہ اپنی دونوں ماؤں سے جن سے کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی تھی اُن کے حصے کی جائیداد اپنے نام لکھوا لی اسے خطرہ تھا کہ کہیں دوسرے بھائی یہ کام اُس سے پہلے نہ کر لیں پھر الیکشن کی تیاریوں میں جُت گیا۔

ریاست شاہ کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اُسے اپنی زندگی میں کوئی ایسی خبر بھی سُننے کو ملے گی۔ اُس روز جب نذیر موچی نے آکر بتایا۔

"شاہ جی ---- بلوال والے سردار بھی الیکشن کی تیاری کر رہے ہیں" ----

ایک لمحے کے لیے تو اُسے اپنی قوتِ سماعت پر یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ اُس نے دوبارہ نذیر موچی سے تصدیق کی کہ اُس نے کیا یہی فقرہ کہا ہے اور جب اُس نے بتایا کہ واقعی "بلوال" کا سردار اُس کے خلاف الیکشن کی تیاری کر رہا ہے تو اُسے زبردست ذہنی دھچکا لگا۔

"سالے ---- سکھوں کی اولاد ---- ہم سے منہ لگائیں گے" ----

اس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے۔

"اوئے نذیرے ذرا خبردار رہنا —— سمجھے! ہمیں ایک ایک پل کی رپورٹ چاہیئے۔ پتہ لگاؤ اُن کے پیچھے کون ہے —— ٹھیک ہے وہ مالدار اسامی ہے لیکن اس علاقے میں کسی بدمعاش پارٹی کی مدد کے بغیر کوئی الیکشن نہیں لڑ سکتا" ——

فضل شاہ نے کہا جو ریاست علی شاہ کا سوتیلا بھائی اور ریاست شاہ کے ایم پی اے ہو جانے کی صورت میں چیئرمین کی گدی پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

"شاہ جی آپ کے نمک خوار ہیں —— بے فکر رہیں۔ ایک ایک پل کی خبر دوں گا۔ آپ کو ——"

نذیر موچی نے ہاتھ باندھتے ہوئے انکساری دکھائی۔

"بھائی جان —— میرا ایک مشورہ ہے"۔

اُس نے نذیر موچی کی روانگی کے بعد علیحدگی میں ریاست شاہ سے کہا۔

"ہاں —— ہاں۔ کہو کہو ——"

ریاست شاہ جس کے ابھی تک اس خبر سے حواس ٹھکانے نہیں آ رہے تھے بولا ——

"یہ سردارا بڑی جوجھ ہے —— اس کے متعلق اندازے کی غلطی نہ کرنا —— ہمیں اُس کے نزدیکی دیہاتوں سے دو چار بندے لینے پڑیں گے ورنہ کم از کم پندرہ بیس دیہاتوں کے ووٹ وہ بدمعاشی سے ہی لے جاتے گا ——"

فضل شاہ نے اپنی رائے پیش کی۔

"تمہارے خیال سے کون سا آدمی وہاں ایسا ہے جسے ہم سردارے کے مقابلے پر لا سکتے ہیں" ——

ریاست شاہ نے اُس کی بات کی تہہ میں اُترنے کے بعد پوچھا۔

"نتھو خاں ——"

فضل شاہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

"نتھو چور —— شاہ جی تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ مانا وہ سرحد پار کا بدمعاش ہے اُس نے تین چار بڑے جاندار مقابلے بھی کیے ہیں لیکن . . ."

"بھائی صاحب —— میرے ڈیرے پر روزانہ کم از کم دس دیہاتوں کے بدمعاش روٹی کھاتے ہیں۔ میں آپ کو آج بتا دوں کہ ان سو پچاس دیہاتوں میں اس سے زیادہ دلیر اور سیاسی بندہ ہمیں نہیں مل سکتا —— میری نظر اس سے زیادہ اُس کے بیٹے حنیفے پر ہے —— تین چار تفتیشیں کاٹ چکا ہے وہ اور کیا مجال جو پولیس کو پلّہ پکڑایا ہو —— جانتے ہو کوئی پولیس والا اُس کے گاؤں کی طرف منہ نہیں کرتا —— شاہ جی —— سردارے نے اگر ہم سے پہلے اُسے ہاتھ میں لے لیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

فضل شاہ کی آخری بات نے ریاست شاہ کے دماغ کے سارے تار جھنجھا کر رکھ دیئے تھے۔

واقعی اگر اس سے پہلے سردارے نے نتھو خاں کو ہاتھ میں لے لیا تو....؟

"فضل شاہ —— تم آج ہی اُس سے رابطہ کرو —— آج ہی فوراً ——"

اُس نے بے چینی سے کہا۔

"ٹھیک ہے بھائی جان —— اب آپ بے فکر ہو جائیں اگر نتھو سے بات بن گئی تو سردارا اُن علاقوں میں کسی سے بدمعاشی سے ووٹ نہیں لے سکے گا —— اور یوں بھی ایک وہی ایسا بدمعاش ہے جو سردارے سے ٹکر لے سکے ——"

فضل شاہ نے اُسے مطمئن کرواتے ہوئے کہا۔



فضل شاہ نے نذیر موچی کے ذریعے ہی نتھو خاں کو ملاقات کا پیغام بھیجا تھا۔

نتھو خاں پہلے تو حیران ہوا کہ اِن لوگوں کو اس سے کیا کام آن پڑا ——

"اوئے کوئی چکر تو نہیں ہے —— سچ سچ بتانا" ——

حنیف نے جو اُس کے قریب ہی بیٹھا تھا نذیر موچی کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"نتھو خاں تیرے ساتھ کوئی چکر کرکے اس علاقے میں کوئی زندہ رہ سکتا ہے —— خدا کی قسم مَیں صرف شاہ صاحب کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ انھوں نے تمھارے ساتھ ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے۔"

اُس نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے شاہ صاحب سے کہہ دینا کہ وہ ملاقات کے لیے ہمارے ہاں تشریف لے آئیں۔ ہمیں تو اُن سے کوئی کام نہیں —— کنواں تو پیاسے کے پاس چل کر نہیں جایا کرتا"——

حنیف نے کہا——

نذیر موچی نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ لڑکا اپنے باپ کے بھی پَر کاٹے گا —— یوں بھی اسے فضل شاہ نے بطورِ خاص ہدایت کی تھی کہ نتھو خاں کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا خواہ اس کی کچھ بھی قیمت اَدا کرنی پڑے۔

"ٹھیک ہے —— نتھو خاں —— تم بھی صحیح بات کہہ رہے ہو۔ اگر انھیں کام ہے تو خود آئیں، کوئی اگر بڑا ہے تو اپنے گھر ہے تم بھی کسی سے کم نہیں ہو۔"

نذیر موچی نے اُس کی چاپلوسی کرتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ نتھو خاں کے جواب سمیت فضل شاہ کے قریب کھڑا تھا——

"دماغ خراب ہے سالے کا ——"

فضل شاہ سیخ پا ہو گیا۔

"شاہ جی —— ہوشیاری سے۔ سوچ سمجھ کر۔ آپ نے اگر چیئرمینی حاصل کرنی ہے تو دماغ کو ٹھنڈا رکھا کریں —— یاد رکھیں اگر ریاست شاہ صاحب الیکشن ہار گئے تو آپ قیامت تک چیئرمین یونین کونسل نہیں بن پائیں گے۔ میری بات سمجھ رہے ہیں ناں آپ —— اور یوں بھی شاہ جی مطلب کے لیے گدھے کو باپ بنا لینے میں کیا ہرج ہے"——

ایسی باتیں اُس سے نذیر موچی ہی کر سکتا تھا۔

نذیر موچی تھا تو کمی کمین لیکن فضل شاہ کی بڑی کمزوری بن چکا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں دونوں کو اندھیرے میں رکھ کر اپنا اُلّو سیدھا رکھتا تھا ——

دونوں کو عورتیں فراہم کرنا اُس کا دھندہ تھا ——

دونوں بھائی جانتے تھے کہ نذیر موچی بردہ فروش ہے۔ اُس نے نزدیک، دُور کے دیہاتوں سے کئی عورتوں کو ورغلا کر اغوا کیا اور پھر انھیں بازارِ حُسن کی زینت بنا ڈالا۔

لیکن ——

دونوں کسی نہ کسی طرح اس کام میں اس کے حصّہ دار تھے۔

نذیر موچی بھی اُن کا پشت در پشت خادم تھا اور اس خاندان کی ہر کمزور رگ پر اُس نے ہاتھ رکھا ہوا تھا۔

کوئی ایسی لڑکی نہیں تھی جسے اس نے پہلے ان دونوں کی عیاشی کا سامان نہ بنایا ہو۔ اس کے بعد ہی انھیں بازارِ حسن میں پہنچایا جاتا تھا۔ اس طرح اس نے فضل شاہ اور ریاست شاہ کو ایک طرح سے اپنی کمزوری بنا لیا تھا اور خود اُن کی کمزوری بن چکا تھا۔

"نذیرے —— تیری بات تو ٹھیک ہے لیکن اس طرح اگر اس علاقے کے چوہڑ اُٹھ کر ہمارے منہ لگنے لگے تو پھر ہماری سیاست تو ہو چکی ——"

"بادشاہ ہو! وقت کو سمجھا کرو —— آپ کے بڑے بوڑھوں نے حالات کو سمجھ کر اور دماغ ٹھنڈا رکھ کر ہی یہ مقام حاصل کیا تھا۔ اللہ بخشے میرا دادا بتایا کرتا تھا کہ آپ کے دادا جان بڑے شاہ صاحب انگریزوں ۔۔۔۔"

"بس زیادہ بک بک نہ کیا کر اور نتھو خاں کو کہہ دے کہ ہم کل کسی وقت آئیں گے"——

اس نے نذیر موچی کی بات کاٹتے ہوئے کہا ——

○

اگلے روز جب دوپہر کے وقت فضل شاہ اپنے چھ سات باڈی گارڈز کے ساتھ

جیپ پر بیٹھا نتھو خاں کے گاؤں کی طرف جا رہا تھا تو اُس کے دماغ میں رہ رہ کر نذیر موچی کی یہ بات گونج رہی تھی کہ اگر ریاست شاہ الیکشن ہار گیا تو وہ قیامت تک یونین کونسل کا چیئرمین نہیں بن سکے گا۔

اس کے شیطانی دماغ نے تو اُسے بہت دُور کی سجھائی تھی لیکن فی الوقت اُس نے نتھو خاں کی حمایت ریاست شاہ کے لیے حاصل کرنا بھی ضروری جانا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سردارا اس علاقے کا بدمعاش اور مانا ہوا سمگلر ہے۔ اس کے پاس ریاست شاہ کے مقابلے میں خرچ کرنے کے لیے دولت بھی بہت تھی اور بدمعاش بھی ——"

دولت میں تو یہ لوگ اُس کا مقابلہ کر لیتے۔

لیکن ——

بدمعاشی کی بات اور تھی ——

اس میدان میں سردارا اُن پر بھاری تھا۔ اگر انھیں نتھو خاں کی مدد مل جاتی تو اُن کا پلڑا بھاری ہو سکتا تھا۔

نتھو خاں اپنے بیٹے کے ساتھ اپنی حویلی پر فضل شاہ کا منتظر تھا۔ اپنی دانست میں فضل شاہ نے اپنے ساتھ جدید اسلحے سے لیس مسلح بدمعاشوں کا جلوس لا کر انھیں مرعوب کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ الگ بات کہ نتھو خاں یا اُس کے بیٹے پر اس نمائش کا کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔

نتھو خاں نے اُن کے لیے ان کی توقع سے بڑھ کر کھانے کا بندوبست کر رکھا تھا —— کھانے سے فراغت پر فضل شاہ اُسے اکیلے ایک کمرے میں لے گیا تھا۔

"نتھو خاں ہمارے بزرگوں نے ہمیں ایک ہی گُر سکھایا ہے —— آدمی کی پہچان، ہم جوانوں کی قدر کرنے والے لوگ ہیں۔ تمھاری شہرت جب ہم تک پہنچی تو شاہ صاحب نے فوراً مجھے حکم دیا کہ تم سے رابطہ کروں —— نتھو خاں یہ ملک بندوں سے بھرا پڑا ہے لیکن مرد نہیں ملتے —— بہت تھوڑے ایسے ہیں جو پورے دنوں کے ہیں۔ میں

تمھارے پاس دوستی کا ہاتھ بڑھانے آیا ہوں —— تم نے خود کو کنویں میں بند کر رکھا ہے —— اب ان چوری چکاریوں میں کچھ نہیں پڑا —— کوئی بڑا ڈاکہ مارو —— ایک ہی ڈاکے میں ساری زندگی کی روٹیاں اکٹھی کر لو —— ان دیہاتوں میں ہزاروں ایکڑ سرکاری اراضی پڑی ہے یہ کس کے لیے ہے —— ہمارے لیے —— ہمارے دوستوں کے لیے —— تم جانتے ہو سرکار دربار میں کسی کو ہمارے فیصلے کے خلاف سر اُٹھانے کی جرأت نہیں ہو سکتی —— بڑے شاہ صاحب کی موت سے خالی ہونے والی سیٹ پر ریاست شاہ سے زیادہ کس کا حق ہو سکتا ہے —— ہماری کسی سے دشمنی نہیں۔ ہم پچاس سال سے سیاست کرتے آ رہے ہیں۔ ہمیں علم ہے کہ حکومت سے کس طرح نمٹا جاتا ہے —— حکومت کرنا ہمارا حق ہے اگر سردارے جیسے اُٹھائی گیرے اسمبلیوں میں پہنچ گئے تو ہماری کیا عزت رہ جائے گی ——"

فضل شاہ بولتا چلا جا رہا تھا ——

کھانے سے پہلے اُس نے ولایتی شراب کی جو آدھی بوتل چڑھائی تھی اُس نے اب اثر دکھانا شروع کیا تھا لیکن اُس کے حواس قائم تھے۔

"نتھو خاں —— ہم تمھاری مدد چاہتے ہیں۔ ان علاقوں کے لوگ تمھیں پیروں کی طرح پوجتے ہیں اگر تم کہو گے تو وہ صرف ہمیں ووٹ ڈالیں گے —— ہمیں الیکشن میں تمھاری مدد کی ضرورت ہو گی —— گاڑیاں، اسلحہ، بندے، روپیہ جو چاہو۔ جتنا چاہو لے لو —— اور ہاں یہ دوستی صرف مطلب نکالنے کے لیے نہیں ہے —— جس زمین پر ہاتھ رکھو گے اُس کا قبضہ تمھیں دلا دیں گے اور سرکار دربار میں تمھارے جائز ناجائز سارے کام ہوں گے۔"

فضل شاہ نے اُس کی طرف جھکتے ہوئے سرگوشی کی۔

"شاہ جی —— مَیں آپ کا شکر گزار ہوں —— لیکن ہم لوگ سیاست کو کیا سمجھیں گے ——"

نتھو خاں ابھی اُسے اور ٹٹولنا چاہتا تھا۔

"ہم سمجھائیں گے نتھو خاں ـــ ہم سمجھائیں گے۔ ارے تمھیں کونسلر بنا دیں گے علاقے کا ـــ تھانیدار کی جرأت نہیں ہوگی کہ تمھارے سامنے اونچی آواز سے بول سکے ـــ سرکار دربار میں کرسی ملے گی تمھیں ـــ"

فضل شاہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی کچھ سوچنے کا موقع دیجیے ـــ میں ایک دو روز میں آپ کو اپنے فیصلے سے مطلع کر دوں گا ـــ مجھے اپنے بیٹے سے تو مشورہ کرنے دیجیے۔"

نتھو خاں فوراً کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا ـــ

"نتھو خاں تمھارا بیٹا بڑا گھبرو جوان ہے ـــ لیکن اکیلا ہے۔ اُسے سرحد کے آر پار والے دھندے سے الگ کر لو ـــ اُس نے تمھاری نسل کو آگے چلانا ہے۔ سیاست میں آجاؤ۔ آرام سے گھر بیٹھے عیش کرو گے۔ تمھارے پاس بدمعاشوں کی پوری فوج موجود ہے تمھیں کیا ضرورت ہے ان جھنجھٹوں میں پڑنے کی ـــ"

فضل شاہ نے بیٹے کے نام پر اس کی کمزور رگ دبا دی۔

"ٹھیک ہے شاہ جی ـــ میں بھی سمجھتا ہوں۔ میں نے کہا ناں کہ میں سرکار کو دو تین روز تک جواب پہنچا دوں گا ـــ"

نتھو خاں اب بھی وقت کو ٹال رہا تھا۔

"یہ رکھ لو ـــ ہماری طرف سے پہلا نذرانہ ہے ـــ تمھیں فیصلہ کرنے میں آسانی رہے گی"۔ـــ

یہ کہتے ہوئے فضل شاہ نے اپنے دائیں ہاتھ دھرا بریف کیس اُس کی طرف بڑھا دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ جس طرح جلوس کی شکل میں آئے تھے اسی طرح واپس لوٹ گئے۔ ان کی روانگی کے بعد نتھو خاں نے بریف کیس کھولا تو وہاں پچاس ہزار روپے موجود تھے ـــ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ فضل شاہ جو کچھ کہہ رہا ہے۔ سچ ہے اور وہ اس دوستی کی قیمت ادا کر سکتا ہے۔

آج جب وہ سرحد سے واپس لوٹا تھا تو اس واقعہ کو تین روز ہونے کو آرہے تھے۔ اب اس کے لیے فضل شاہ کی پیشکش ٹھکرانا ممکن نہیں رہا تھا۔

اُس روز شام ڈھلے نتھو خاں اپنے بیٹے سمیت شاہ صاحب کی حویلی پر پہنچ چکا تھا۔ اُس کی آمد کی خبر سن کر ریاست شاہ خود اُس کے استقبال کے لیے آیا تھا۔

اُس نے نتھو خاں کے لیے خصوصی اہتمام کی ہدایت کر دی تھی۔

دونوں باپ بیٹے کو یہاں اس طرح عزت دی جا رہی تھی جیسے ریاست شاہ کے بجائے وہی اس علاقے کے مالک ہوں۔ اُن کا استقبال کرنے والوں میں مقامی بدمعاش تو تھے ہی علاقے کے شرفاء بھی موجود تھے۔ جنھوں نے اپنے ہاتھوں میں نوٹوں اور پھولوں کے ہار تھام رکھے تھے۔

انھوں نے دیکھتے ہی دیکھتے دونوں باپ بیٹے کو ہاروں سے لاد دیا۔

دونوں کے اعزاز میں، شاندار ضیافت سجائی گئی تھی جس میں نزدیک دُور کے دیہاتوں سے سینکڑوں لوگ شامل ہوئے تھے۔ یہاں پہنچ کر پہلی مرتبہ دونوں باپ بیٹوں کو اپنی اہمیت کا علم بھی ہو گیا کیونکہ اس ضیافت کے اختتام پر مقامی نامہ نگاروں کے سامنے ریاست شاہ اور فضل شاہ نے دونوں باپ بیٹے کو معززین علاقہ کے رُوپ میں پیش کرتے ہُوئے اُن کی تصاویر بھی اُتروا دی تھیں اور یہ خبر بھی جاری کر دی تھی کہ آنے والے انتخابات میں انھوں نے ریاست شاہ کی حمایت کا اعلان کیا ہے ـــ

نتھو خاں کی طرف سے ریاست شاہ کی حمایت میں پہلے سے لکھا ہُوا بیان فضل شاہ کے کارندوں نے فوراً ہی اخبار نویسوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

غرض دونوں کو متاثر کرنے کے لیے ریاست شاہ نے ڈرامے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی۔

رات ڈھل رہی تھی جب انھوں نے واپس جانے کی اجازت چاہی

"نہیں نتھو خاں ـــ اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تم ہمارے ڈیرے

پہ آئے ہو تو آج رات ہمارے ہی مہمان رہو گے ۔۔۔"

فضل شاہ نے اُس کے کندھے پر بے تکلفی سے ہاتھ رکھتے ہوئے اُسے دوسرے کمرے میں لے جاتے ہوئے کہا ۔۔۔

اُس کا شیطانی ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا ۔۔۔

اس نے کھُلے گریبان کی قمیص میں سے حنیف خاں کے بازوؤں کی پھڑکتی مچھلیاں دیکھ لی تھیں۔

اسے حنیف خاں کی صورت میں مستقبل میں اپنا آہنی حصار نظر آ رہا تھا اور اسے حنیف خاں کو آج ہی قابو کرنا تھا۔

نھتو خاں کے نہ نہ کرنے کے باوجود انھوں نے اُسے رات ٹھہرنے پر مجبور کر دیا ۔۔۔!

فضل شاہ اسے اپنے ساتھ ہی حویلی کے دوسرے حصّے میں لے گیا تھا۔ جہاں ریاست شاہ پہلے سے اُس کا منتظر تھا۔

دونوں کو مصروفِ گفتگو چھوڑ کر وہ باہر آ گیا۔

ایک طویل برآمدہ طے کرنے پر اُسے نذیر موچی کی صورت دکھائی دی۔

"یہاں کیا جھک مار رہے ہو ۔۔۔ کچھ بندوبست ہوا یا نہیں؟

اُس نے نذیر کی شکل پر نظر پڑتے ہی کہا۔

"شاہ جی ۔۔۔ ایسا مال لایا ہوں کہ حنیف خاں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی"۔۔۔

اُس نے چھوٹتے ہی کہا ۔۔۔

"نذیرے شکار بچ کر نہ جانے پائے ۔۔۔ ایسا شکنجہ ڈالو کہ کبھی نکل نہ سکے ۔۔۔"

فضل شاہ کے چہرے پر برستی لعنت میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔

"شاہ جی ۔۔۔ آج تک کوئی بچ کر جا بھی سکا ہے ۔۔۔ ایسے کئی نذیرے کی زندگی میں آئے اور گئے ۔۔۔ آپ دیکھتے رہیئے ۔۔۔ اگر آپ کا بندہ بے دام نہ بنا

دوں تو نذیر نام نہیں میرا"۔۔۔

نذیر موچی نے بے حیائی سے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

"پیسوں کی پرواہ نہ کرنا ۔۔۔ لیکن پہلا حملہ زوردار ہونا چاہیئے"۔۔۔

فضل شاہ ابھی تک غیر مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔

"شاہ جی ۔۔۔ شہر سے زہراں بائی کو لایا ہوں ۔۔۔ اپنے کوٹھے سے باہر قدم نہیں نکالتی ۔۔۔ میرا مولا ہی جانتا ہے کیا کیا نخرے اُٹھانے پڑے ہیں ۔۔۔ ایک مرتبہ تو حنیف خان کے ہوش اڑا کر رکھ دے گی"۔۔۔

نذیر موچی اپنے نمبر اور فضل شاہ کا خرچ بڑھا رہا تھا۔

"شاہ جی ۔۔۔ کُتّے ہیں آپ کے۔ غلام ہیں آپ کے۔ جو بات آپ نے ایک مرتبہ کہہ دی۔ وہ کہہ کر بے فکر ہو جایا کیجئے"۔

اُس نے فضل شاہ کی تسلی کرواتے ہُوئے کہا۔



عین اُن لمحات میں جب ریاست شاہ نھتو خاں اور علاقے کے دیگر معززین کے ساتھ حویلی کے دوسرے حصّے میں گپ شپ کر رہا تھا اور انھوں نے نھتو خان کا دل بہلانے کے لیے نزدیک دُور کے دیہاتوں سے ہیر اور مرزا صاحباں گانے والے اکٹھے کر رکھے تھے، حویلی کے دوسرے حصّے میں زہراں بائی کے مُجرے کا آغاز ہو چکا تھا ۔۔۔!

یہ مُجرا چونکہ حنیف خان کے لیے ترتیب دیا گیا تھا۔ لہٰذا اسی کو مہمان خصوصی کی حیثیت دی جا رہی تھی۔

زہراں بائی کے ایک ایک بل پر نوٹوں کی بارش ہو رہی تھی ۔۔۔!

وہ جان بوجھ کر حنیف خان پر گرتی چلی جاتی تھی جبکہ نذیرا اور فضل شاہ حنیف خان کے سر سے نوٹوں کے بنڈل نچھاور کر رہے تھے ۔۔۔!

حنیف خان کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

اُس کا باپ خاندانی بدمعاش تھا ــــ
وہ جانتا تھا کہ آگ اور گھی کے ملاپ سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ اُس نے ساری زندگی غیر عورت کے جسم کو چھُو کر نہیں دیکھا تھا۔
اُس نے حنیف خان کو ایک ہی بات سمجھائی تھی کہ عورت کا ساتھ مرد کو بُزدل بنا دیتا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا ــــ
"پُتّر! جوان بڑی بڑی تفتیش کاٹ لیتے ہیں۔ لیکن عورت ذات کے دام میں پھنسنے کے بعد اُن کی جواں مردی صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ اُسے خوف آنے لگتا ہے ــــ سب کچھ چھوڑ کر وہ عورت کا ہو جاتا ہے ــــ سب کچھ چھوڑ کر"
نقو خان نے اپنے بیٹے کو دودھ گھی میں پالا تھا۔ اُسے جواں مرد بنایا تھا۔ اُس کے رگ وپے میں کوٹ کوٹ کر دلیری بھری تھی۔
لیکن ــــ
حنیف خان تو ایک ہی جھٹکے میں منہ کے بل آن گرا ــــ!
اُسے آج پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس کا "چاچا" تو اس سے ساری زندگی جھوٹ بولتا آیا تھا ــــ
عورت کا قرب تو مرد کو دلیر کر دیتا ہے ــــ
زہراں بائی کے سامنے وہ "راجا اِندر" بنا خود کو دُنیا کا سب سے بڑا جواں مرد سمجھ رہا تھا۔ جب وہ بل کھا کر لہراتی ہوئی اس کے سامنے اپنے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اُس کے گالوں پر نذیر موچی اور فضل شاہ کی طرف سے رکھے گئے نوٹ اُٹھاتے ہوتے اس کے گالوں پر ہلکی سی چٹکی بھرتی اور اس کی طرف جُھک کر اپنے گریبان کی نمائش کرتی تو حنیف خان کے خون میں چنگاریاں چھٹنے لگتیں ــــ
اُسے اپنا انگ انگ مستی میں ڈوبا محسوس ہوتا ــــ
اس کا سینہ پھُول کر چھ انچ اور پھیل جاتا ــــ
بازؤں کی مچھلیاں تڑپنے لگتیں ــــ

زہراں بائی کوئی مہاراجہ پٹیالہ کے دربار کی طوائف تو تھی نہیں ــــ!
اُسے خطیر رقم دے کر یہاں اسی مقصد کے لئے بُلایا گیا تھا۔ حالات کا دھارا مخالف سمت بہہ رہا تھا۔ اُسے بھی علم تھا کہ اب تو گھر کا خرچ چلانا کارِ دارد ہے۔ بازار ہم ۲ گھنٹے میں دو تین گھنٹے کے لئے کھُلتا تھا۔
اور ماحول ــــ ایسا دہشت زدہ کہ تماش بین ادھر کا رُخ کرتے خوف کھاتے تھے۔ پولیس والے تو یہاں رات دیر گئے ہوٹلوں میں کھانا کھاتے گاہکوں کو ہانک کر تھانے لے جاتے تھے وہ تماش بینوں کو کہاں معاف کرتے ــــ!
فضل شاہ کی طرف سے اُسے بیس ہزار روپے اس کے ناز و ادا کی قیمت نہیں دی گئی تھی۔
نذیر موچی نے اُس کی ماں سے صاف کہہ دیا تھا۔
"بی بی ــــ خیال رکھنا رات وہیں گزارنی ہے زہراں بائی نے ــــ اور ہر صورت یہ کارنامہ انجام دینا ہے۔ شاہ صاحب کا حکم ہے" ــــ
"نذیرے مولا تیرا بیڑہ غرق کرے ہم خاندانی لوگ ہیں۔ ہم سے اب ایسے دھندے بھی کروائے گا" ــــ
دمے کی دائمی مریض عنایت بائی نے کہا۔
"ٹھیک ہے بی بی تیری مرضی ــــ نہ لے۔ مَیں تو تیری بھلائی کو کہہ رہا تھا۔ اِس سے آدھی رقم میں کسی تھیٹر میں کام کرنے والی کو لے جاتا ہوں ــــ وہ تو پُرانے تعلقات کی شرم مار گئی کہ مَیں تیرے پاس . . . ."
یہ کہتے ہوئے اُس نے اُٹھنا چاہا تو بوڑھی نائکہ پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔
اُس نے کھانستے کھانستے نذیر موچی کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تھا ــــ
"کمال ہو گئی ــــ غصّے والی بات کیا ہو گئی ہم سے ــــ لا ادھر کر ــــ"
اُس نے کھانسی رُکنے پر کہتے ہوئے جھپٹ کر نذیرے کے ہاتھ سے دس ہزار روپیہ کا بنڈل کھینچ لیا اور اُسے گننے بیٹھ گئی۔

"نذیرے تیرا بیڑہ غرق ہوجائے ——یہ تو دس ہزار ہیں ——"
اُس نے اپنے پان دان کا ڈھکن اُٹھا کر نوٹ اس کے نیچے رکھتے ہوئے کہا
"سمجھا کر بی بی —— دس پندرہ ہزار تو وہاں ہوجائیں گے ——اتنی رقم تو میں مجرے کے چکر میں دلوا دوں گا ——اگر پھر بھی کوئی کسر رہ گئی تو وہ بھی نکل جائے گی ——"

نذیرا بھی اپنے میدان کا شہسوار تھا۔

اس نے ساری زندگی "دلّالی" کی کمائی کھائی تھی ——

کنجروں کی رگ رگ سے اُسے آشنائی تھی:

نذیرے تجھ پر اعتبار کر رہی ہوں۔ بچّی کا خیال رکھنا ——زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیئے ——

صبح ناشتہ کرتے ہی اُسے روانہ کردینا ——میری بات سمجھ گئے ناں ——

عنایت بائی نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"بی بی —— ہمارا تمھارا کوئی نیا ساتھ نہیں ——پُرانا ساتھ ہے اور رہنا ہے۔ ایک دوسرے سے اگر ہم تعاون نہیں کریں گے تو کون کرے گا"

نذیر موچی نے اُس کی طرف دیکھ کر حسبِ عادت آنکھ دبائی تھی۔

زہراں بائی اور اس کے سازندوں کو وہ اپنے ساتھ ہی شاہ صاحب کی پجیرو جیپ میں لے کر آیا تھا۔ زہراں کو اس کی ماں نے ساری بات سمجھا دی تھی اب نذیر موچی نے اس کے شکار کی نشاندہی کرنی تھی۔

زہراں بائی نے جب پہلی نظر میں اپنے شکار کو دیکھا تو اسے حنیف خاں پر رحم بھی آیا تھا کہ اب تک سنبھال سنبھال کر رکھی اُس کی جوانی یوں کوڑیوں کے مول بکنے جا رہی تھی۔

لیکن ——

رحم کرنا اس کے پیشے کی توہین کے مترادف تھا۔

اُس نے اپنے کام کی قیمت وصول کر لی تھی اور اب اُسے ہر صورت یہ "خوشگوار فریضہ" انجام دینا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ فضل شاہ اور ریاست شاہ کی مقامی سیاست پر کتنی مضبوط گرفت ہے اور جب بھی ان پر کوئی بُرا وقت آتا تھا تو یہی لوگ ان کی مدد کو آتے تھے۔

مقامی تھانے کچہری سے نمٹنا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ تو شاہ صاحب کا خصوصی کرم تھا کہ اس کا کوٹھا ابھی تک پولیس والوں کی دست بُرد سے محفوظ تھا اور بازار کی دوسری طوائفوں کے برعکس وہ تھانے میں صرف ماہانہ پہنچا کر ہی اپنا اُلو سیدھا کر رہی تھی ورنہ تو ہر دوسرے تیسرے روز تھانیداروں کی طرف سے کوئی نہ کوئی فرمائش ہوتی رہتی تھی اور اس کمبخت تھانے میں کوئی ایک تھانیدار تو تھا نہیں یہاں تو موئے پانچ چھ چھوٹے بڑے تھانیدار تھے اور ایک سے ایک بڑھ کر تماش بین جن کی فرمائش شیطان کی آنت کی طرح بڑھتی ہی چلی جاتی تھیں۔

عنایتی کے لیے یوں بھی اب یہ کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا۔ گزشتہ دو سال میں اس نے قریباً آٹھ مرتبہ زہرا بائی کی "نتھ" کی رسم اُدا کر لی تھی اور اس کے ذریعے اِتنے پیسے کما چکی تھی کہ اسی سے تین مکان یکے بعد دیگرے خریدے تھے اور ان کا کرایہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔

گرفت

مُجرہ ختم ہو گیا تھا۔

رات ایک پہر ڈھل رہی تھی جب زہراں بائی نے نذیر موچی کو آنکھ سے اشارہ کیا جس کا مطلب وہ بخوبی سمجھتا تھا۔ زہراں بائی نے اسے سگنل دے دیا تھا کہ شکار قابو آ چکا ہے اور اب وہ کسی بھی لمحے اس مُرغے کو ذبح کر سکتی ہے۔

سازندے بڑی ہوشیاری سے ایک ایک کر کے بسرک گئے تھے۔ اب وہاں زہراں بائی، فضل شاہ، نذیرا اور حنیف خاں ہی رہ گئے تھے۔ زہراں بائی نے اس دوران حنیف خان کو اس اس انداز سے اپنا آپ دکھایا تھا کہ اس کی رال بے ساختہ ٹپکنے لگی تھی۔

"نذیرے — کچھ پانی دھانی کا بندوبست کر حنیف خان ہمارا مہمان ہے۔ مہمان نوازی میں کوئی کسر باقی نہ رہ جائے۔"

فضل شاہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جو حکم شاہ جی" —

نذیر موچی اتنا کہہ کر اُٹھا اور اس الماری کی طرف چل دیا جس میں انگور کی بیٹی بند تھی اور اس کے استعمال کا وقت یہی تھا۔

اپنی جگہ سے اُٹھنے سے پہلے اس نے زہراں بائی کو آنکھ کا اشارہ کر دیا تھا۔ جو اب حنیف سے اس طرح چمٹ کر بیٹھ گئی تھی کہ حنیف خاں کو ہوش خرد سے بیگانہ کر دیا تھا۔ نذیر موچی نے شراب کے گلاس خود تیار کیے اور حنیف خان کا گلاس

زہراں بائی کو تھما دیا جس نے کمال ہوشیاری سے حنیف خان کے "ناں ناں" کرنے کے باوجود گلاس اُس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

اُس کے درجنوں مرتبہ اپنے باپ کے ساتھ سرحد عبور کی تھی۔ سانسیوں کے ساتھ وہ لوگ سمگلنگ کا دھندہ کرتے تھے جن کے ہر گھر میں غیر قانونی شراب تیار کی جاتی تھی۔

لیکن —

کیا مجال جو آج تک اس نے اسے چھُو کر بھی دیکھا ہو۔ یہاں تو معاملہ ہی مختلف ہو گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے زہراں بائی نے پورا پیگ اُس کے حلق میں اتار دیا جس نے رہی سہی کسر پوری کر کے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

حنیف خان کو اپنے وجود میں خون کی جگہ سرور و انبساط کی لہریں دوڑتی دکھائی دینے لگی تھیں۔

"مجھے تو نیند آ رہی ہے — مَیں چلوں"۔

یہ کہتے ہوئے منصوبے کے مطابق فضل شاہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

فاتحانہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر گھنی مونچھوں کے نیچے جم گئی تھی۔

نذیر موچی نے اُس کے لیے واقعی بڑا معرکہ مار لیا تھا۔ جو اُس کے تعاقب میں اب خود بھی باہر آ گیا تھا۔

"واہ نذیرے کمال کر دیا تُو نے — خوش کر دیا ہے مجھے بلے بلے —"

فضل شاہ نے اُس کی کمر پہ ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی آپ کے نمک خوار ہیں۔ آپ کے حکم پر آسمان سے تارے توڑ کر لا سکتے ہیں۔ یہ تو کوئی کام ہی نہیں تھا"۔

نذیرے نے اصیل مُرغ کی طرح گردن پھُلائی۔

دونوں آرام کرنے کے لیے حویلی کے دوسرے حصّے میں چلے گئے۔ اب اِس کمرے میں حنیف خان، زہراں بائی اور شیطان باقی رہ گئے تھے۔

شراب و شباب کے نشے میں مدہوش حنیف خان کو اُس نے سہارا دے کر آرام دہ پلنگ پر لٹایا اور خود اُس کے پہلو میں لیٹ گئی۔

اس کے بعد کیا ہوا؟

حنیف خاں کو کچھ سمجھ نہ آسکی۔ وہ خود دُنیا مافیہا سے بے خبر عیش و نشاط کے ایسے ایسے جہانوں کی سیر پر نکل گیا تھا جن کا تصوّر اُس نے جیتے جی کبھی نہیں کیا تھا۔ زہراں بائی نے فضل شاہ کا حقِ نمک ضرورت سے زیادہ ہی ادا کر دیا تھا۔ اُسے بھی مدّتوں بعد حنیف خاں جیسا جواں مرد میسّر آیا تھا۔

وہ پیشہ ور طوائف ہونے کے علاوہ ایک عورت بھی تھی اور آج اُس پر یہی عورت ضرورت سے زیادہ غالب آگئی تھی۔ اُس نے جی بھر کے تسکین حاصل کی اور دیر گئے تک حنیف خاں کو سرور و انبساط کے ہنگھوڑے میں ڈالے رکھا۔



حنیف خاں کو ہوش آیا تو اُسے احساس ہوا کہ رات عالمِ مدہوشی میں اُس نے وہ کچھ کر دیا ہے جس سے اُس کے باپ نے ساری زندگی اُسے روکے رکھا۔

نتھو خاں نے حنیفے کو کنواری لڑکیوں کی طرح اپنا بدن سنبھال کر رکھنے کی تلقین کی تھی۔ اس نے زندگی میں کبھی تصور نہیں کیا تھا کہ اُس کا بیٹا یوں ایک معمولی سی طوائف کے ہاتھوں اپنی عصمت لُٹا بیٹھے گا۔

حنیف خاں کو احساس تھا کہ جس گناہ کا ارتکاب اُس سے ہو گیا ہے اگر اس کی بھنک بھی اُس کے باپ کے کانوں تک پہنچ گئی تو وہ اُسے گولی مار کر خودکشی کر لے گا۔

لیکن ___

دوسری طرف اُسے اپنا بدن پھول کی طرح ہلکا پھلکا دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ خود کو ابھی تک فضا میں تیرتا محسوس کر رہا تھا۔

کمرے کے ایک کونے میں زہراں بائی صوفے پر ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اُسے اُٹھتے دیکھ کر وہ حنیف خاں کے نزدیک آکر بیٹھ گئی۔

"اب مجھے اکیلی نہ چھوڑنا ___ اگر مرد ہو تو آج کی رات کو ضرور یاد رکھنا۔"

اُس نے اِس انداز سے حنیف خاں کو کہا تھا کہ بیک وقت اس کی مردانگی اور محبت کو چیلنج کر دیا تھا۔

حنیف خاں نے گردن جھکا لی ___

زہراں بائی نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اس سے لپٹ گئی۔

"حنیفے شہر میں مجھے ملنے آؤ گے" ___

اُس نے اچانک ہی اُس پر اپنا بوجھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں ___ آؤں گا۔"

حنیف خاں کے پاس سوائے ہاں کے اور کوئی چارہ باقی نہیں بچا تھا شیطان نے پہلی ہی رات اس کے اندر بڑا مضبوط مورچہ جما لیا تھا۔

"مردوں والا وعدہ کرنا۔"

زہراں بائی نے اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"تم بار بار میری مردانگی کو کیوں آزما رہی ہو ___ کہہ دیا ناں ___ کہ ضرور آؤں گا۔"

حنیف خاں نے چڑ کر کہا۔

"حنیفے تم تو بُرا مان گئے ___ دراصل ہم بُرے لوگ ہیں حنیفے لیکن ہمارے سینے میں بھی دل ہوتا ہے ___ حنیف خان۔ میں گانے والی طوائف ہوں ___ پیشہ ور عورت نہیں ___ مولا حسین کی قسم ہے ...."

اس کی آواز بھرا گئی اور اس نے باقاعدہ ٹسوے بہانے شروع کر دیئے۔

حنیف خاں کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس کا دل مُٹھی میں لے کر زور سے بھینچ دیا ہو۔ روتی ہوئی طوائف کے آنسو اُس کی مردانگی کو پگھلانے کے لیے کافی تھے۔

"زہراں خدا کے لیے چُپ ہو جاؤ میری زبان پر اعتبار کرو ___ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمھیں دھوکہ نہیں دوں گا ___ میں تمھارے پاس آؤں گا ___"

اُسے اب طوائف سے محبت سی ہونے لگی تھی۔

"حنیف خاں ___ یہ بات تم رہے اور میرے درمیان رہنی چاہیئے ___ تم نذیر موچی کو اعتماد میں لے لینا۔ اُس کا آنا جانا ہمارے ہاں رہتا ہے ___ لیکن یاد رکھنا حنیف خاں اگر شاہ جی کو علم ہُوا کہ مَیں نے تمھارے ساتھ . . . . تو وہ مجھے گولی مار دیں گے"___

وہ پھر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔

"تمھارے شاہ جی کی ایسی تیسی"___

اُس نے فضل شاہ کو گالی دیتے ہوئے کہا ___"اُس کی جرأت نہیں کہ تمھاری طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھ سکے ___ زہراں بے فکر رہنا ___ میں فضل شاہ کی . . ."

"نہیں نہیں حنیفے خدا کے لیے ایسا کبھی سوچنا بھی نہیں___"

اُس نے حنیف خاں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔"حنیفے اگر تم میرا ساتھ دو تو مجھے کسی بات کا ڈر نہیں۔ مَیں کسی سے نہیں ڈرتی لیکن میری التجا ہے کہ فضل شاہ سے بنائے رکھنا ___ اُس کے بہت لمبے ہاتھ ہیں۔ وہ ممکن ہے طاقت میں تمھارا مقابلہ نہ کر سکے لیکن سیاست میں تم اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتے ___ حنیفے اگر تم نے فضل شاہ سے دوستی قائم کر لی تو ساری زندگی سُکھ سے گزرے گی میری بھی اور تمھاری بھی ___ حنیفے میرے ساتھ وعدہ کرو کہ تم فضل شاہ سے کبھی نہیں بگاڑو گے"___

اُس نے بے وقوف نوجوان سے دوسرا وعدہ بھی لے لیا۔

زہراں بھی عنایت بائی کی بیٹی تھی ___

سات پُشتوں سے وہ لوگ یہی پیشہ کرتے آرہے تھے۔

مرد کو آنکھوں میں تولنا اور اُس کا صحیح صحیح مُول لگانا ہی تو اُس نے سیکھا تھا۔

اُس نے اندازہ کر لیا تھا کہ حنیف خاں کی شکل میں اُسے مستقبل کا ایک مضبوط سہارا

میسر آسکتا ہے۔

ایسے بے وقوف اور مالدار بہادروں کی اس سے زیادہ ضرورت اور کسے ہو سکتی تھی ___

اگر یہ شخص فضل شاہ کی کمزوری بن جاتا تو بھی زہراں بائی اُسے اپنی کمزوری بنا کر فضل شاہ کے خلاف استعمال کر سکتی تھی۔

اُس نے بجائے فضل شاہ کے ہاتھوں میں کھیلنے کے اُسے خود اپنے ہاتھوں کھلانے کا منصوبہ ابھی سے بنا لیا تھا۔

اُس کے پاس حنیف خاں کو دینے کے لیے بہت کچھ تھا ___ اس نے پہلی ہی رات حنیف خان کو جکڑ لیا تھا اور مستقبل میں اُس جکڑ کو مستقل کر کے وہ فضل شاہ کی کمزوری بھی بن سکتی تھی ___ اگر ایسا ہو جاتا تو یہ اُس کے لیے بہت بڑی کامیابی ہوتی۔

اُس نے پندرہ بیس منٹ کی گفتگو ہی میں حنیف خان کو باندھ کر رکھ دیا تھا اور اب اُس کے اندر موجود تربیت یافتہ طوائف نے اُسے یقین دلا دیا تھا کہ یہ پنچھی اُس کے جال میں مکمل پھنس چکا ہے۔

حُسن کے مضبوط پنجرے میں باندھ کر وہ اُسے جب چاہتی اپنی مرضی سے چُوری کھلا کر اپنی مرضی کی بولی بولنے پر مجبور کر سکتی تھی۔



اچانک ہی دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز نے دونوں کو چونکا دیا۔

زہراں نے خود اُٹھ کر دروازہ کھولا تھا۔ سامنے نذیر موچی دانت نکالے کھڑا تھا۔

"بھئی کیا راز و نیاز کی باتیں چل رہی تھیں ___ کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے"___

اُس نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"نذیرے اپنے مہمان سے پوچھ لو ___ ہم نے اس کی خدمت میں کوئی کمی نہیں کی"

اس نے طے شدہ منصوبے کے مطابق کہا۔

"کیوں حنیف خاں ــــ ٹھیک ہے ناں ــــ"

نذیر موچی نے بے شرمی سے آنکھ دبائی۔

"اوہ ٹھیک ہے یار ــــ بڑا مزہ آیا بھئی ــــ"

حنیف خاں نے چارپائی سے کھڑے ہو کر زوردار انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔

"تو یہ بات ہے ــــ اچھا یار حنیفے ذرا جلدی سے نہا دھو کر تیار ہو جاؤ پھر دوسری حویلی میں نتھو خاں کے سامنے آنا ــــ تاکہ اُسے کوئی شک نہ گزرے۔ مَیں نے اُسے کہہ دیا ہے کہ تم اِدھر شاہ صاحب کے ساتھ رات دیر گئے تک باتیں کرتے رہے ہو ــــ اور سو رہے ہو۔"

نذیرے نے دوبارہ بے حیائی سے عادت کے مطابق آنکھ دبائی پھر وہ زہراں بائی سے مخاطب ہوا۔

"جلدی جلدی ناشتہ کر لو ــــ گاڑی تیار رہے۔ سامان تم لوگوں کا مَیں نے گاڑی میں رکھوا دیا ہے۔ اندھیرے مُنہ ہی نکل جاؤ ــــ اور ہاں خبردار اگر کبھی بھولے سے بھی اس رات کا ذکر تمھاری زبان پر آیا۔ میری بات سمجھ رہی ہو ناں ــــ"

اُس نے زہراں کی طرف دیکھا۔

"نذیرے تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ــــ مجھے کیا بے وقوف سمجھتا ہے اور جب بھی حنیف خاں کا دل چاہے اسے ہمارے ہاں لے آنا ــــ مجھے اس کی خدمت کر کے بہت خوشی ہو گی۔ یوں بھی شہر یہاں سے زیادہ محفوظ ہے ــــ"

زہراں نے اُس کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمھارے رات رات میں کچھ زیادہ ہی پر پُرزے نہیں نکل آئے ــــ اچھا ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ اب تم تیاری کرو ــــ"

یہ کہتے ہوئے وہ باہر نکل گیا۔

"مجھے اس کا اندازِ گفتگو پسند نہیں آیا۔"

اس کے باہر نکلتے ہی زہراں بائی نے کہا۔

"اِسی لیے تو کہہ رہی ہوں حنیف خاں کہ فضل شاہ کو اپنی مُٹھی میں لے لو ــــ اور اس کمینے کو نکال باہر کرو ــــ اس نے تو جیسے شاہ جی پر کوئی جادو کر دیا ہے۔ بہت سر چڑھا رکھا ہے اسے شاہ جی نے ــــ دونوں ہاتھوں سے انھیں لوٹ رہا ہے ــــ حنیف خاں اگر تم ذرا سی دانشمندی کرو تو سب ٹھیک ہو جائے گا" ــــ

زہراں بائی نے اس کے نزدیک آتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے زہراں تم جیسا کہو گی ویسا ہی ہو گا۔ بے فکر رہنا مَیں شہر میں ضرور ملنے آؤں گا تم سے ــــ اگر اس نے کوئی نخرہ وغیرہ کیا تو اکیلا ہی آ جاؤں گا۔ مجھے کوئی شہر والے کھا تو نہیں جائیں گے" ــــ

اُس نے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

"ناں حنیف خاں خدا کے لیے یہ غضب نہ کرنا ــــ ابھی وقت نہیں آیا۔ ابھی تمھیں بہت محتاط رہنا ہو گا۔ اگر تم اکیلے آئے تو میری ماں کو فوراً شک گزرے گا اور وہ مجھے ایسا غائب کروائے گی کہ پھر میرا نام و نشان بھی نہیں ملے گا۔ تم ابھی اُس مرزی کے ساتھ ہی آنا ــــ آہستہ آہستہ مَیں اپنی ماں کا اعتماد حاصل کر لوں گی۔"

زہراں بائی نے مستقبل کے خدشات کو ذہن میں ابھی سے رکھتے ہوئے کہا۔

"تمھاری مرضی زہراں بائی ــــ لیکن اتنی پابندیاں لگانا ٹھیک نہیں" ــــ

اُس نے مُسکراتے ہوئے کہہ دیا۔

"نہیں حنیف خاں ــــ کس کی مجال ہے جو تم جیسے جوان مرد پر پابندی لگا سکے ــــ مَیں تو احتیاط کا دامن تھامنے کی بات کر رہی ہوں ــــ اور مَیں کوئی ایسی گری پڑی طوائف نہیں ہوں۔ وقت آنے پر تمھارے لیے جان بھی دے سکتی ہوں۔"

اس نے سنبھل کر کہا۔

"اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کرے گا زہراں کہ کون کس کے لیے کیا کر

سکتا ہے“ ___

حنیف خان نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں اُس کے لیے محبت کا دریا موجزن تھا۔ زہراں نے اداکاری کے سارے گُر آج ہی آزمانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

”خدا کے لیے ابھی سے مُنہ سے ایسی باتیں نہ نکالو“۔

اُس نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا اور حنیف خاں سے لپٹ گئی۔

○

زہراں بائی شہر واپس لوٹ گئی ___

حنیف خان اپنے باپ کے ساتھ اپنے گاؤں چلا آیا۔ اُس نے اپنے باپ کو رات کے واقعات کی ہَوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔

لیکن ___

اپنے گھر آنے کے بعد حنیف خان کو احساس ہوا کہ وہ تو اپنے جسم کے ساتھ یہاں آیا ہے۔ اپنا دل تو وہ ریاست شاہ کی حویلی میں زہراں بائی کے پاس ہی گروی رکھ آیا تھا۔ اُسے زندگی میں پہلی مرتبہ کچھ چھن جانے کا احساس ہوا۔ یہ احساس اتنا جان لیوا تھا کہ حنیف خاں کی ساری مردانگی اُس کے سامنے دھری کی دھری رہ گئی۔

اس کا دل چاہتا تھا کہ ابھی اُڑ کر زہراں بائی کے پاس پہنچ جائے اور اپنی آتشِ شوق کو بجھائے

لیکن ___

یہاں معاملات کی نوعیت ہی کچھ اور تھی۔

ریاست شاہ نے ایک خطیر رقم نتھو خاں کو بطور ایڈوانس دے کر اُسے اپنا پابند کر لیا تھا اور نتھو خاں نے اپنی برادری کے لوگوں کو سمجھا دیا تھا کہ اس مرتبہ اُس نے الیکشن میں ریاست شاہ کا ساتھ دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ اس کی برادری میں نتھو خان کو پیروں والی حیثیت حاصل تھی یہاں کس کی مجال تھی کہ اس کے حکم کی

سرتابی کرتا۔

نتھو خاں اگلے روز مزید حیران رہ گیا جب مقامی تھانیدار اُسے گھوڑی پر سوار اپنی حویلی کی طرف آتا دکھائی دیا تو اُس کے دل و دماغ میں نئے نئے خدشات سر اُٹھانے لگے۔ پہلے تو اس نے یہی سمجھا کہ کوئی نئی مصیبت آ گئی اور حنیف خان کو اشارے سے وہاں سے کھسک جانے کے لیے کہہ دیا۔ یہ اس کا اصول تھا کہ دونوں باپ بیٹے کبھی اکٹھے جیل نہیں جاتے تھے۔

خلافِ معمول تھانیدار اکیلا ہی گھوڑی پر سوار اس طرف آ رہا تھا اس کے لیے ایک طرح سے دوستی کا اشارہ بھی تھا۔

نتھو خاں جانتا تھا کہ تھانیدار کی اس گاؤں میں اس طرح آمد کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اب اُسے اپنا دشمن نہیں سمجھتا بصورتِ دیگر وہ اس طرف اکیلا نہ آتا۔

”سناؤ تھانیدار جی ___ کس طرح اِدھر بھول پڑے“ ___

نتھو خاں نے اُس کی شکل پر نظر پڑتے ہی کہا۔

”نتھو خاں ___ اب ہمارے اور تیرے درمیان کوئی دوسری بات نہیں رہ گئی۔ شاہ صاحب کا خاص حکم ہے کہ تیرا خیال رکھا جائے۔ ہم تیرے تابعدار ہیں نتھو خاں۔ آج سے پہلے والی باتیں بھول جانا ___ اور ہاں اب کوئی واردات ہمارے علم میں لائے بغیر نہ کرنا ___ سمجھ گئے ناں ___ تاکہ ہم مناسب منصوبہ بندی پہلے سے کر لیا کریں“۔

تھانیدار نے ڈیرے پر بچھی چارپائی پر بے تکلفی سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

نتھو خاں سمجھ گیا کہ فضل شاہ نے تھانیدار کو پکا کر دیا ہے۔ اُسے جلد ہی اندازہ ہونے لگا تھا کہ فضل شاہ کی سرکار دربار میں بہت پہنچ ہے ورنہ یہی تھانیدار جو چند روز پہلے تک اُس کے خون کا پیاسا تھا اس طرح اُس کی خدمت میں سلام کرنے نہ آتا۔

اُس نے تھانیدار کے لیے دودھ منگوا لیا تھا اور اب دونوں راز و نیاز کی باتوں میں مشغول تھے۔

تھانیدار اُس سے اِس طرح کھل رہا تھا جیسے جرائم کی دُنیا میں اُس کا کوئی دیرینہ

ساتھی رہا ہو ۔۔۔ اُس نے تھوڑی دیر بعد ہی مطلب کی بات پر آتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں نتھو خاں سے کہنا شروع کیا۔

نتھو خاں ۔۔۔ قدرت نے تجھے بڑا سنہری موقعہ دیا ہے ۔۔۔ شاہ صاحب کی دوستی سے جتنا جی چاہے فائدہ اٹھالے ۔۔۔ بس ایک بات کا خیال رکھنا ہمارا حصّہ ایمانداری سے دیتا رہ اور ہاں شاہ صاحب سے کہہ دینا کہ میرا تبادلہ یہاں سے نہ ہونے پائے۔ جب تک مَیں اِس تھانے کا انچارج ہوں تو اس تھانے کی حدود میں آنے والے تمام دیہاتوں کا انچارج رہے گا ۔۔۔ نتھو خاں میری بات مان لے ۔۔۔ لعنت بھیج اب سرحد پار کرنے پر، اُس طرف اب بہت سختی ہونے لگی ہے۔ اِدھر ہی سے مال اکٹھا کر لیا کر ۔۔۔ اور اکٹھا بھی کیا کرنا بس اپنا حصّہ وصول کر لیا کر ۔۔۔ ارے تجھ سے کون چُھپا ہے اِس علاقے میں رسّہ گیر تو رسّہ گیری میں اپنا حصّہ لیا کر دھڑلے سے اور ہمارا ہمیں پہنچا دیا کر ۔۔۔ اللہ اللہ خیر صلا"

نتھو کبھی حیرانگی سے اُس کا منہ دیکھنے لگتا اور کبھی تشویش میں مبتلا ہو جاتا اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ قانون کا کوئی رکھوالا اس طرح محض چند ٹکوں کے عوض اپنا ضمیر بھی گروی رکھ دیا کرتا ہے۔

لیکن ۔۔۔

یہ اُس کی خام خیالی تھی ۔۔۔

اُس نے دراصل آج تک مجرم ہی دیکھے تھے ۔۔۔ اُس کا واسطہ اپنے جیسے لوگوں ہی سے رہا تھا جو جُرم کرتے تھے اور سزا پاتے تھے۔ اُن لوگوں سے خیر کی توقع عبث تھی۔

لیکن ۔۔۔

یہاں تو گنگا ہی اُلٹی بہہ رہی تھی ۔۔۔

یہاں تو قانون کے محافظ اُسے نئے نئے راستے سمجھا رہے تھے۔

"نتھو خاں ۔۔۔ بہتی گنگا میں نہا لے ۔۔۔"

اس کے دل نے کہا۔

ساری زندگی سرحدوں پر دھکّے کھانے اور ہر لمحے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے سے یہ بہت بہتر تھا کہ وہ پولیس کے تعاون سے اپنی بدمعاشی قائم کرلے۔ اِس طرح نہ ہینگ لگتی اور نہ پھٹکری اور رنگ بھی خوب چڑھتا۔

"چوہدری صاحب آپ بے فکر ہو جائیں۔ آپ کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ یہاں کے بعد پھر پولیس نوکری کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ اگر آپ کا تعاون رہا تو تین چار ماہ میں ساری زندگی کی روٹیاں اکٹھی کروا دوں گا" ۔۔۔

نتھو خاں نے بے تکلفی سے اُس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

جواب میں تھانیدار اس کے "زانوں" پر ہاتھ مار کر قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس لوٹ گیا۔ جانے سے پہلے اُس نے نتھو خاں سے بڑی رازداری سے کہا۔

"نتھو خاں ۔۔۔ شاہ صاحب کو بہرصورت کامیاب ہونا چاہیئے ۔۔۔ ایک بات یاد رکھنا سرکار دربار میں کسی کی عزت تب تک قائم رہتی ہے جب تک اس کا تعلق اس دربار سے بندھا رہے ۔۔۔ ورنہ تو یہ لوگ چھچھوڑی ہوئی ہڈی کی طرح اُسے پرے پھینک دیتے ہیں ۔۔۔ شاہ اگر ایم پی اے نہ بنا تو پھر ہمارا بھی "رام بولو" ہو جائے گا ۔۔۔ یہ پلوال والے سردار بھی سالے ایک نمبر کے بدمعاش ہیں ۔۔۔ بس سیاست میں فضل شاہ سے مار کھا جاتے ہیں ورنہ دولت تو اُن کے پاس بھی کم نہیں تُو تو جانتا ہی ہے۔ سرداروں کا آنا جانا سرحد کے دوسری طرف لگا رہتا ہے۔ آج تک اُن کا مال پکڑنے کی کسی نے ہمّت نہیں کی ۔۔۔"

"مَیں سمجھتا ہوں چوہدری صاحب ۔۔۔ مَیں جانتا ہوں سرکار کو ۔۔۔ آپ مطمئن ہو جائیں مَیں تو اس سردار کے بچے کی ضمانت ضبط کروا دوں گا ۔۔۔ اس نے مجھے سمجھا کیا ہے۔"

اُس نے تھانیدار کو یقین دہانی کروا دی۔

"چنگا بھئی رب راکھا"۔۔۔

تھانیدار نے کہا اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

دمِ رخصت اس کے لیے گھی اور دیگر اجناس نتھو خاں نے الگ سے باندھ دی تھیں۔

"خیر ہے ۔۔۔ شام کو منشی آکر لے جائے گا"

تھانیدار نے ان چیزوں پر ایک نگاہ غلط ڈالتے ہوئے کہا

"مہربانی چوہدری صاحب"۔۔۔

نتھو خاں نے ہاتھ باندھے ۔۔۔

تھانیدار نتھو خاں کا دماغ خراب کر کے چلا گیا۔ جس نے اُس کی روانگی کے کچھ دیر بعد ہی اِس بات کا فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ کوئی چھوٹا موٹا ہاتھ نہیں مارے گا بلکہ موقعہ محل کی مناسبت سے کوئی بڑا کام کرے گا

لیکن ۔۔۔

اس کے لیے ریاست شاہ کا الیکشن میں کامیاب ہونا ضروری تھا۔



بلوال میں یہ خبر بم کے دھماکے کی طرح پھٹی کہ ریاست شاہ نے نتھو خاں کو خرید لیا ہے اور اس الیکشن پر نتھو کی برادری کے قریباً ڈھائی تین سو ووٹ تو سیدھے ریاست شاہ کو جائیں گے جبکہ اپنے اثر ورسوخ سے وہ ارد گرد کے آٹھ دس دیہاتوں کے ووٹرز بھی کھینچ لے جائے گا کیونکہ اِن دیہاتوں کا ہر تیسرا گھر پولیس کا مستقل گاہک تھا۔ اِن لوگوں نے جرائم نہیں چھوڑنا تھا اور پولیس نے ان کو ۔۔۔!

سردار اِن لوگوں کو جیسی بھی گارنٹی دیتا لیکن یہ کبھی نتھو خاں کی بات نہیں ٹال سکتے تھے کیونکہ فضل شاہ اور ریاست شاہ کی مقامی تھانے پر مکمل گرفت تھی اور مقامی سیاست میں تھانے کا کردار ہی دراصل سب سے زیادہ اہم ہوتا تھا۔

دیہاتیوں کو اِس بات کا علم تھا کہ جس پولنگ سٹیشن سے تھانے دار کی مرضی کے

مخالف اُمیدوار کے زیادہ ووٹ نکل آئے اس کے نزدیکی دیہاتوں کی کم بختی آ جائے گی ۔۔۔

یوں بھی نتھو خاں کے اُن لوگوں پر بڑے احسانات تھے۔ اکثر چوری چکاری کے کیس وہ خود ہی سنبھال لیا کرتا تھا۔ ان علاقوں میں درجنوں ایسے گھر موجود تھے جن کی بیٹیوں کو نتھو خاں نے اپنے پیسے سے بیاہا تھا اور یہ لوگ اس کے احسانات کو یوں بھلا نہیں سکتے تھے ۔۔۔

سردار کے آباؤ اجداد سکھوں سے مسلمان ہوتے تھے۔

جائیداد اور دھن دولت سے اِس خاندان کو شاہ فیملی سے کچھ کم لگاؤ نہیں تھا۔ سردار کا پورا خاندان سمگلنگ کے دھندے میں ملوث تھا۔ سرحد کے اس طرف اگر اُن کے مسلمان رشتہ دار موجود تھے تو دوسری طرف اُن کے سکھ رشتہ دار ڈیرے ڈالے بیٹھے تھے۔

کبھی کبھی تو مقامی لوگ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے کہ اُن لوگوں نے شاید جائیدادیں بچانے اور دونوں حکومتوں کو بے وقوف بنانے کے لیے ہی اپنا دھرم بدلا تھا ورنہ ان کی عادتیں اپنے بزرگوں والی ہی تھیں۔

سرداروں کا شاہ فیملی سے پہلی مرتبہ متھا نہیں لگا تھا ۔۔۔

اب تک یہ لوگ یونین کونسل اور اسمبلی کے انتخابات پر اثر انداز ہوتے آئے تھے اور سردار نے اِس ضمن میں ہمیشہ اہم کردار ادا کیا تھا۔

لیکن ۔۔۔

اِس مرتبہ سردار رشید نے خود میدان میں اُترنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"یہ نتھو خاں کہاں سے ٹپک پڑا اس کا کیا واسطہ ہے اس سارے دھندے سے ۔۔۔ سالا ڈنگر چور کہاں سے مصیبت بن کر آ گیا"۔۔۔

سردار رشید نے جو اس وقت اپنے مقامی چمچوں کے ساتھ کاغذات جمع کروا کر واپس آیا تھا، کہا۔

سردار صاحب! یہ سارا گھڑاگ فضل شاہ نے پھیلایا ہے۔ مَیں نے آپ سے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ فضل شاہ کو چارہ ڈالیں ــــ بڑے شاہ کے مرنے کے بعد یقیناً وہ ریاست شاہ کے برابر اُڑنا چاہے گا ــــ سردار صاحب آخر وہ سوتیلے بھائی ہیں ــــ"

عالم داد نے کہا جو گزشتہ دس سال سے یہاں کا کونسلر منتخب ہوتا آرہا تھا اور ریاست شاہ کا ڈسا ہوا بھی تھا۔

"عالم داد ــــ بچوں والی باتیں نہیں کیا کرتے ــــ ہر کام کا وقت ہوتا ہے ــ تم جانتے ہو کہ ابھی یونین کونسل کا مرحلہ نہیں آیا ــــ فضل شاہ کو یقین ہے اور ایسا ہوگا بھی کہ ریاست شاہ ایم پی اے بننے کے بعد فضل شاہ کو یونین کونسل کا اپنی جگہ چیئرمین بنا دے گا۔ اس کا دماغ خراب ہوا ہے جو ہمارے ساتھ آن ملے ــ ہاں اگر مَیں الیکشن جیت گیا تب تو ممکن ہے کچھ ہو جائے ــــ ابھی نہیں ــــ ابھی تو وہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ ریاست شاہ ہار جائے گا ــــ عالم داد تم جس طرح بھی ممکن ہے نتھو خاں کو توڑ دو ــــ خواہ اس کی کچھ بھی قیمت اُدا کرنی پڑے ــــ کچھ بھی ــــ!"

سردار رشید نے اس کی بات کاٹتے ہوتے کہا ــــ

"ٹھیک ہے سردار صاحب ہم ادھر ہی ہلّہ مارتے ہیں ــــ یہاں کے پانچ چھ سو ووٹ فیصلہ کُن کردار اَدا کریں گے ــــ میرے ایک دو کام کے بندے ہیں وہاں ــــ کل انھیں بُلاتا ہوں اور کوئی راستہ نکالتے ہیں" ــــ

عالم داد نے سر ہلاتے ہوتے کہا ــــ

عالم داد بڑا کایاں آدمی تھا۔

پولیس کا سابقہ حوالدار جسے کرپشن کے الزام میں ملازمت سے ہاتھ دھونے پڑے تھے آج دو مربع اراضی کا مالک اور مقامی کونسلر بن چکا تھا ــــ سیاسی جوڑ توڑ اور غیر قانونی ہتھکنڈوں میں نزدیک دُور کے دیہات میں کوئی اس کا ثانی نہیں تھا۔

عالم داد کو اُمید تھی کہ اگر سردار کامیاب ہو گیا تو اس کے وارے نیارے ہو جائیں گے کیونکہ سردار رشید کی آڑ میں وہ ہر شکار کھیل سکتا تھا۔

عالم داد سے نتھو خاں کا کچھ پوشیدہ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس دُنیا میں نتھو کی اگر کوئی کمزوری ہے تو وہ اس کا بیٹا حنیف خاں ہے۔ اگر کسی طرح وہ لوگ حنیف کو قابو کر لیتے تو ان کے لیے بہت کچھ جو بظاہر ناممکن نظر آرہا تھا ممکن ہو جاتا۔

سردار کے ڈیرے سے اُٹھ کر وہ سیدھا اپنی حویلی پہنچا اور اب گھوڑی پر بیٹھ کر ریاست شاہ کے ملحقہ گاؤں سنگھ پورہ جا رہا تھا جہاں سے اُسے معلومات اکٹھی کرنی تھیں کہ آخر ریاست شاہ نے نتھو خاں کو قابو کس طرح کیا ہے کیونکہ نتھو خاں ذرا الگ قسم کا بدمعاش تھا۔ اُس کا گھٹیا قسم کی سیاست سے کبھی دُور کا بھی واسطہ نہیں رہا تھا پھر وہ شاہ فیملی کے قابو کس طرح آگیا۔

سنگھ پورہ میں وہ اپنی شناخت خفیہ رکھ کر ہی جایا کرتا تھا۔ یہاں کا ایک بدمعاش جو پانڈی کا کام کرتا تھا۔ فضل شاہ کا خاص آدمی تھا۔

لیکن ــــ

عالم داد کے لیے ایسے خاص آدمی قابو کرنا مشکل کام بھی نہیں تھا ــــ

اُس نے گاؤں کے باہر ہی بنے شرفو کے ڈیرے کا رُخ کیا۔ شرفو ڈیرے ہی پر موجود تھا۔

عالم داد کو گھوڑی پر آتے دیکھ کر اس کی باچھیں کھل اُٹھیں۔

"آؤ ــ آؤ ــ حوالدار جی ــــ السلام علیکم۔ آج تو کیکڑی کے گھر نارائن آگئے ــ"

اُس نے حُقہ ایک طرف رکھ کر کھڑے ہوتے ہوتے عالم داد کا استقبال کیا۔

"وعلیکم السلام ــــ سُنا بھئی شرفو ــــ کیا حال ہے تیرا۔ مَیں نے سوچا تو اب کہاں آتے گا۔ مَیں ہی خیریت معلوم کرتا جاؤں" ــــ

علم داد نے گھوڑی سے اُتر کر اُس سے گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوتے کہا۔

ڈیرے پر اس وقت وہ اکیلا ہی موجود تھا۔ دو مزارعے اپنے کام میں مصروف تھے یوں بھی شرفو بڑا ہوشیار بدمعاش تھا اپنے گرد زیادہ بھیڑ جمع کرنے کی اسے عادت نہیں تھی۔ دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے جس کے بعد عالم داد مطلب کی بات پر آ گیا۔

"یہ کیا خبریں مل رہی ہیں کیا جادو ڈال دیا ہے فضل شاہ نے نتھو خاں پر۔

عالم داد نے کہا۔

کیا بات ہے حوالدار صاحب۔ ارادے نیک دکھائی نہیں دیتے ——

شرفو بھی اس کی رگ رگ کو پہچانتا تھا یہ الگ بات کہ عالم داد کے اس پر بے پناہ احسانات کی وجہ سے اُس نے عالم داد کا ہر حکم مانا تھا۔

"ہاں یار —— یہی سمجھ لو۔ تم تو جانتے ہو کہ سرداروں کے ایم پی اے بنے بغیر اپنی دال گلتی نظر نہیں آ رہی —— اگر تم ہمت کرو تو مجھے یونین کونسل کا چیئرمین بنا سکتے ہو —— پھر تو موج ہی موج ہو گی —— ہم تو یوں بھی تجھے معلوم ہے یاروں کے یار ہیں —— وردی جب پہنا ہوتی تھی تب بھی تیرے سارے کام کیے۔ اب بھی کریں گے" ——

عالم داد نے اس کے زانو پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"تو یہ بات ہے . . ."

شرفو نے گردن ہلائی۔

"مجھے علم ہے تم آج کل فضل شاہ کے بہت نزدیک ہو رہے ہو لیکن ہمارے تمھارے کچھ کام سانجھے بھی ہیں۔

شرفو —— اگر فضل شاہ کو کبھی اس کا شک بھی ہو گیا تو تم . . ."

"بے فکر رہیں حوالدار صاحب" ——

شرفو نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ عالم داد کیا کہنا چاہتا ہے اور یہ تھا بھی سچ ——

"شرفو —— مجھے کل تک علم ہونا چاہیے کہ نتھو خاں کو کن شرائط پر ریاست شاہ نے اپنے جال میں پھنسایا ہے —— تم یہ سمجھنا کہ یہ زندگی موت والا معاملہ ہے —— اگر ریاست شاہ ایم پی اے بن گیا تو اپنی چھٹی سمجھو۔ زمین کی آمدن پر نہ تم گزارہ کر سکتے ہو نہ ہی میں ——"

"حوالدار صاحب کل کیوں آج ہی کیوں نہیں —— میں آپ کو بتاتا ہوں —— میں اس روز محفل میں موجود تھا۔ یہ سارا کھیل حنیف خاں کے ذریعے کھیلا گیا ہے —— نذیر موچی نے حنیف خاں کو فضل شاہ کے حکم پر بڑا پکا ہاتھ ڈالا ہے۔ حوالدار صاحب اب تو یہ سمجھو کہ اگر نتھو خاں ریاست شاہ کو چھوڑ دے تو بھی حنیف خاں اُسے نہیں چھوڑے گا انھوں نے حنیف خاں کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے" ——

شرفو نے اُس کی طرف جھکتے ہوئے کہا ——

"وہ کیسے اوتے ؟" ——

عالم داد بے چین ہوا جاتا تھا۔

"شہر کی مشہور طوائف زہراں بائی کے ذریعے ——" شرفو نے بڑے رازدارانہ لہجے میں بات کی "ہاں حوالدار صاحب ہم نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ مجھے تو زہراں بائی کی آمد ہی مشکوک دکھائی دی تھی —— اور جب فضل شاہ نے حنیف خاں کے لیے الگ سے دوسری حویلی میں مجرے کا بندوبست کروایا تو میرا ماتھا تب ہی ٹھنکا تھا —— میں بھی نذیر موچی کے ساتھ دو تین مرتبہ عنایت بائی کے ڈیرے پر جا چکا ہوں —— آپ جانتے تو ہیں اُسے —— ہمارے ہاں سے بھی وہ ماچھن نکال کر لے گیا تھا —— میں نے ہی اُس کی مدد کی تھی —— یہاں میرے پاس تین چار روز پہلے وہ شراب کے نشے میں سب کچھ بتا گیا ہے —— حوالدار صاحب فضل شاہ نے بڑا پکا ہاتھ ڈالا ہے —— زہراں بائی کے ذریعے —— زہراں بائی نے حنیف خاں کو اپنے جال میں پھانس لیا ہے —— اب اُس کے بچ نکلنے کا سوال

ہی پیدا نہیں ہوتا ــــ "[1]

"اچھا ــــ تو یہ بات ہے ــــ"

عالم داد کو سب کچھ سمجھ آ رہا تھا۔

"ہاں جی ــــ یہی بات ہے ــــ"

شرفو نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"ٹھیک ہے تم یہی سمجھنا ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔"

عالم داد نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"مَیں ہر طرح حاضر ہوں حوالدار صاحب ــــ میرے لیے آپ پہلے ہیں باقی سب کچھ بعد میں ــــ اور ہاں ــــ چاند کی ڈھلتی تاریخیں شروع ہونے والی ہیں ــــ اگر آپ کا حکم ہو تو آپ کی زمینوں سے ایک دو چکر پار کے لگوا دوں ــــ"

شرفو نے موقعہ غنیمت جانا ــــ

"شرفو ــــ ہم تو یاروں کے یار ہیں ــــ جب تمھارا جی چاہے۔ بس ولکٹ کا حِصّہ ذرا الگ سے نکال لینا ــــ تم تو جانتے ہی ہو اُن لوگوں کو قابو کرنا ذرا مشکل ہوتا ہے ــــ"

عالم داد نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"بے فکر رہیں حوالدار صاحب ــــ اگر پہلے کبھی شکایت کا موقعہ نہیں ملا تو اب بھی نہیں ملے گا۔

آپ تو جانتے ہیں کہ ہم آپ کے حُکم کے غلام ہیں۔

شرفو نے بے شرمی سے دانت نکالے۔

عالم داد نے واپسی کا سفر بڑی احتیاط سے طے کیا تھا۔

اُس نے جان بوجھ کر ایسے راستے اپنائے تھے جن سے گزرتے ہوئے کسی شناسا چہرے سے اس کی ملاقات نہ ہو سکے کیونکہ وہ ایک مشہور آدمی تھا اور اِس بات

کا بھی اُسے علم تھا کہ اگر فضل شاہ کو اُس کی یہاں آمد کا علم ہو گیا تو ضرور وہ اُس کا نوٹس لے گا اور عین ممکن ہے کہ شرفو اُن کی نظر میں آ جائے جبکہ وہ شرفو کو کسی قیمت پر ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتا تھا ابھی اُس نے شرفو سے بہت کام لینے تھے۔

اپنے گاؤں کی طرف جاتے ہوئے اُس نے دل ہی دل میں ایک منصوبہ طے کر لیا تھا۔ اِس منصوبے پر عمل کرنے سے وہ کم از کم فضل شاہ اور حنیف خاں کے درمیان کچھ تفریق پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔

اور ــــ

یہی اُس کا منشا تھا۔

نئی چال

اے ایس آئی موج دین کی عنایت بائی کے یہاں آمد کسی دھماکے سے کم نہیں تھی ۔ جب نوکر نے بتایا کہ چھوٹے تھانیدار صاحب آئے ہیں پہلے تو عنایت بائی کے پاؤں تلے زمین ہی سرک گئی ——

" یا مولا خیر ——"

اُس کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا ۔

" اکیلا آیا ہے یا سپاہی بھی ساتھ ہیں"——

اُس نے نوکر سے سرگوشی کے انداز میں پُوچھا ۔

" بی بی بالکل اکیلا ہے اور سول وردی میں —— وہ تو مَیں نے پہچان لیا ورنہ اُس کو شاید کوئی پہچان ہی نہ سکتا ہو"——

نوکر نے اپنی دانست میں اُس کی تسلی کر دائی ۔

لیکن ——

عنایت بائی پھر بھی خاصی گھبرائی ہوئی اُس کمرے میں داخل ہوئی تھی جہاں اُس کی آمد سے پہلے ہی نوکر نے موج دین کے سامنے بوتل اور پھلوں والی ٹوکری رکھ دی تھی اور اب اُس کے لیے گولڈ لیف سگریٹ کی ڈبی لینے جا رہا تھا ۔

عنایت بائی کو ایک ہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اُس نے اگلے ہی روز جب بازار کے پولیس ٹاؤٹ سمندر خاں کو زیادہ بھتہ دینے سے انکار کیا تھا تو اُس نے کہا تھا

" بائی تمھاری مرضی ہے بھلے یہ پانچ سو روپے بھی نہ دو لیکن یاد رکھنا پولیس سے دشمنی لے کر تم کوٹھا نہیں سجا سکتیں خواہ تمھاری کتنی ہی پہنچ کیوں نہ ہو" ——

" کہیں اس موٹے تھانیدار کو سمندر خاں نے تو نہیں بھڑکا دیا"——

اُس کو رہ رہ کر یہی ایک خیال ستا رہا تھا ۔

"سلام چوہدری صاحب"——

اُس نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے موج دین کو فرشی سلام کیا ۔

" کیسی ہو عنایت بائی ——"

موج دین نے سیب پر دانت گاڑتے ہوئے کہا ۔

" مولا کا شکر ہے حضور —— آپ کے ہوتے ہوئے بھلا ہمیں کوئی شکایت ہو سکتی ہے"——

عنایت نے خاص طوائفانہ انداز سے جواب دیا ۔

" بھئی اب تو تمھاری بڑی بڑی فرمائشیں آنے لگی ہیں ۔ اب تو ہمیں بھی تم سے ڈر لگنے لگا ہے —— خدا جانے تمھاری لڑکی نے کیا جادو چلا رکھا ہے"——

موج دین نے اُس کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی ۔

" حضور باندی ہے آپ کی"——

عنایت بائی کی باچھیں کھلیں اور اُس کے تنے ہوئے اعصاب قدرے ڈھیلے پڑ گئے ۔

" عنایت بائی تم جانتی ہو مَیں ذرا وکھری ٹائپ کا بندہ ہوں مَیں یہ عورتوں والے دھندے میں نہیں پڑتا —— لیکن اپنے ایک سجن کی فرمائش پر تمھارے پاس آنے پر مجبور ہو گیا ہوں ۔

تم جانتی ہو بلوال والے سرداروں کو ——"

موج دین نے اب سٹیم کیے ہوتے مُرغے کی ٹانگ پر دانت جمائے تھے ——!

" کیسی بات کرتے ہیں سرکار —— سردار صاحب کو کون نہیں جانتا ۔ ابھی

چند روز پہلے ہی ہم اُن کے علاقے میں مُجرہ کر کے آئے ہیں"
عنایت بائی نے سوچے سمجھے بغیر جواب دیا۔

"بس اپنی خوش قسمتی جانو کہ سرداروں کو تمھاری بیٹی کا گانا پسند آ گیا ہے۔ اور انھوں نے اگلے ہفتے تمھاری بیٹی کا مُجرہ رکھ لیا ہے ——— سردار صاحب کے بیٹے کی منگنی ہے ——— تمھارا منہ موتیوں سے بھر دیں گے"———

موج دین نے کہا۔

"لیکن سرکار ———"

"لیکن ویکن کچھ نہیں ——— گھر آئی مایا کو ٹھکرایا نہیں جاتا۔ یہ لو پکڑو ایڈوانس"۔
یہ کہتے ہوئے موج دین نے اپنی واسکٹ کی جیب سے نوٹوں کا بنڈل نکال کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔

عنایت بائی نے آنکھوں آنکھوں میں جانچ لیا تھا کہ یہ کم از کم بیس ہزار روپے ہیں۔ اپنی آئندہ زندگی میں وہ اتنے بڑے ایڈوانس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

"جن لوگوں نے ایڈوانس یہ دیا ہے اُن کی حیثیت کا اندازہ کر لینا ——— سرکار دربار میں اُن کی بہت چلتی ہے ——— اگر تمھاری بیٹی نے سردار صاحب کو خوش کر دیا تو یاد رکھنا کہ اس شہر میں کوئی تمھاری طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ عنایت بائی تیرے تو وارے نیارے ہو گئے"———

موج دین نے اُس کی طرف دیکھ کر بے ہودہ سا اشارہ کیا۔

"عنایت بائی کی رال ٹپک پڑی تھی ———

اُس کے ذہن میں موجود تمام خدشات پر یہ نوٹ غالب آ گئے تھے۔ جنھوں نے "سائی" (ایڈوانس) اتنی زیادہ بھیجی تھی اور وہ بھی مقامی تھانیدار کے ہاتھوں، وہ تو اُسے نہال کر سکتے تھے۔

"بس چودھری صاحب ذرا دل کو دھڑکا سا لگا ہے کہیں ریاست شاہ ناراض نہ ہو جائے آپ کو تو علم ہے کہ اُن کی سیاسی دشمنی ہے اور ہمارے ریاست شاہ کے

خاندان میں آنا جانا لگا رہتا ہے کہیں ہم غریب دو بڑوں کی لڑائی میں ...."
عنایت بائی نے کہنا چاہا لیکن موج دین نے اُس کی بات کاٹ دی۔

"عنایت بائی ——— اپنا دماغ صحیح رکھو ——— آج تک پولیس والے تم سے لیتے ہی آئے ہیں۔ آج سردار صاحب کی وجہ سے تمھیں پولیس کے ہاتھوں سے ۲۰ ہزار روپیہ موصول ہوا ہے ——— تمھاری مت ماری گئی ہے کیا ——— اپنے دماغ سے یہ وہم نکال دو ——— مجھے علم نہیں کہ ریاست شاہ اِس کا نوٹس لے گا یا نہیں ——— لیکن تم ایک بات ضرور یاد رکھنا کہ ایڈوانس پکڑنے کے بعد اگر تمھاری نیت بے ایمان ہو گئی تو زمین کے کسی کونے پر تمھیں پناہ نہیں مل سکے گی ——— میری بات سمجھ گئی ہو ناں ———"

موج دین نے پولیس والوں کے مخصوص انداز میں اُسے سمجھایا۔

"ہاں جی ہاں جی چوہدری صاحب مولا نہ کرے ایسی سوچ بھی کبھی میرے دماغ میں آئے میں تو یوں ہی ———"

"بس تم "یوں ہی" بھی ایسی بات دوبارہ نہ کرنا ——— یاد رکھنا اگلے ہفتے ——— سردار صاحب کی گاڑی تمھیں لینے آئے گی ——— اور ہاں ایک دو لڑکیاں بھی ساتھ لے جانا ——— سردار صاحب کو خوش ہونا چاہیے اس میں تمھاری اور ہماری بھی سلامتی ہے ——— سمجھ گئی ناں ———"

موج دین نے پھر آنکھ دبائی۔

"بالکل سمجھ گئی ہوں چوہدری صاحب ——— سردار صاحب کا دل خوش کر دوں گی ——— بس ذرا خیال رکھنا بچیاں ہیں۔ زیادتی نہیں ہونی چاہیے" ———

عنایت بائی نے طوائفوں کے مخصوص انداز میں کہا۔

"ارے چُپ کر ——— زیادتی نہیں ہونی چاہیے ——— وہ کیا عرس پر جا رہی ہیں ——— زیادتی کی کچھ لگتی ——— زیادہ نخرے نہ دکھا ——— اور ہاں آج شام کو بڑے چوہدری صاحب اور میرے لیے بھی الگ سے مال بھیج دینا ——— بڑا

چوہدری ذرا شوقین مزاج آدمی ہے کہیں اپنے جیسی کوئی نہ بھیج دینا ــــ سمجھ گئی ناں ــــ"

موج دین نے مُرغا ختم کر کے اُسے ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔

"جو حکم چوہدری صاحب ــــ آپ تو ہمارے مائی باپ ہیں بھلا آپ کا حکم ہم کیسے ٹال سکتے ہیں ــــ بہتر ہوتا اگر بڑے چوہدری صاحب غریب خانے پر ہی..."

موج دین نے اُس کے "غریب خانے" کو موٹی سی گال دے کر اس کی بات کاٹ دی۔

"زیادہ چالاک نہ بنو ــــ تھانے کے ساتھ والی بلڈنگ چوہدری صاحب کے پاس ہی ہے اور رات دس بجے کے فوراً بعد لڑکیاں پہنچ جائیں" ــــ

اتنا کہہ کر موج دین نے سگریٹ کی وہ ڈبی جو ابھی نوکر نے وہاں لاکر رکھی تھی اُٹھا کر اپنی جیب میں ڈالی اور اکڑتا ہوا باہر نکل آیا ــــ

عنایت بائی نوکرانیوں کی طرح اس کے پیچھے ہاتھ باندھتے ہُوئے اسے دروازے تک چھوڑنے گئی تھی۔



"یہ سُوّر کیا لینے آیا تھا"

اُس کے واپس لوٹتے ہی زہراں بائی نے دریافت کیا۔

"یہ طوائف کا کوٹھا ہے بی بی رانی ــــ یہاں سے کوئی کیا لے جائے گا۔ یہاں تو جو بھی آئے گا دینے کے لیے ہی آئے گا ــــ تھانیدار ہو گا سالا سرکار کا ــــ ہمیں اس سے کیا لینا دینا ہماری تو اپنی سرکار ہے" ــــ

یہ کہتے ہوئے عنایت بائی نے بنڈل میں سے کچھ نوٹ نکال کر اُس کی طرف بڑھاتے اور باقی نوٹوں کو سیف میں تالا لگا کر اس کی چابی دوبارہ اپنے ازار بند سے باندھ لی ــــ

"لڑکیوں کو ساتھ لے جاکر کچھ شاپنگ وغیرہ کر آ میری بنّو ــــ تیری مانگ

بڑی بڑھنے لگی ہے" ــــ

عنایت بائی نے اس کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمھارا ــــ مَیں تھانے میں نہیں جاؤں گی ــــ شریفاں کا حشر یاد نہیں تمھیں کیا ــــ اس موٹے موج دین کے پاس گئی تھی لیکن وہاں کس کس نے اُسے نہیں نوچا ــــ یہ تو وحشی ہیں وحشی۔ درندے کہیں کے ــــ یہ نہیں ہوگا بی بی"

زہراں کو بات کی سمجھ نہیں آئی تھی۔

"ارے لعنت بھیجتی ہوں مَیں ایسی سوچ پر بھی ــــ میرا کیا دماغ خراب ہُوا ہے جو اس بڑھاپے میں اب اپنی بیٹی کو نچوانے کے لیے کتّوں کے سامنے پھینکوں گی۔ یہ جو دو سانڈنیاں پال رکھی ہیں ان کا کیا مَیں نے نکاح پڑھوانا ہے ــــ بیٹی تو کیوں اپنے دماغ میں ایسی باتیں لاتی ہے ــــ اپنی ماں کو کیا سمجھتی ہے تو۔ میرے جیتے جی بھلا ایسا ممکن ہے" ــــ

یہ کہتے ہوئے اس نے باقاعدہ ٹسوے بہانے شروع کر دیئے۔

"ارے بی بی تُو تو خواہ مخواہ ہی ناراض ہو جاتی ہے مَیں نے تو ایسے ہی کہہ دیا تھا۔ اچھا اب چُپ ہو جا۔ میری اچھی بی بی ــــ اور بتا کہ کیا بات تھی" ــــ

زہراں بائی نے اپنی ماں سے لپٹتے ہوئے پوچھا۔

"بس بیٹی جب سے تُو شاہ پور میں مُجرا کر کے آئی ہے نزدیک دُور کے دیہاتوں میں تو دھوم مچی ہوئی ہے ــــ پلوال کے سردار بہت بڑے آدمی ہیں، سرکار دربار میں بڑی پہنچ ہے اُن کی ــــ کروڑوں کی جائدادوں کے مالک ہیں ــــ ریس میدان کے گھوڑے دوڑتے ہیں ــــ انھوں نے اپنے بیٹے کی منگنی پر تیرے مُجرے کا پروگرام رکھا ہے اب تُو اندازہ کر لے کتنے بڑے لوگ ہیں جنھوں نے مُجرے کی سائی (ایڈوانس) بھی تھانیدار کے ہاتھ روانہ کی ہے ــــ موج دین کہہ رہا تھا لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے کم آمدن نہیں ہوگی۔

اور ہاں ان دونوں حرام خوردوں کو بھی کچھ نرت بھاؤ بتا دینا ——— وہ منوا اُستاد آیا نہیں ابھی تک ——— کبھی کبھی ان سے طوائفوں والے کام بھی لے لیا کر۔ آخر یہ بھی تیری نام نہاد سہی بہنیں تو ہیں ———"

عنایت بائی کی بات کے خاتمے پر دونوں ماں بیٹی نے اکٹھا قہقہہ بلند کیا تھا ——— !!

"اور ہاں ——— آج رات کے لیے ان دونوں کو تیار کروا دے ——— تھانے والے کمبخت اپنا حصہ بھی تو وصول کریں گے" ———

عنایت بائی نے دوسرے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اپنی نائب کو ہدایت کی۔

"کیوں نہیں بی بی ——— اور کیا ہم نے ان سے "نرت بھاؤ" کروانے ہیں"۔

زہراں بائی نے بے شرموں کی طرح قہقہہ لگایا ———

اُس کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ اُن کے ساتھ کتنا بڑا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

اس کے ذہن میں تو اِن خدشات نے بھی جنم نہیں لیا تھا جو اس کی ماں کے لاشعور میں کینچوؤں کی طرح سرسرا رہے تھے۔

سرداروں کا نام ایک طوائف زادی کی حیثیت سے اُس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ لوگ بھی ریاست شاہ سے کسی طرح کم پائے کے نہیں ہیں اور اُن کی طرف سے زہراں بائی کا مجرہ دیکھنے کی خواہش اُس کے لیے کوئی معمولی اعزاز نہیں تھا۔ اُس کی گردن خوامخواہ تن گئی۔

تکبّر سے اس کی ناک معمول سے کچھ زیادہ ہی چڑھ گئی تھی۔

اب اُسے اپنے حلقہ احباب خصوصاً اس بازار میں موجود اپنی برادری تک یہ خبر پہنچانی تھی تاکہ وہ جل بھُن کر کباب ہوں اور زہراں بائی کو مزید گردن پھُلانے کا موقع ملے۔ اس بازار میں اُس کی سگی خالہ کی بیٹیاں بھی بیٹھتی تھیں جنھوں نے

دو تین فلموں میں ایکسٹرا رول کر لیے تھے اُن کا تو دماغ ہی خراب ہونے لگا تھا۔

"اب ایک ایک کو جلاؤں گی ——— ایک ایک کو ——— کیا کہتی تھی ——— خانگی (ایسی طوائف جو جسم فروشی بھی کرتی ہو) کی اولاد ——— اب دیکھوں گی ایک ایک کو ———"

اُس نے دل ہی دل میں کہا ———

وہ خوشی سے پھُولے نہیں سما رہی تھی۔

اپنی دونوں "نام نہاد بہنوں" کو جنھیں اُس کی ماں نے کم عمری ہی میں کہیں سے خریدا تھا اور اب اُن بے چاریوں کو جسم فروشی پر لگا رکھا تھا۔ اپنے ساتھ لے کر وہ فوراً شاپنگ کے لیے سول بازار روانہ ہو گئی ———

اُس کی ماں نے خریداری کے لیے اُسے خاصی رقم دی تھی ——— !

زہراں بائی نے اپنی دونوں ساتھیوں کے ساتھ اپنی مرضی کی خریداری جی بھر کے کی ——— اُس نے نت نئے ڈیزائن کے سُوٹ خریدے ———

آخر اب وہ کوئی معمولی طوائف نہیں تھی ———

اُس بازار میں شاید ایک آدھ ہی ایسی اور ہو گی جس کو ایڈوانس بکنگ کے ۲۰ ہزار روپے آتے ہوں ———

اُسے علم تھا کہ پلوال میں مُجرہ کے دوران اُس کا ڈنکا کہاں کہاں بج سکتا ہے۔

اس نے اپنی دانست میں آنے والا مُجرہ سُننے والوں کے دلوں پر چھُریاں چلانے کا مکمل بندوبست کر لیا تھا ———

سہ پہر تک خریداری سے فارغ ہو کر وہ ٹیکسی لے کر اپنے گھر پہنچی۔

گھر پہنچنے پر ایک اور خوشگوار حیرت سے اس کا سامنا ہوا۔

نذیر مرچی اور حنیف خان اس کے منتظر تھے۔

زہراں بائی ایسی طوائف زادی نہیں تھی جو ایک ہی رات میں اپنا دل کسی

تماش بین کے قدموں میں پھینک آتی ـــــ ایسے بجانے کتنے اس کی زندگی میں آئے
اور چلے گئے تھے ـــــ وہ خاندانی طوائف تھی۔
اُس کی زندگی کا واحد مقصد تھا دولت اینٹھنا ـــــ دولت مندوں کو جسمانی اور
ذہنی تسکین پہنچا کر اُن کی جیبیں خالی کرنا ـــــ

اور ـــــ

اِس دھندے میں وہ بڑی کامیاب تھی ـــــ اپنی ماں سے بھی دو ہاتھ آگے۔

لیکن ـــــ

حنیف خاں کی مردانگی اور سادگی نے اُسے متاثر ضرور کیا تھا ـــــ!
اس نے گو کہ حنیف خاں کے ساتھ ایک ہی رات گزاری تھی لیکن ایک مکمل مرد کے
ساتھ یہ اس کی زندگی کی پہلی اور بھرپور رات تھی۔
ایک ایسی رات جس کی خواہش اُس جیسی کوئی بھی طوائف کر سکتی تھی۔
اس سے پہلے اُس کا واسطہ تماش بینوں سے تھا ـــــ شرابیوں اور زانیوں سے تھا
اور یہ پیشہ ور لوگ خود تو لطف اندوز ہو سکتے تھے اُسے کسی لُطف سے آشنا نہیں کر سکتے
تھے جبکہ حنیف خاں نے اپنی مردانگی سے اپنا آپ منوا لیا تھا۔
اُس نے بظاہر تو حنیف خاں سے وہی سلوک کیا تھا جس کی قیمت اُسے پہلے سے
اَدا کر دی گئی تھی۔

لیکن ـــــ

ایک ہوشیار طوائف ہونے کے ناطے اُسے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو چلا تھا کہ حنیف
خاں بھی کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ جس علاقے میں شاہ فیملی کا ڈیرہ تھا وہاں چپے چپے پر
ایسے سمگلر اور بدمعاش موجود تھے۔ ریاست شاہ نے یہاں سے بدمعاشوں کی فوج بھرتی کر
رکھی تھی پھر اُسے کیا ضرورت پڑی تھی جو اُس کے لئے خاص اہتمام کرتا ـــــ ضرور اُس میں
کوئی خاص بات تھی۔

اور ـــــ

یہی وہ لالچ تھا جس نے اُسے مجبور کر دیا تھا کہ حنیف خان کو دوبارہ اپنے پاس آنے
کی دعوت دے گو کہ نذیر موچی کی طرف سے عنایت بائی کو اس سلسلے میں خصوصی ادائیگی
بھی کر دی گئی تھی لیکن یہاں کاروبار سے زیادہ ذاتی لالچ دَر آیا تھا۔
روایتی طوائفوں کی طرح اُس نے حنیف خاں کو خوش آمدید کہا۔ اس کی ماں نے
نذیر موچی کو خود سنبھال لیا تھا جبکہ بیٹی کو حنیف خاں پر چھوڑ دیا تھا۔
اس بات کی تو اسے کسی شک شبہ کی گنجائش نہیں تھی کہ یہاں آنے والا یونہی واپس
نہیں چلا جائے گا۔ انھیں کچھ نہ کچھ دے کر ہی جائے گا۔
زہراں بائی نے بطور خاص اپنے نوکر کو جلیبی اور کیک پیسٹری لانے کا حکم دیا تھا۔ اسے
اُمید تھی کہ اس بہادر اور بے خوف عاشق سے معمول سے کچھ زیادہ ہی مال ملے گا اس طرح
امین فضل اور ریاست شاہ کے سامنے بھی اپنے نمبر بنانے کا موقعہ مل سکتا تھا کیونکہ فضل شاہ
نے بطور خاص اُسے ہدایت کی تھی کہ حنیف خان کو اپنی مٹھی میں کم از کم الیکشن تک ضرور
جکڑ کر رکھے۔
"بی بی ـــــ ہمارا بھی خیال رکھا کر ـــــ تیرے لیے کیسی کیسی آسامیاں لاتا ہوں ـــــ
اسے معمولی ہستی نہ سمجھنا پانچ دس ہزار فی چکر دینا اس کے لیے معمولی بات ہے اور
ہاں شاہ صاحب کی طرف سے جو کچھ ملے گا وہ بونس سمجھ لینا ـــــ"
نذیر موچی دوسرے کمرے میں دیسی شراب کی بوتل سامنے رکھے عنایت بائی کو بتا
رہا تھا۔ عنایت بائی کو اس کی اوقات کا علم تھا۔ وہ نذیر موچی کو دیکھتے ہی اپنے نوکر
کو اشارہ کر دیا کرتی تھی جو اس بازار کے ایک خفیہ اڈے سے اُس کے لیے دیسی شراب
کا آدھا لے آتا تھا جس کو وہ جُوں کا تُوں نذیر موچی کے سامنے رکھ دیا کرتی تھی ـــــ
"نذیرے ـــــ یہ بھی کوئی معمولی کوٹھا نہیں جس پر جس کا جی چاہے منہ اُٹھا کر چلا
آئے۔ عنایت بائی کا ڈیرہ ہے ـــــ مولا سلامت رکھے میری زُہراں کو ـــــ پولیس کے
بڑے بڑے افسر اس کا گانا سُننے کے لیے ایڈوانس بُکنگ کرواتے ہیں ـــــ"
عنایت بائی نے بھی اپنے لیے الماری میں رکھی دوسری ولایتی شراب کی بوتل سے

جام تیار کیا اور اب وہیں سامنے رکھے محوِ گفتگو تھی۔

"بی بی ___ جو بات شاہ صاحب کی ہے اُس کا مقابلہ کسی اور سے کیا"

نذیر موچی کو اب نشہ ہونے لگا تھا۔

"دیکھ نذیرے ہم تو فضل شاہ کی عزت سیّد بادشاہ ہونے کے ناطے کرتے ہیں۔ ورنہ ہمیں کسی سے کیا لینا دینا ___ اور تُو جانتا ہے کہ طوائف کے لیے اُس کے کوٹھے پر آنے والا ہر شخص قابلِ احترام ہوتا ہے ___ یہ جو پچھلے دو تین ہفتوں سے تُو نے شاہ صاحب شاہ صاحب کی رٹ لگا رکھی ہے ہمیں اس سے کیا لینا دینا ___ بات کو سوچ سمجھ کر کیا کر ___ تُو اب ہماری برادری کا بندہ ہے ___ تیرا دھندہ بھی ہماری وجہ سے چل رہا ہے۔ یہ جو بچیاں تُو اغوا کر کے میرے پاس لاتا ہے انھیں تُو یورپ اور امریکہ میں تو لے جا نہیں سکتا نہ ہی اپنے گاؤں میں اِن کا پیشہ کروا سکتا ہے ___ تیرا دھندہ بھی ہماری وجہ ہی سے ہے ___ اپنی بات کیا کر۔ ہمیں اِس سے کیا کہ شاہ صاحب کوئی بڑا آدمی ہے یا چھوٹا آدمی"___

عنایت بائی نے بھی موقعہ مناسب جان کر گیند اس کے کورٹ میں پھینک دیا وہ اندازہ کرنا چاہتی تھی کہ سرداروں کے ہاں مجرے پر جانے سے شاہ صاحبان اس کے لیے کس حد تک مشکلات کھڑی کر سکتے تھے۔

یوں بھی نذیرا ایک طرح سے اُن کا اپنا آدمی تھا۔ اگر کل کلاں کوئی مسئلہ کھڑا ہوتا تو وہ نذیر موچی کے ذریعے ہی اُسے کنٹرول کر سکتی تھی۔

دوسری طرف نذیر موچی اِس گفتگو سے اچانک یوں چونکا تھا جیسے کسی نے چیونٹی بھر کر اُسے گہری نیند سے بیدار کر دیا ہو۔

"کیا کہہ رہی ہو بی بی ہوش میں تو ہو ___"

نذیر موچی کے لیے واقعی عنایت بائی کا یہ لہجہ قدرے اجنبی سا تھا۔

"مَیں تو ہوش میں اب آئی ہوں نذیرے ___ مجھے تو اپنی قدر و قیمت کا احساس اب ہُوا ہے۔ سرداروں نے ۲۰ ہزار کی سائی (ایڈوانس) دی ہے زہراں کے مجرے کے لیے

وہسکی کا گھونٹ حلق میں اُنڈھیلتے ہوئے عنایت بائی نے اس کے سر پر ٹائم بم پھینک ہی دیا۔

"وہ کہ کیا مطلب ___ کون سے سردار؟"

نذیر موچی کو اچانک جھٹکا لگا۔

"تم کوئی چوچے ہو ___ تمھیں علم نہیں کون سے سردار ___ پلوال والے اور کون سے؟"

عنایت بائی نے اپنا پیگ ختم کرتے ہوئے گلاس ایک طرف رکھ کر اداتے بے نیازی سے جواب دیا۔

"نیتی بائی تمھارا دماغ تو ٹھیک ہے ___ کیا کہہ رہی ہو تم ___ تمھیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ یہ سردار کون ہیں؟ شاہ صاحب کے مخالف۔ اُن کے خلاف الیکشن لڑ رہا ہے سردار رشید ___"

نذیر موچی نے اپنی دانست میں اُسے بڑی اہم اطلاع دی تھی۔

نذیرے ہوش کر ___ تجھے شاید چڑھنے لگی ہے ___ انسانوں کی طرح پی ___ ہمیں کیا لینا دینا سیاست بازی سے ___ اگر سردار رشید ریاست شاہ کا مخالف ہے تو کیا مَیں کوٹھا بند کر کے کوئی بوتیک شاپ کھول لوں گی ___ ہمارا تو دھندہ یہی ہے ___ باپ دادا بھی کرتے آئے ہیں اور ہم بھی کرتے رہیں گے ___ سمجھے یا نہیں ___ تم اس چکر میں نہ پڑو۔ اپنے کام سے کام رکھو ___ میرے پاس آج کل دوسرے شہر کی ایک پارٹی آئی ہوئی ہے ___ اگر کوئی لڑکی نظر میں ہے تو آج کل میں ہی لے آ ___ اچھے مُول بِکا دوں گی ___"

عنایت بائی کے کانوں پر جوں بھی رینگتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

"عنایت بائی میری بات سمجھنے کی کوشش کرو ___ خدا کے لیے یہ حرکت نہ کر بیٹھنا۔ فضل شاہ تمھارا "کہاں بچہ کولہو" کروا دے گا ___ تم اس کی پہنچ کا اندازہ نہیں کر سکتیں عنایت بائی ___ مَیں تو کسی نہ کسی چکر میں اپنی جان چھڑا ہی لوں گا۔ تم پر بڑی آفت آ جائے گی"___

"ارے مر گئے مجھ پر آفت لانے والے ___ بڑا آیا ریاست شاہ کا چمچہ ___ کیا کر

لے گا وہ میرا —— کیا بگاڑ لے گا —— میں کوئی کارخانہ فیکٹری لگا کر نہیں بیٹھی —— کوٹھا سجا کر بیٹھی ہوں وہ کیا میرے مقابلے میں کوٹھا سجا کر بیٹھ جائے گا" ——

عنایت بائی نے اس کی بات سختی سے کاٹتے ہوئے کہا۔

وہ دیکھ عنایت بائی اپنا دماغ اب بھی درست کر لے —— میرے لیے بڑے ٹھکانے اور موجود ہیں۔ میں اپنا مال ملک کے کسی بھی کونے میں فروخت کر لوں گا۔ پر یاد رکھنا اگر تُو نے شاہ صاحب کو ناراض کیا تو اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی مارنے والی بات ہوگی۔ میں کہتا ہوں اب بھی وقت ہے سائی واپس لوٹا دے —— اب بھی وقت ہے ——"

اپنی دانست میں نذیر موچی نے اُسے چیتاونی دی تھی۔

لیکن ——

عنایت بائی کو شاید دھمکی کا ایک ہی پیگ چڑھ گیا تھا وہ بھڑک اُٹھی ——

"کیا کرلے گا تیرا بابا شاہ —— کیا کرلے گا —— جا اپنا راستہ ناپ۔ تیرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ مجھے دھمکیاں دے رہا ہے —— دیکھ لوں گی میں فضل شاہ کو بھی —— ہم کوئی کسی کا دیا کھاتے ہیں۔ اپنی محنت کی کمائی کھاتے ہیں —— کسی کی مرضی کی زندگی گزارنی ہوتی تو کسی کا گھر بسا کر نہ بیٹھ جاتیں ——"

عنایت بائی نے اُسے قریباً ڈانٹتے ہوئے کہا۔

نذیر موچی بھی جرائم کی دُنیا کا پُرانا کھلاڑی تھا —— !

اُسے سمجھ آگئی تھی کہ ضرور کسی نے اُس کے خلاف خطرناک کھیل کھیلا ہے۔ ضرور سرداروں کو علم ہوا ہوگا کہ زہراں بائی کا مجرہ اپنے پاس کروانے سے وہ ریاست شاہ کے خلاف کوئی طوفان کھڑا کر سکتے ہیں —— تب ہی انھوں نے یہ چال چلی ہے ورنہ انھیں ایسی درجنوں عنایت اور زہراں بائیاں مل سکتی تھیں !

کہیں یہ نھتو خان کو توڑنے کی سازش تو نہیں !

کہیں اُن لوگوں کو علم تو نہیں ہوگیا کہ حنیف خاں کا دل زہراں بائی پر آگیا؟

اور انھوں نے ۔۔۔۔؟

اُس کے شیطانی ذہن نے چند سیکنڈ کے اندر کئی مفروضات قائم کر لیے —— اور وہ بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ ضرور دال میں کچھ کالا تھا۔

کوئی گہری سازش ہوئی تھی ——

تم کیا وہ بھی اس سازش کا حصّہ بن جاتے ؟

یہی تھا وہ سوال جو اس کے دماغ میں فی الوقت مچل رہا تھا۔

نذیر موچی نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ ہر طرح کے حالات سے اپنے شیطانی ذہن کے ساتھ فائدہ اُٹھانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اب بھی اُسے حالات سے فائدہ اُٹھانا تھا۔ اُس کی زندگی کا اصول تھا کہ وہ ہمیشہ اپنا وزن بھاری پلڑے کی طرف ڈالتا تھا۔

"دیکھو عنایت بائی۔ میں تمھارا محسن ہوں۔ دشمن نہیں۔ تمھاری بات ٹھیک ہے۔ مجھے بھی شاہ صاحب سے کیا لینا دینا۔ میں نے بھی اُن کی آڑ اپنے جرائم کی پردہ پوشی ہی کے لیے لے رکھی ہے۔ تم جانتی ہو جو لڑکی ثمینہ اِس وقت تمھاری بہن کے قبضے میں ہے اور جس کی کمائی سے اُس نے اس ملک کے سب سے بڑے شہر میں اتنی جائداد کھڑی کرلی ہے۔ اس کے اغوا کا پرچہ مجھ پر ہوا تھا۔ یہ شاہ صاحب کی مہربانی ہی تھی کہ انھوں نے لڑکی کے لواحقین پر دباؤ ڈال کر میرا نام پرچے سے خارج کروایا تھا ورنہ تو میں ساری زندگی جیل کی دیواروں میں سڑتا رہتا۔ میں تمھیں یہ نہیں کہتا کہ تم شاہ صاحب کی غلام بن جاؤ لیکن جو کام حکمت سے ہو جاتے وہی اچھا ہے۔ اگر گُڑ دینے سے دشمن مرتا ہے تو اُسے زہر کیوں دیا جائے" ——

نذیر موچی نے فوراً ہی پینترا بدلا۔

"دیکھ ناں نذیرے —— اب تُو ہی انصاف کر۔ آخر ہم نے بھی اپنی سفید پوشی قائم رکھنی ہوتی ہے۔ بازار کا مال تیرے سامنے ہے —— شام ڈھلتی نہیں کہ پولیس کا گشت شروع ہوجاتا ہے —— دروازوں پر پردے لٹکے ہیں۔ شریف گاہک اس طرف آتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگاتا ہے اور لُچے لفنگوں کو میں اپنے گھر میں داخل ہونے کی

اجازت نہیں دے سکتی —— اب لے دے کے ہمارے لیے بھی شادی بیاہ میں گانے
بجانے کا دھندہ رہ گیا ہے —— ہم اپنا خرچ کہاں سے پورا کریں —— اب بیٹی کا سرِعام
دھندہ کروانے سے تو مَیں رہی۔ پھر تم ہی بتاؤ کہ گھر آئی مایا کو کون ٹھکراتا ہے"؟
عنایت بائی بھی قدرے ڈھیلی پڑ گئی تھی۔

نذیر موچی اُسے قائل کرتا رہا کہ وہ فی الحال کوئی بہانہ کر کے سرداروں کو ٹرخا دے۔
بیٹی کو بیمار بنا دے یا کچھ اور جو بھی ممکن ہے —— اور نہیں تو زہراں بائی کی جگہ کسی کو
بھیج دے اُسے تو اپنے حصے سے غرض تھی —— غلط کاریوں کے لیے اُس نے دو لڑکیاں
اپنے پاس رکھی ہی ہوتی تھیں وہ بھی اُلٹے سیدھے ہاتھ پاؤں مار لیتی تھیں ——
اُس نے ایسے کئی "آپشن" عنایت بائی کے سامنے رکھے۔
عنایت بائی بھی بڑی گھاگ کنجری تھی —— !
گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا تھا اُس نے بھی ——
کیا مجال جو وہ ٹس سے مس بھی ہوتی ہو۔



شاید نذیر موچی حنیف خان کو پڑھا کر لایا تھا —— !
حنیف خاں نے اُس سے کہا تھا کہ جس طرح زہرہ بائی نے رات اُس کے ساتھ بسر کی
تھی ایسی ہی ایک اور رات کا بندوبست کروا دے ——
نذیر موچی کے لیے تو اس بات سے بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ اندھے کو گویا دو آنکھیں
مل گئی تھیں اس چکر میں اس نے دس ہزار افضل شاہ سے اینٹھ لیا تھا۔ دوسری طرف
حنیف خاں سے کہہ دیا تھا کہ وہ دس ہزار کا بندوبست کر لے —— !
حنیف خان کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا ——
اس نے نذیر موچی کے کمرے سے باہر نکلتے ہی سب سے پہلے زہرہ بائی کے سامنے
نوٹوں کی گڈی رکھ دی۔
"یہ کیا —— ؟

زہرہ بائی نے نوٹوں کی مالیت کا اندازہ لگا لیا تھا اور یہ اس کے لیے بڑی خوشگوار
حیرت تھی۔ جس کام کے لیے حنیف خان یہ نوٹ لایا تھا کوئی اور اِتنے نوٹ لاتا تو اُسے
کم از کم ایک ہفتہ اپنے ساتھ رکھتا۔
لیکن ——
یہاں تو صرف ایک رات کی بات تھی۔
"مَیں نے سوچا تم اپنی مرضی سے کچھ خرید لو —— جو مَیں لے جاؤں شاید تمھیں پسند نہ آئے"۔
حنیف خان نے کمال سادگی سے کہہ دیا۔
"ہائے —— ایسی بھی کیا بات تھی" ——
یہ کہتے ہُوئے اُس نے نوٹوں کا بنڈل اُٹھا لیا اور ابھی آئی کہہ کر دوسرے کمرے
میں اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔
اگلا کوئی بھی قدم اُسے بہرحال اپنی ماں کی مرضی سے اُٹھانا تھا —— !
عنایت بائی ابھی نذیر موچی کے ساتھ بک بک جھک جھک سے فارغ ہی ہوتی
تھی جب زہراں بائی نے اُسے دوسرے کمرے سے اشارہ کر کے بلایا۔
"اب کیا مصیبت آ گئی ہے" —— ؟
عنایت بائی نے کمرے میں گھستے ہی کہا۔
"مصیبت آئے تمھارے دشمنوں پر —— اِدھر تو رحمت ہی رحمت ہے مولا کی ——"
یہ کہتے ہوئے زہراں بائی نے اُس کی آنکھوں کے سامنے نوٹوں کا بنڈل لہرایا۔
"کس پر پھیر دی چھُری" ——
عنایت بائی کی رال ٹپکنے لگی تھی۔
"اے بی بی —— مولا عباس کی قسم لے لو جو مَیں نے کچھ بھی کیا ہو —— وہ تو پہلی
ملاقات ہی سے گھائل ہو گیا تھا۔ یہ لایا ہے ایک رات رہنے کے لیے ——"
یہ کہتے ہوتے زہراں نے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیئے۔
عنایت بائی نے اپنے ہاتھ میں نوٹوں کا بنڈل پکڑ کر اُسے تاش کے پتوں کی طرح

لہرایا اور اندازہ کر لیا کہ یہ دس ہزار ہیں۔

"کیا صرف ایک رات ؟" ——

اُس نے حیرانگی سے پُوچھا۔

"اور کیا بی بی —— کیا سمجھ رکھا ہے تُو نے مجھے —— مَیں بھی عنایت بائی لدھیانے والی کی بیٹی ہوں۔ جس کے دل پر ایک مرتبہ چُھری چلا دوں۔ وہ ہاتھ پر گردن رکھ کر پیش کرنے نہ آتے تو پھر زہراں بائی نام نہیں میرا" ——

اُس نے اکڑتے ہوئے کہا۔

عنایتی بائی کے شیطانی ذہن نے فوراً اسے دوسری راہ سجھائی۔

اِس بات کا تو اُسے علم تھا ہی کہ حنیف خان کتنا اہم آدمی ہے۔ اُس کے لیے تو فضل شاہ نے سارا کھڑاگ پھیلایا تھا اگر وہ زہراں بائی کے ذریعے حنیف خاں کو قابو کر لے تو پھر بلوال کے سرداروں کے ہاں انھیں مجرہ کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا —— ضرور اس کی بیٹی یہ کارنامہ انجام دے سکتی تھی کیونکہ اس وقت حنیف خاں پکے ہوئے پھل کی طرح اُن کی ہوس کی ٹوکری میں آن گرا تھا۔

"ہائے بیٹی ! اچھا تو نہیں لگتا روز —— لیکن اس وقت اس کی ضرورت ہے۔ تجھے مَیں نے بتایا تھا ناں کہ وہ جو ۲۰ ہزار موج دین مُوّا تھانیدار ایڈوانس دے گیا ہے وہ بلوال والے سرداروں کے ہاں مُجرہ کرنے کے ہیں اور یہ فضل شاہ مُوّا اُس کا مخالف ہے —— کہیں ہمارے لیے کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دے —— ذرا پکّا کر کے اُسے ہاتھ ڈال۔ یہ نتھو خاں کا بیٹا ہے۔ اگر تجھے اس کی ہمدردی اور مدد حاصل ہو گئی تو ہم بلوال سے ڈیڑھ دو لاکھ روپیہ دو تین راتوں کا کما لائیں گے —— میری بات سمجھ میں آ رہی ہے ناں —— ارے ایک تو اس کمبخت نذیرے نے میرا دماغ خراب کر دیا ہے تو اسے کہہ نذیرے کو یہاں سے بھگا دے اور آئندہ اکیلا آیا کرے۔ اِس موذی کے ساتھ نہ آیا کرے۔ مجھے تو اس کی شکل سے نفرت ہونے لگی ہے" —— !

اُس نے بڑی رازداری سے اپنی بیٹی کو سمجھایا۔

تو بے فکر ہو جا بی بی —— مَیں اُسے سنبھال لوں گی۔ اور ہاں وہ جو کینٹھی اس روز مَیں سُنار کے ہاں پسند کر آئی تھی ناں —— وہ آج منگوا لینا ان پیسوں میں سے"

اس نے اُٹھتے ہوئے اپنی ماں سے کہا۔

"اے میری بنّو —— تجھ سے کیا چُھپا ہے —— میرے اور تیرے کون سے دو ہیں —— تُو جانتی ہے کہ خرچ کتنا بڑھ گیا ہے —— اگلی مرتبہ پر رکھ لے —— اگلی مرتبہ جو بھی آیا سب تیرا۔ جو جی چاہے بنا لیجیو"

عنایت بائی نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

زہراں نے دل ہی دل میں اپنی ماں کو موٹی سی گالی دی اور حنیف خاں والے کمرے میں آ گئی۔ جو ہونقوں کی طرح منہ اُٹھائے اُن اشیائے خورد و نوش کا جائزہ لے رہا تھا جن کا ڈھیر نوکر نے اس کے سامنے لگا دیا تھا۔

"کھاؤ ناں —— کمال ہے ابھی تک تم نے کچھ لیا ہی نہیں —— بھئی یہ کیا بات ہوئی۔ کیا ہماری کوئی چیز پسند نہیں آئی" ——

زہراں بائی نے صوفے پر اس کے پہلو میں ڈھیر ہوتے ہوتے کہا۔

"نہیں نہیں —— مَیں نے سوچا۔ تم آ جاؤ تو ——"

حنیف خاں کو اُس کی قربت کا احساس ہوتے ہی اپنی رگوں میں انگارے دوڑتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

"یہ لیجیے ناں" ——

کہتے ہوئے زہراں بائی نے مٹھائی کا ایک ٹکڑا اُٹھا کر اپنے ہاتھ سے اُس کے منہ میں ڈال دیا۔ اس طرح کے تین چار اور چاؤ چونچلے کرنے کے بعد جب اُس نے دیکھا کہ شکار اب مکمل جال میں پھنس چکا ہے تو کام کی بات کہہ دی۔

"تم اکیلے آ جایا کرو —— تم کوئی بچے ہو جو اس مُوئے نذیرے کی اُنگلی پکڑ کر ہی آیا کرو گے۔ تمھیں کیا یہاں کا راستہ نہیں آتا" ——

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں —— دراصل اس نے ہی تم لوگوں سے پہلی مرتبہ

ملوایا تھا۔ یوں بھی اس کا تمھارے ہاں آنا جانا کافی دیر سے لگا ہوا ہے اِس لیے مَیں نے سوچا ——"

حنیف نے کچھ کہنا چاہا ——

"چھوڑو اُس کو —— اُس کا آنا جانا ہو گا میری ماں کے پاس مَیں تو اُس کی شکل پر تھوکنا پسند نہیں کرتی۔ پھر تم نے میرے پاس آنا ہے۔ اُس کے پاس تو جانا نہیں اب کہیں رات کو اُسے یہاں نہ بُلا لینا ——"

زہراں نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے اس انداز سے اُس کے گال پر چٹکی لی کہ بے ساختہ حنیف خان کے دانت نکل آئے۔

"تم کیوں ڈرتی ہو اُس سے اِتنا ——"

اُس نے پہلی مرتبہ ہمت کرکے زہراں بائی کا بازو پکڑ لیا تھا۔

"ایسے لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ خدا جانے فضل شاہ کے کان بھر دے ہمارے خلاف اور ہم غریبوں کا کباڑہ کروا دے —— ہماری تو کوئی مدد بھی ڈر کے مارے نہیں کرے گا "——

اُس نے موقعہ غنیمت دیکھ کر حنیف خاں کی غیرت کو للکار دیا۔

"ایسی تیسی فضل شاہ کی ——"

حنیف خاں کی مونچھیں تن گئیں۔

"ہائے اللہ آہستہ بولو حنیفے —— کہیں مُوئے نذیرے کے کانوں میں آواز پڑ گئی تو"

زہراں بھی ماں کی طرح ماہر نفسیات تھی خصوصاً مرد کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھنا تو اُسے نسل دَر نسل ایک فن کی صورت منتقل ہوا تھا۔

"تو کیا —— کیا ہو جائے گا۔ تمھیں شاید میرے متعلق اُس نے کچھ نہیں بتایا —— ٹھیک ہے ان لوگوں کو سیاست آتی ہو گی لیکن گھونسے کے سامنے ساری سیاست دھری کی دھری رہ جاتی ہے "——

حنیف خاں بھی شیخی بگھارنے لگا تھا ——

اور ——

یہی وہ چاہتی تھی ——

"حنیف خان یہ طوائف کا کوٹھا ہے۔ یہاں آنے والا بُزدل بھی کچھ دیر کے لیے بہت بہادر بن جاتا ہے لیکن وقت آنے پر . . . "

"تم کیسی باتیں کر رہی ہو —— کون سا وقت آگیا ہے۔ ہم کوئی شہری بابو نہیں ہیں۔ جو کہہ دیا وہ کرکے دکھا دوں گا —— اسے مرد کی زبان سمجھو —— مرد کی زبان"——

اُس نے قدرے چڑ کر زہراں بائی کی بات کاٹ دی ——

"حنیفے مَیں بھی پہلے عورت ہوں پھر کچھ اور —— عورت اگر طوائف بن جائے تو بھی اپنے سینے سے دل نکال کر باہر نہیں پھینک سکتی —— تمھارے ساتھ ایک رات گزارنے کی مجھے کیا قیمت اَدا کرنی پڑے گی۔ تم اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے —— اس بات کو کبھی فراموش نہ کرنا کہ میری ماں ایک خاندانی طوائف ہے جس کو اپنی بیٹی کی جوانی صرف اِس لیے عزیز ہے کہ وہ اس کے ذریعے دولت کے انبار لگاتی ہے —— حنیفے ہم خاندانی کنجر ہیں۔ ہمارے پاس سوائے ناچ گانے کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ بس مَیں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمھارے ہر فیصلے کا احترام کر رہی ہوں —— حنیفے کہیں مجھے بیچ منجدھار میں نہ چھوڑ دینا "——

یہ کہتے ہوئے اُس نے حنیف کے بازو پر سارا وزن ڈال دیا۔

"زہراں بائی یہ مرد کا قول ہے —— میرے جیتے جی کوئی تمھاری طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا "——

اُس نے جذباتی ہو کر زہراں کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

دونوں کافی دیر تک ایک دوسرے سے عہد و پیمان باندھتے رہے جب دروازے پر دستک ہوتی اور وہ سنبھل کر بیٹھ گئے ——

"اے بیٹی شام ڈھل رہی ہے —— رات کا کوئی بندوبست کر لو"——

دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے عنایت بائی نے اُس کی طرف دیکھ کر

آنکھ دبائی۔

"بی بی مَیں آج کوٹھا نہیں سجاؤں گی"——

زہراں بائی نے ماں کی آنکھ کا اشارہ سمجھ لیا تھا۔

"اچھا —— مَیں بیٹھ جاتی ہوں —— بیٹی کسی کو تو بیٹھنا ہی ہو گا —— تیرا باپ کوئی مربع تو میرے نام نہیں لگا گیا تھا —— اگر پانچ دس ہزار کی رات نہیں لگے گی تو کھائیں گے کیا —— گھاس بھی اب مفت نہیں ملتی"——

عنایت بائی نے جواباً اداکاری کی ——

"بی بی —— کہہ دیا ناں کہ مَیں آج کوٹھا نہیں سجاؤں گی۔ حنیفا اتنی دُور سے آیا ہے —— میں اس کے سامنے کسی غیر مرد کے لیے نہیں ناچ سکتی"——

زہراں بائی نے ماں سے بھی دو ہاتھ بڑھ کر اداکاری کی۔

"ہاں ہاں —— عنایت بائی یہ آج مجرہ نہیں کرے گی"——

حنیف خاں کی غیرت بھی بیدار ہونے لگی۔

"اے بیٹا —— وہ تو بچی ہے تُو عقل مند لگتا ہے —— بھلا ہم غریبوں کا اور کیا ذریعہ آمدن ہے۔ یہی پانچ چار ہزار آئیں گے تو دال روٹی چلے گی"——

عنایت بائی نے ملتجی لہجے میں کہا۔

"یہ لو پکڑو پانچ ہزار اور جاؤ یہاں سے —— اور ہاں جب مَیں آیا کروں تو یہ ناچنے گانے والی باتیں نہ کیا کرو —— میری بات کی سمجھ آ گئی ناں ——"

یہ کہتے ہوئے حنیف خاں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہزار ہزار کے پانچ نوٹ گن کر اُس کی طرف بڑھا دیئے۔

"ہاں ہاں —— لو پکڑ لو۔ تمہارا نقصان نہ ہو جائے کہیں ——"

زہراں بائی نے فوراً اس کے ہاتھ سے نوٹ پکڑ کر اپنی ماں کو تھما دیئے ——

"اچھا بیٹا جیسی تمہاری مرضی —— مجھ بُڑھیا کی بات اب کوئی نہ مانے تو مَیں کیا کروں"۔

عنایت بائی نے یہ کہتے ہوئے نوٹ اکٹھے کر کے اپنے گریبان میں اُڑس لیے اور جس طرح اندر آئی تھی اس طرح باہر نکل گئی۔

"حنیفے خدا کے لیے مجھے معاف کر دینا —— لیکن یہاں کا دستور ہی ایسا ہے کہ یہاں قدم قدم پہ نوٹوں سے ہی دوسرے کا منہ بند کرنا پڑتا ہے"——

اُس نے ماں کے جاتے ہی حنیف سے چمٹے ہوئے کہا۔

"زہراں بائی تم نوٹوں کی پرواہ نہ کرنا —— بس خوش رہا کرو —— میری بات سمجھ گئی ناں" ——

یہ کہتے ہوئے اُس نے گرمجوشی کا مظاہرہ شروع کر دیا۔

"ہائے اللہ مَیں نے ابھی کھانے کا بندوبست کرنا ہے اور اس موتے نذیرے کو تو دفع کر لو ——

رات تمہارے پاس ہی ہوں بھاگی تو نہیں جا رہی" ——

اُس نے آہستگی سے حنیف خان کی گرفت اپنے بدن سے ہٹا دی اور "ابھی آئی" کہہ کر باہر نکل آئی۔

زہراں بائی کے باہر جاتے ہی نذیر موچی اندر آ گیا ——

"واہ بھئی واہ —— دو گھنٹے سے اکیلے موج میلہ کر رہے ہو اور اپنے یار کو بھول ہی گئے" ——

اُس نے حنیف کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"یار مَیں نے کہا تُو بھی تو کسی کام میں مصروف ہو گا —— تجھے بھی کون سا مَیں یاد رہ گیا تھا —— پھر اس چڑیا کو بھی تو قابو کرنا تھا ——"

حنیف خان نے تماش بینوں کے سے لہجے میں کہا۔

"کر لی قابو ——"

نذیر موچی نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

"اور کیا نہیں —— ارے ہم بھی تمہارے شاگرد ہیں سالی بچ کر کہاں جا سکتی تھی"۔

حنیف خاں نے شیخی بگھارنا شروع کی۔

"کتنے پیسے دیتے ہیں"

نذیرے نے بے چینی سے اگلا سوال داغا وہ جانتا تھا حنیفا کن ہواؤں میں اُڑ رہا ہے اور کتنے پانی میں ہے۔

"کچھ بھی نہیں — صرف پانچ ہزار روپے سے کام بن گیا ہے — وہ تو پانچ ہزار بھی نہیں لے رہی تھی" —

اُس نے جان بوجھ کر جھوٹ بولا۔

نذیر موچی جانتا تھا کہ یہ گدھا جھوٹ بول رہا ہے لیکن یہاں جس طرح کی فضا بچی تھی اور جس طرح اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ماں بیٹی نے اُسے اُلّو بنا حنیف خاں کو قابو کر لیا تھا اُس کے بعد نذیرے کے لیے سوائے اس کی ہاں میں ہاں ملانے کے اور کوئی چارہ کار نہ تھا —!

"بھئی واہ — کمال کر دیا تم نے تو —"

اُس نے حنیف خاں کو اس کارنامے پر شاباش دینے کے انداز میں کہا۔

"مَیں رات یہیں گزاروں گا —"

حنیف خاں نے فوراً ہی کہہ دیا۔

"اچھا جی — یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ ٹھیک ہے صبح تازہ دم ہو کر چلے چلیں گے"

نذیر موچی نے پیش بندی کی۔

"یار تم تو یہاں پُرانے آنے جانے والے ہو — تمھیں کون سی رکاوٹ ہے تم بھی کرو موج میلہ" —

حنیف خاں نے بے شرمی سے دانت نکالے۔

"یہ تو پھر ہے" —

نذیر موچی نے مصنوعی قہقہہ بلند کیا۔

اس کے ساتھ ہی زہراں بائی اندر آ گئی۔

"اچھا یار مَیں ذرا بی بی کے پاس بیٹھتا ہوں تم لوگ کرو باتیں"

اُس نے زہراں کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا اور باہر آ گیا۔

"اسے زیادہ مُنہ نہ لگایا کرو — بڑا گھٹیا انسان ہے۔ اس سے کبھی خیر کی توقع نہ رکھنا۔ ریاست شاہ کے لیے بھی یہ کبھی نہ کبھی آستین کا سانپ ثابت ہو گا میری بات پلّے سے باندھ لینا" —

زہراں بائی نے اُس کے باہر نکلتے ہی دروازے کی کُنڈی لگاتے ہوئے کہا۔

"اپنا کیا بگاڑے گا — ہم سے کیا لے جائے گا"

حنیف خان نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد نوکر رات کا کھانا لے آیا —

کھانے سے پہلے زہراں نے اپنی روایت کے مطابق اُسے شراب بھی پلا دی تھی اب حنیف خان اس کی مکمل گرفت میں تھا۔

رات گئے تک اُس نے حنیف خان کو ہوس کا جھولا جھلایا اور اُس پر مدہوشی سی طاری کر دی۔

یہی مناسب وقت تھا اپنی بات کہہ دینے کا جس کی ہدایت اُسے اپنی "بی بی" کی طرف سے ملی تھی۔

"مَیں اگلے ہفتے تمھارے علاقے میں مجرہ کرنے آ رہی ہوں۔ تم ضرور آنا —"

اُس نے حنیف خاں کے گلے میں باہیں حائل کرتے ہوئے کہا۔

"کہاں ؟"

حنیف خان پر شباب اور شراب کا اکٹھا نشہ طاری تھا۔

"بلوال میں — بھئی اس علاقے کا کوئی بڑا آدمی ایسا نہیں جو تمھاری زہراں بائی کا مجرہ کروانا اپنی عزت نہ سمجھتا ہو"

اُس نے بظاہر بڑی سادگی لیکن دراصل بڑی چالاکی سے اپنی بات کہہ دی۔

لیکن — وہ تو . . . .

"کیا وہ تو — تم نے ضرور آنا ہے حنیف خان۔ اگر تم نہ آئے تو میں بھی وہاں نہیں ناچوں گی۔ میری بات سمجھ گئے ناں — بس مجھے کچھ نہیں پتا نہ مجھے کچھ اُلٹی سیدھی بات بتانا۔ اپنی دوستی دشمنی اپنے پاس رکھو۔ تمھیں اپنی زہراں کے لیے ضرور وہاں آنا ہے — ضرور آنا ہے" —

ہوشیار طوائف زادی نے بڑی چالاکی سے حنیف خان کی بات کاٹ کر اُسے مخمصے میں مبتلا کر دیا۔

اس کے ساتھ ہی وہ حنیف کے حواس پر چھا گئی۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس سے آگے وہ کچھ سوچ بھی سکے۔ بڑی ہوشیاری سے اُس نے حنیف خان کی کمزور رگوں کو ایک ایک کر کے دبایا۔ اُس کی مردانگی کو چیلنج کیا اور اُسے گناہ اور لذّت کی اُس اندھی نگری میں لے گئی جہاں حنیف خان کو ساون کے اندھے کی طرح ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دے رہا تھا۔

صبح تک حنیف خان اُس کا بندہ بے دام بن چکا تھا۔

نتھو خان بدمعاش بستہ الف کا بیٹا حنیف خان جس نے اپنی آنکھ گولیوں کی فائرنگ میں کھولی جس کے لیے مہینے میں دو تین مرتبہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سرحد عبور کرنا اور گولیوں کی بارش میں سرحد پار سے مال ڈنگر کھول کر لانا اُس کا مشغلہ تھا

پولیس اور رینجرز نے اُس کے جسم کی ایک ایک ہڈی پر طبع آزمائی کر کے اُس کی مردانگی کو ٹسٹ کر لیا تھا۔

لیکن —

یہاں ایک گھٹیا درجے کی جسم فروش طوائف نے اُس کی مردانگی کو ایک ہی رات میں ڈھیر کر دیا تھا۔

اُس پر جنسیت کا وہ فسوں پھونکا تھا کہ حنیف خان اس کا بندہ بے دام بن کر رہ گیا تھا۔

اُس نے زہراں بائی سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ ضرور بلوال میں اس کا مجرہ دیکھنے آئے گا خواہ اس کی کچھ بھی قیمت اَدا کرنی پڑے۔

"دیکھنا کہیں یہاں سے جا کر بُزدل نہ ہو جانا۔ حنیف خان تم میری زندگی میں پہلے مرد آئے ہو۔ میں اِسے ایک بہادر مرد کی زبان سمجھوں گی — اور ہاں جب تک تم نہیں آؤ گے میں گانا شروع نہیں کروں گی۔ اگر تم نہ آئے تو خواہ میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں میں نہ ناچوں گی نہ گاؤں گی" —

طوائف نے اُسے مزید پکّا کر دیا۔

"زہراں! یہ مرد کا قول ہے۔ بس اِس سے آگے کچھ نہ کہنا"

حنیف خان نے اُسے کہا۔

صبح ناشتہ کرنے کے بعد دونوں وہاں سے رُخصت ہو گئے۔ روانگی سے پہلے عنایت بی بی نے حنیف خان کی بلائیں ضرورت سے زیادہ ہی لے لی تھیں اور اس کا اچھا خاصا دماغ خراب کر دیا تھا۔



"سردار صاحب — سمجھو کام بن گیا" —

عالم داد نے جو اس وقت سردار رشید کی حویلی میں اُس کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا فون سُننے کے بعد کہا۔

یہ فون اے ایس آئی موج دین کا تھا۔

موج دین اس کے ساتھ ہی پولیس میں سپاہی بھرتی ہُوا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی مدد سے خوب مُنہ کالا کیا تھا اور لاکھوں کی حرام کاری کی تھی۔ عالم داد جس چکر میں پولیس کی نوکری سے جان چُھڑا آیا تھا اُس میں موج دین برابر کا حصّہ دار تھا لیکن اُس نے موج دین کو محفوظ رکھ لیا تھا۔ دونوں کا کاروبار شہر میں مشترکہ تھا جس کا علم موج دین کے محکمے کو نہیں تھا۔

اُس نے موج دین کے ذریعے جو حُسن اتفاق سے اس بازار کے پولیس سٹیشن

یں اے ایس آئی تھا، عنایت بی بی کو اپروچ کیا تھا۔

دونوں شیطان ذہن کے مالک اور شیطانیت میں ایک دوسرے سے دو ہاتھ بڑھ کر تھے۔ اُس نے موج دین کو ساری کہانی سُنا کر سردار رشید کی مستقبل میں اہمیت کا احساس دلانے کے بعد اُس کی مدد سے ہی سارا منصوبہ بنایا تھا۔

موج دین نے اب فون کر کے اُسے بتا دیا تھا کہ اُن کا کام ہو گیا ہے ——!

"عالم داد —— ہاتھ پکا ڈالنا"——

سردار رشید کو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔

"سردار رشید صاحب۔ میرا آپ کا آٹھ سال کا یارانہ ہے۔ آج تک عالم داد نے کون سا ہاتھ کچا ڈالا ہے۔ ماضی میں کبھی میری وجہ سے آپ کو زک نہیں اُٹھانی پڑی نہ ہی مستقبل میں کبھی ایسا ہوگا ——

مَیں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ کو ایم پی اے بنا کر چھوڑوں گا —— ان شاہزوں کی بدمعاشی اب اس علاقے میں نہیں چلے گی —— اور مَیں ہر صورت اپنا وعدہ پورا کروں گا ——

عالم داد نے بڑی مکاری سے جواب دیا۔

"عالم داد —— ہم بھی یاروں کے یار ہیں —— کبھی تمھیں اکیلا نہیں چھوڑیں گے اور خدا رسولؐ کو حاضر ناظر جان کر کے کہہ رہا ہوں کہ اگر مَیں ایم پی اے بن گیا تو دُنیا کی کوئی طاقت تمھیں یونین کونسل کا چیئرمین بننے سے نہیں روک سکتی"——

سردار رشید نے بھی گردن پھُلاتی۔

"سردار صاحب ہم نے بھی کسی مرد سے یارانہ کیا ہے —— اگر فائدے ہی لینے ہوتے تو اللہ کے فضل سے کس بات کی کمی ہے ——"

عالم داد نے دبی دبی زبان سے کہا۔

اُس نے سردار رشید کو بتایا تھا کہ کس طرح زہراں بائی کے ناچ گانے کا بندوبست کیا ہے اور اس کے گانے پر حنیف خان ضرور یہاں آئے گا۔

"مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

سردار رشید نے اپنے مشیرِ خاص سے سرگوشی کے انداز میں پُوچھا۔

"چھوٹے سردار صاحب کو منگنی کی دعوت دینے کے لیے نتھو خان کے ہاں بھیج دیجئے۔ اس بات کا خاص خیال رہے کہ حنیف خان کا وہاں موجود ہونا ضروری ہے——"

عالم داد نے منصوبے کا اگلا حصّہ سمجھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن ——"

"لیکن ویکن کو چھوڑیئے —— سردار صاحب! سیاست میں اگر، مگر، لیکن وغیرہ چلتے رہتے ہیں۔ آپ کو سیاست کا کھیل اس کے مروجہ اصولوں کے ساتھ کھیلنا ہوگا۔ میرا یقین ہے کہ زہراں بائی نے مستقبل کی پیش بندی کے لیے اور ریاست شاہ کے غضب سے بچنے کے لیے حنیف خان کا سہارا ضرور لیا ہوگا —— جب آپ کی طرف سے باقاعدہ دعوت چلی گئی تو باپ بیٹے میں اس مسئلے پر ٹھن جاتے گی۔

سردار صاحب کنجری کا عشق بڑا جان لیوا ہوتا ہے اور حنیف خان اس پر عاشق ہو چکا ہے —— نتھو خان کو اپنے بیٹے کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑیں گے —— ایک مرتبہ اگر وہ آپ کے ہاں کسی تقریب میں آ گیا تو ریاست شاہ آدھی جنگ ہار جائے گا بظاہر اُس کو یہی سمجھانا ہے کہ وہ منگنی کی تقریب میں آیا ہے۔ اس سے سیاست یا ووٹوں کا تعلق نہیں —— بلکہ ہم کیا اُس کا بیٹا ہی اُسے سمجھالے گا ——"

عالم داد نے اپنی بات مکمل کر کے قہقہہ لگایا اور داد طلب نظروں سے سردار رشید کی طرف دیکھا۔

"ویل ڈن —— عالم داد ویل ڈن"——

سردار رشید کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اُس نے اپنے چھوٹے بھائی سردار مرید کو وہیں بُلا کر سارا منصوبہ سمجھا دیا تھا۔

عالم داد نے انھیں اِس بات کی بطورِ خاص تلقین کی تھی کہ سیاست میں کسی بات کا غصّہ نہیں کیا جاتا۔ سرداری آن بان کو قائم رکھنے کے لیے بھی ضروری ہے کہ ایم پی اے

کی سیٹ حاصل کی جائے جس کے لیے ہمیں نھتو خان اور ریاست شاہ کے درمیان
بدگمانی پیدا کرنی ہے۔

"کوئی بات نہیں چاچا ــــ سرداری تو کہیں بھاگی نہیں جا رہی لیکن ایم پی اے
کی گدی اگر ہاتھ سے نکل گئی تو پھر جانے کتنا انتظار کرنا پڑے ــــ"
سردار مرید نے ہنستے ہوئے کہا اور تینوں قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔

اگلے روز سردار مرید عالم داد اور علاقے کے تین چار اور معززین کو ساتھ لے
کر اپنی پجیرو میں نھتو خان کے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔

عقیدت کے شکار

سردار مُرید کی علاقے کے تین چار معززین کے ساتھ آمد نھتو خان کے لیے اس
لیے اچنبھے کی بات تھی کہ سرداروں کو یہ علم ہو چکا تھا کہ نھتو خان نے فضل شاہ سے ہاتھ
ملا لیا ہے اور اگلے انتخابات میں وہ ضرور ریاست شاہ کی حمایت کرے گا ــــ اس کے
دوست اور دشمن دونوں اُس کی اس عادت سے بھی آگاہ تھے کہ نھتو خان زبان کا مرد
ہے اُس نے جو کہہ دیا وہی کر کے دکھائے گا۔ اور ایک مرتبہ زبان دینے کے بعد اس
بات کے امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں کہ وہ اپنی زبان سے پھر جاتے۔

لیکن ــــ

اس بات کا حق تو ہر وقت دوسری پارٹی کے پاس موجود تھا کہ وہ اس سے
رابطہ کر کے اُس کے خیالات بدلنے کی کوشش کرے۔ اور یوں بھی اپنی روایات کے
مطابق وہ گھر آئے دشمن کو بھی واپس نہیں لوٹا سکتا تھا۔ یہ تو اس کے دشمن بھی نہیں تھے۔

اِس بات میں کوئی شک نہیں کہ سرداروں کا بھی اس علاقے کے بہت سے
معززین کی طرح وہی دھندہ تھا جس سے نھتو خان بندھا تھا۔

لیکن ــــ

ایسا آج تک نہیں ہوا تھا کہ اُن کے مفادات آپس میں ٹکرائے ہوں یا کبھی انھوں
نے نھتو خاں کے لیے کوئی مسائل پیدا کیے ہوں۔ وہ اپنے علاقے میں کام کرتے تھے
اور نھتو خان اپنے علاقے میں۔ دونوں کے درمیان ایک خاموش اور شریفانہ معاہدہ
موجود تھا کہ وہ ایک دوسرے کے کام میں مداخلت نہیں کریں گے۔

اپنے ڈیرے پر نتھو خان اور حنیف خان دونوں نے مہمانوں کا استقبال کیا۔
ایک دو شہرے کا حال احوال دریافت کرنے کے بعد گفتگو کا آغاز عالم داد نے
ہی کیا کیونکہ وہی ایک ایسا ماسٹر مائنڈ اُن لوگوں میں موجود تھا جس نے سارا منصو
بنایا تھا۔

"نتھو خان اس علاقے کے سارے مکین آپس میں بھائی ہیں۔ ہمارے ہاں کبھی
کوئی سیاسی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔ میرے خیال سے ہر شخص کو اس بات کا حق حاص
ہے کہ انتخابات میں وہ کسی کی حمایت کرے یا مخالفت ___ تمہیں علم ہوگا کہ سردا
رشید کے بڑے بیٹے کی منگنی ہو رہی ہے کیونکہ سردار صاحب کا یہ پہلا خوشی کا موق
ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ اس خوشی میں برادری اور ارد گرد کے سارے دیہاتو
کے لوگ بھی شرکت کریں۔ ہم سردار صاحب کی طرف سے ان کے بیٹے کی منگنی م
شرکت کی دعوت لے کر آتے ہیں کیونکہ اپنی برادری کے تم ہی سردار ہو اس ل
سردار صاحب کی بھی اور ہماری بھی خواہش ہوگی کہ تم اپنی برادری کے ساتھ اس خ
کے موقعہ پر ضرور شرکت کرو" ___

عالم داد نے اپنی بات مکمل کر کے داد طلب نظروں سے سردار مُرید کی طر
دیکھا جس کی گھنی مونچھوں کے نیچے چھپے ہونٹوں پر مسکراہٹ سانپ کی طرح رینگ
رہی تھی۔

"ہاں بھئی نتھو خاں یہ مقصد ایسا ہے کہ اس میں ہم سب شریک ہوں سرد
صاحب کے گھر پہلی بڑی خوشی ہے اور ہماری سب کی بھی خواہش ہوگی کہ اس
شرکت کریں!"

چوہدری غلام نبی نے جو اُس کے ساتھ والے گاؤں کا نمبردار تھا عالم داد
ہاں میں ہاں ملائی۔

"عالم داد بھائی مجھے آنے میں کیا اعتراض ہوتا۔ ہماری کوئی سردار صا
سے دشمنی تو ہے نہیں لیکن تم جانتے ہو کہ مَیں نے اگلے الیکشن میں ریاست

کی مدد کی ہامی بھر لی ہے اور سردار رشید اس کے خلاف الیکشن لڑ رہا ہے۔ اس
طرح خواہ مخواہ کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو جائے کیونکہ ہم زبان کے بندے ہیں اور آج
تک ہم نے اس علاقے میں صرف عزت ہی کمائی ہے ___"

"دیکھو نتھو خان ہم بھی برادری والے لوگ ہیں۔ سردار مُرید اپنے ساتھ ہم لوگوں
کو اس لیے لایا ہے کہ تم کم از کم ہماری ہی شرم رکھ لو ___ سیاست گئی بھاڑ میں ___
ہمارے علاقے میں کون سی ایسی شادی ہوئی ہے جس میں نزدیک کے دیہاتوں کے
لوگ شریک نہ ہوتے ہوں۔ نتھو خاں تمہیں کم از کم ہمارے یہاں آنے کی لاج ہی
رکھنی چاہیئے اگر سردار مُرید نے کہہ ہی دیا ہے تو تم ہاں کر دو ___ کیوں بیٹا
حنیف خاں ___"

اِس مرتبہ نشانہ تاک کر نمبردار رنگ علی نے تیر چلایا اور عین نشانے پر لگا۔

"ہاں ابّا ___ میرے خیال سے اس میں کوئی اعتراض والی بات تو ہے نہیں"___

حنیف خان کے تو دل و دماغ پر زہراں بائی سوار تھی اُس کے لیے تو جیسے اندھے
کو اچانک دونوں آنکھیں مل گئی تھیں۔

اگر ان لوگوں کی طرف سے دعوت نہ ملتی تو نجانے اُسے پلوال جانے کے لیے
کیا کیا سوانگ بھرنا پڑتا ___

وہ کوئی ایسا عام سا دیہاتی بھی نہیں تھا جسے کوئی یہاں پہچان نہ سکتا۔ نزدیک
دُور کے درجنوں دیہاتوں میں تو اُن باپ بیٹے کو بچہ بچہ پہچانتا تھا۔

نتھو خان کو اُس کی بات نے ہلا کر رکھ دیا۔ نمبردار رنگ علی نے بڑی ہوشیاری
دکھائی تھی اور عالم داد کی گھنی مونچھوں کے نیچے مسکراہٹ چھپائے نہیں چھپتی تھی ___
اس نے تو اپنے تابعدار دوست کی مدد سے اندھیرے میں ہی تیر چلایا تھا۔

لیکن ___

یہ تیر عین نشانے پر لگا تھا۔

"حنیف خاں ابھی بچہ ہے رنگ علی ___ تم نہیں سمجھتے۔ اب حالات پہلے والے

نہیں رہے۔ مَیں ریاست شاہ کو زبان دے چکا ہوں ——— اگر الیکشن کے بعد یہ تقریب ہوتی تو مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔"

نھتو خان نے قدرے تلخی سے کہا ———

"نھتو خاں تم نزدیک دُور کے دیہاتوں میں اپنا نام مقام رکھتے ہو ——— بڑی بڑی پنچایتوں میں تمھیں بُلایا جاتا ہے۔ سردار صاحب بھی اس علاقے کے عزت دار آدمی ہیں۔ اُن کے بیٹے کی منگنی کی تقریب میں تمھارا موجود نہ ہونا بڑی عجیب سی بات ہوگی ——— پلوال کی بڑی بڑی پنچایتوں میں تمھیں بُلایا جاتا ہے پھر اس خوشی کے موقعے پر تمھاری غیر موجودگی کی وجہ سمجھ نہیں آتی ——— دیکھو نھتو خان ہمارے آنے کی شرم رکھو ——— ہم چار بندے آ ہی گئے ہیں تو ہمیں اب ذلیل نہ کرو۔"

عالم داد نے پھر وار کیا۔

"ہاں ابّا ——— چاچا ٹھیک کہتا ہے۔ تمھیں آخر اس میں کیا بُرائی نظر آتی ہے۔"

اِس مرتبہ پھر حنیف خان نے مداخلت کی۔

"چپ کر جا اوئے ——— زبان بند کر اپنی۔ تو کہاں سے اتنا سیانا ہوگیا کہ بُرے بھلے کی تمیز کر سکے ——— تو کیا مجھ سے زیادہ عقل مند ہے" ———

نھتو خان نے اپنے بیٹے کو ڈانٹ دیا۔

یہی عالم داد چاہتا تھا ———

"نھتو خاں ——— بس کر جا بھائی۔ ہم چلے جاتے ہیں۔ ہمیں اپنی بے عزتی گوارہ ہے لیکن خدا نہ کرے ہماری وجہ سے باپ بیٹے کے درمیان کوئی تلخی ہو" ———

علم داد نے بڑی مکّاری سے اگلا حملہ کیا۔

"نھتو خان تجھ سے یہ امید نہیں تھی کم از کم تیس سال کی یاری کی شرم ہی رکھ لیتا۔ تیرے بُرے بھلے وقت میں کام آتے ہیں ——— کبھی تجھ سے منہ نہیں موڑا ——— آج تو ہمارے کہنے پر پلوال نہیں جا رہا ——— اچھا بھئی تیری مرضی ——— لیکن یاد رکھنا تجھے بھی کل کلاں اپنے بیٹے کو بیاہنا ہے اور تیری برادری کے سارے بڑے

پلوال جا رہے ہیں۔ انھوں نے سردار صاحب کی دعوت میں جانے کی ہامی بھر لی ہے ——— نھتو خاں اتنی ضد اچھی بات نہیں ہے" ———

اُس نے عالم داد کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری۔

عالم داد اُس کا مطلب اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔

"چلو بھائیو ——— یہ دن بھی دیکھنا تھا ہمیں ———"

اُس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا نھتو خان جیسے تیری مرضی بھئی ——— ہم تو چاہتے تھے کہ بھائی چارے کی فضا بنی رہے اور ہم ایک دوسرے کی خوشی غمی میں شرکت کرتے رہیں ——— اب اگر ریاست شاہ نے تجھے اتنا بڑا سیاستدان بنا دیا ہے کہ تو اپنی برادری کی بات ہی نہیں مان رہا تو تیری مرضی میاں" ———

سردار مُرید نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"چاچا ——— مَیں سمجھا لوں گا ابّا کو ——— تم لوگ مطمئن ہو کر جاؤ۔ ہم ضرور آئیں گے۔ بھاڑ میں جائے ایسی سیاست اور الیکشن ——— دیکھا جائے گا جب وہ وقت آئے گا۔ ہم آئیں گے ضرور" ———

حنیف خان نے اچانک ہی کہا اور نھتو خاں بھونچکا رہ گیا۔

اُس کے پاس اب ہاں یا ناں کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی۔ حنیف خان نے اُسے عجیب مخمصے میں پھنسا دیا تھا۔

"جیتا رہ بیٹا ——— اللہ تجھے لمبی عمر دے ——— ہمارے یار نے تو یاری کی شرم نہ رکھی۔ تو نے ہماری لاج رکھ لی ———"

نمبردار رنگ علی نے اس کی کمر ٹھونکتے ہوئے کہا۔

سب لوگ اُٹھ کر کھڑے ہوگئے تھے۔

وہ نھتو خان کی مزید کوئی بات سُنے بغیر اس سے اس طرح مصافحہ کر رہے تھے جیسے یہ بات اُس کے بیٹے کے بجائے نھتو خان کے مُنہ سے نکلی ہو اور نھتو خان

ہونقوں کی طرح کبھی اُن کا اور کبھی اپنے بیٹے کا چہرہ دیکھنے لگا جو باری باری اُن سب سے بغل گیر ہو کر انھیں رُخصت کر رہا تھا۔

ریاست شاہ کے اعصاب پر یہ خبر بم کے دھماکے کی طرح پھٹی تھی۔

"اُس دو ٹکے کی کنجری کی یہ ہمّت کہ ہمارے دشمنوں کے ڈیرے پر جا کر ناچ گانا کرے۔ مَیں دیکھوں گا یہ کیسے ہوتا ہے"۔۔۔

اُس نے غُصّے سے کھولتے ہوئے کہا۔

فضل شاہ اور نذیر موچی اُس کے پاس ہی بیٹھے تھے اور نذیر موچی نے اُن دونوں کے سامنے شہر کے سارے واقعات بیان کر دیے تھے۔

"اوتے تُو اُسے لے کر کیوں گیا تھا اُس کے ڈیرے پر۔۔۔ کُتّے کے پلّے بہت عقل مند بنتا ہے تو۔۔۔"

اِس مرتبہ ریاست شاہ نذیر موچی پر برس پڑا تھا۔ جس کے لیے یہ کوئی انہونی صورتحال نہیں تھی۔ وہ اپنی چرب زبانی سے ایسے متعدد مواقع پر شاہ صاحبان کو غچّہ دے چکا تھا۔

"شاہ جی۔۔۔ میری عرض تو سُن لیں میرے بادشاہ۔ اگر غلام کا قصور نکلے تو اس پر دہی ڈال کر کُتّے چھوڑ دینا۔۔۔ میرے بادشاہ! اگر مَیں اُس کی نگرانی نہ کرتا تو اِس بات کا علم میری سرکار کو کس طرح ہوتا۔۔۔ مَیں تو آپ کے دستر خوان کا کُتّا ہوں میرے شاہ جی۔۔۔ مجھے آپ کے مفادات کی ہر وقت فکر رہتی ہے میرے بادشاہ۔ اب ہم کوئی اُپّا (علاج) کر سکتے ہیں۔۔۔ ابھی وقت ہے۔۔۔ اگر وقت کے بعد علم ہوتا تو پھر ہم کیا کر لیتے۔۔۔ میرے بادشاہ سمجھ گئے آپ"

نذیر موچی نے اپنی زبان چلائی۔

"ہاں بھائی صاحب۔۔۔ نذیر کا کیا قصور۔۔۔ اس کی وجہ سے تو ہمیں بات کا علم ہوا۔ مَیں نے خود ہی تو اسے چپکایا ہوا ہے حنیف خان کے ساتھ آپ کے حکم پر"

فضل شاہ نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"ہوں ں ں۔۔۔ کہتا تو سالا ٹھیک ہی ہے۔۔۔ پر یہ ہوا کیسے اوتے"

ریاست شاہ نے بیوقوفوں کی طرح اس کی بات پر صاد کیا۔

"شاہ جی ہونا کیا تھا۔۔۔ ہمیں کیا علم تھا کہ نتھو خان کا ڈکیت بیٹا عاشق مزاج بھی ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے عورتیں آنی جانی چیز ہیں۔۔۔ لیکن خدا جانے اُس زہرہ بائی نے ایک ہی رات میں اُس پر کیا جادو پھُونک دیا جو یہ اُس کے پیچھے دُم ہلاتا پھرتا ہے۔۔۔"

"کچھ بھی ہو فضل شاہ۔۔۔ اوّل تو اُن کا ناچ گانا ہی پنڈال میں نہ ہونے دینا۔ اگر ایسا ہوا بھی تو نتھو خان وہاں نہ جانے پائے۔۔۔ تم نہیں جانتے اس سردار کے بچے کو۔ اُس کے بزرگ ضرور سکھ رہے ہوں گے لیکن وہ بیٹے سے زیادہ مکّار ہے۔۔۔ اُس نے بہت سوچ سمجھ کر یہ چال چلی ہے۔۔۔ اور ہاں تمھارے اندر بھی کوئی آستین کا سانپ موجود ہے۔۔۔ ضرور اُس نے کسی سے بھید لیا ہے کہ تم نے زہرہ بائی کے ذریعے حنیف خان کو قابو کر رکھا ہے۔۔۔ میری بات سمجھے کہ نہیں"۔۔۔

ریاست شاہ نے کہا۔

"یہ بات تو دل کو لگتی ہے شاہ جی۔۔۔ واقعی سوچنے کی بات ہے آخر سرداروں کو کس نے زہرہ بائی تک پہنچایا ہے۔ اس بازار میں اس سے بہتر درجنوں طوائفیں موجود ہیں۔ آخر انھوں نے اُس کا انتخاب کیوں کیا"۔۔۔

نذیر موچی نے ریاست شاہ کے خدشات کی تصدیق کی۔

"دیکھ لیں گے بھائی جان۔۔۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔۔۔ اُن کا مقابلہ بھی ریاست شاہ اور فضل شاہ سے ہے۔۔۔ دیکھوں گا مَیں کہ یہ سب کیسے ہوتا ہے"۔۔۔

فضل شاہ نے اپنی مونچھوں پر اُلٹا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"فضل شاہ یہ سردار رشید کا پہلا حملہ ہے۔۔۔ اگر اُس کا وار کاری پڑا تو ہمیں گرا جائے گا۔۔۔ پہلے حملے ہی کا مُنہ توڑ جواب ملنا چاہیے۔۔۔"

ریاست شاہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی۔ آپ مطمئن ہو جائیں جب تک آپ کا یہ غلام موجود ہے۔ کوئی چال آپ کے خلاف کامیاب نہیں ہونے دے گا"

نذیر موچی نے چمچہ گیری کا مظاہرہ کیا۔

"زیادہ ٹر ٹر نہ کیا کرا دتے ___ دو کوڑی کا کام نہیں کرتا۔ اگر تو اس قابل ہوتا تو یہ نوبت ہی کیوں آنے دیتا ___"

ریاست شاہ نے کمرے سے نکلتے ہوئے اُسے لتاڑا۔

اب وہاں فضل شاہ اور نذیر موچی رہ گئے تھے ___

"نذیرے ایک بات یاد رکھنا جس روز سردار رشید الیکشن جیت گیا۔ اگلے دن وہ ساری فائلیں کھل جائیں گی جو ہم نے پولیس کو کہہ کر دبا رکھی ہیں ___ اور تو جانتا ہے کہ لڑکی کے اغوا کا کیس کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ تو نے پولیس کے دو جوتے نہیں کھانے اور یہ بھی بک دے گا کہ تو نے اُسے کہاں لے جا کر فروخت کیا تھا ___ میری بات سمجھ گیا ہے ناں ___ تیری بقا بھی ریاست شاہ کی کامیابی میں ہے اور میری بھی ___ مَیں بھی تب ہی یونین کونسل کا چیئرمین بن سکوں گا ___ نذیرے ایک مرتبہ اگر مَیں یونین کونسل کا چیئرمین بن گیا ناں ___ تو یاد رکھنا کہ ارد گرد کے پچاس دیہات پھر ہمارے ہو گئے ___ اور تیرے لیے تو وہاں بہت مال موجود ہو گا ___ ہے ناں ___"

فضل شاہ نے سگریٹ کا کش لگا کر دھواں اُس کی طرف اُچھالتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی آپ مائی باپ ہیں۔ ہم کمّی کمینوں کی عزت آپ ہی کے دم قدم سے ہی تو ہے اور پھر آپ کی خدمت میں ہی تو۔۔۔"

"ہماری بات چھوڑ دے ___ سمجھا کہ نہیں۔ ہم تو اپنا آپ بچا لیں گے کسی نہ کسی طرح ___ نذیرے ہاتھی مُردہ بھی ہو تو سوا لاکھ کا ہوتا ہے ___ گزشتہ تیس پینتیس سال ___ اگر اس گاؤں میں پولیس داخل نہیں ہوئی تو آئندہ بھی ایسا نہیں ہو گا۔ تو بس اپنی فکر کر ___ اور ایسے حالات نہ پیدا ہونے دینا کہ بڑے شاہ صاحب الیکشن ہار جائیں۔

نذیرے اس الیکشن میں دونوں طرف سے اگر کوئی پارٹی نمایاں کردار ادا کرے گی تو وہ نتھو خان ہے ___ جس طرف وہ جھک گیا وہی پلڑا بھاری پڑے گا اور وہ جھکے گا ہماری طرف ___ ورنہ ہم۔۔۔۔"

فضل شاہ نے اُس کی بات کاٹ کر اپنی بات اُدھوری چھوڑ دی۔

"شاہ جی ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی ہے ___"

نذیر موچی کے ذہن میں اچانک ہی ایک کوندا سا لپکا تھا۔

"کیا۔؟"

فضل شاہ نے بیقراری سے پوچھا۔

"اگر آپ اِس مجرے سے ایک روز پہلے ہی نتھو خان کو یہاں لے آئیں کسی بھی بہانے سے اور الیکشن مہم میں مصروفیت کے بہانے ایک دو دن یہیں اُلجھائے رکھیں تو وہ پلوال نہیں جائے گا"___

نذیر موچی نے تجویز پیش کی۔

"بات تو تیری ٹھیک ہے نذیرے"___

فضل شاہ نے سوچتے ہوئے کہا ___ "لیکن اُس کا بیٹا ___ کہیں وہ۔۔۔۔"

فضل شاہ ابھی تک مشکوک تھا۔

"شاہ جی ___ پہلے ایک کام تو ہونے دیں ___ اُسے بھی دیکھ لیں گے۔ مَیں کوشش کروں گا کہ یہ مجرہ ہی نہ ہونے پائے ___ زہرہ بائی وہاں جا ہی نہ سکے"۔

نذیر موچی نے چڑتے ہوئے کہا۔

"تم کوشش نہیں کرو گے۔ ایسا ہونا چاہیے ___ اور ہاں تم کل ہی نتھو خان کو شاہ صاحب کی طرف سے پیغام پہنچا دو کہ اگلے روز ہم الیکشن سے متعلق خصوصی میٹنگ کر رہے ہیں جس میں باپ بیٹے کی موجودگی ضروری ہے ___"

فضل شاہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے مائی باپ ___"

اگلے روز وہ ریاست شاہ کا پیغام لے کر جب نھتو خان کے ڈیرے پر پہنچا تو حویلی میں نھتو خان موجود نہیں تھا۔ اُس کے بیٹے حنیف خان نے نذیرے کا استقبال کیا۔

"یار ایک آدھ ملاقات آج کل میں اور نہیں ہو سکتی" ——

حنیف خان نے اس کا حال احوال دریافت کرنے کے فوراً ہی بعد اپنی فرمائش ڈال دی۔ نذیر موچی تلملا کر رہ گیا۔ اُس نے اندازہ لگا لیا کہ اِس مجنوں پر ہوس کا بھوت کچھ زیادہ ہی سوار ہو گیا ہے اور یہ تمام مصلحتیں ایک طرف رکھ کر ضرور ریلوال پہنچے گا خواہ اس کو اپنے باپ ہی سے کیوں نہ ٹکرانا پڑے ——

نذیرے کی جان بڑے عذاب میں پھنس گئی تھی ——

فضل شاہ نے اُس کے کندھے پر جو بوجھ لاد دیا تھا اس نے نذیر موچی کی کمر دہری کر دی تھی۔ اُس نے کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ اِس بات میں کوئی شک نہیں کہ فضل شاہ ایک طرح —— اُس کے ہر جرم میں برابر کا شریک تھا کیونکہ اس نے اردگرد کے دیہاتوں سے جتنی لڑکیوں کو اغوا کر کے بازارِ حسن تک پہنچایا تھا۔ اُن میں سے کوئی ایسی نہیں تھی جسے سب سے پہلے اس نے فضل شاہ کے بستر کی زینت نہ بنایا ہو —— گو کہ اُس نے یہ ساری حرام کاریاں حفظِ ماتقدم کے طور پر کی تھیں اور فضل شاہ کی ہوس کی آگ گزشتہ دس سال سے مسلسل بجھاتا آ رہا تھا۔

لیکن ——

اُس کی جان بچانے کے لیے یہ سب کچھ کافی نہیں تھا۔

عین ممکن تھا کہ اگر ریاست شاہ الیکشن ہار جاتا اور پولیس دبے ہوئے کیس دوبارہ کھول دیتی تو فضل شاہ اُسے پہچاننے سے بھی انکار کر دے۔

کم از کم نور پور گاؤں سے اُس نے حال ہی میں جس لڑکی کو ورغلا کر اغوا کیا اور پھر اُسے عنایت بائی کے ذریعے ملک کے ایک بڑے شہر کے بازارِ حسن تک پہنچا دیا تھا کہ مکین اس کی ضرور تکا بوٹی کر ڈالتے ——

اس نے یہاں بسنے والی ایک غریب قوم کی بیٹی کے ساتھ ظلم کیا تھا اور یہ

فضل شاہ ہی تھا جس نے نور پور کے ان غریبوں کو مقامی چوہدریوں کی مدد سے دبا رکھا تھا ورنہ وہ تو شہر میں جلوس لے کر جا رہے تھے کہ مقامی تھانے دار ملزم کو گرفتار نہیں کر رہا جبکہ انھوں نے اپنی لڑکی کے اغوا کا پرچہ درج کرواتے ہوئے اُس میں نذیر موچی کو ملزم نامزد کیا تھا۔

آج کل تو یوں بھی ملک میں "سپیڈی کورٹس" چل رہی تھیں اور ایسے کیس عموماً خصوصی عدالتوں ہی میں جاتے تھے۔

نھتو خان کے گاؤں کی طرف آتے ہوتے وہ چشمِ تصور میں جب خود کو ٹکٹکی سے بندھے دیکھتا اور سوچتا کہ کس طرح کوڑے اس کی کمر پر برس رہے ہیں تو اس پر اس تصور ہی سے لرزہ طاری ہونے لگتا ——

اُس کی بقا واقعی ریاست شاہ کی کامیابی میں تھی اور اگر حنیف خاں سردار رشید کے قابو آ جاتا تو دُنیا کی کوئی طاقت اُسے جیتنے سے نہیں روک سکتی تھی کیونکہ نھتو خان کی سب سے بڑی کمزوری اس کا اکلوتا بیٹا ہی تھا جس کے لیے وہ اپنے ہر اصول کو قربان کر سکتا تھا۔

"یار ذرا صبر سے کام لے —— اس طرح معاملہ ایک مرتبہ بگڑ گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے —— طوائف کی یاری بڑی سوچ سمجھ سے نبھائی جاتی ہے۔ اُس نے یہاں آنا تو ہے —— وہاں سے اُسے اپنے گاؤں میں ایک رات کے لیے لے آنا" ——

نذیرے نے اپنی جان چھڑانے کے لیے کہہ دیا۔

"لیکن اس کی ماں مان جائے گی" ——

حنیف خان کی رال ٹپک رہی تھی۔

"مانے گی کیوں نہیں —— پانچ دس ہزار دے کر اُس کا مُنہ بند کر دیں گے۔ حنیف خان وہ طوائف زادی ہے —— اِس شہر کی مشہور طوائف کی بیٹی۔ دولت کمانا ان لوگوں کی زندگی کا سب سے پہلا اور آخری مشن ہے اور عنایت بائی کے لیے ہاتھ آئی مایا چھوڑ دینا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنے ہاتھوں خود کو گولی مار لے —— میری

بات سمجھ گئے ناں ــــ ذرا صبر اور حوصلے سے کام لو اور ہاں چاچا کدھر ہے" ــــ

اُس نے جل بھن کر لیکن بظاہر بڑے نارمل لہجے میں کہا ــــ

"ٹھیک ہے یار تیرے ہوتے ہوتے مجھے فکر کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے ــــ ہاں اباّ کو ــــ خیریت تو ہے ناں" ــــ

حنیف خان نے سر راہے چلتے چلتے پوچھ لیا۔

"کل ریاست شاہ بڑی اہم میٹنگ کر رہا ہے ــــ اس میں تم لوگوں کو بُلایا ہے۔ بھئی اب تمھاری مرضی کے بغیر وہ کوئی میٹنگ تو نہیں کر سکتا ناں ــــ اب تو تم سرداروں کے مقابلے میں اس کے سب سے بڑے حلیف بن چکے ہو ــــ"

نذیر موچی نے مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔

لیکن اتنی جلدی کیا ہے ــــ ابھی تو الیکشن ہونے میں پورا ایک مہینہ پڑا ہے" ــــ

حنیف خان نے ذرا خشکی سے لہجے میں کہا۔

"ارے یار میرے تُو سیاست کی ہیرا پھیریاں نہیں سمجھ سکتا ــــ تو سیدھا سیدھا مرد ہے۔ دلیر آدمی ہے۔ سامنے سے حملہ کرنے والا۔ تجھے ابھی ان باتوں کی سمجھ نہیں آئے گی پھر تجھے اس سے کیا لینا دینا۔ ایک مہینہ رہ گیا ہے یا ایک سال ــــ جا تو چاچے کو بُلا لا ــــ"

نذیر موچی گھبرا گیا تھا۔

"سلام علیکم ــــ سُنا بھئی نذیرے کیا حال ہے"

اچانک ہی سامنے والے دروازے سے نتھو خاں اندر آ گیا تھا۔

نذیر موچی کی جان میں جان آ گئی۔ اُسے تو اب یہ خوف دامن گیر ہونے لگا تھا کہ شاید حنیف خان اپنے باپ تک شاہ صاحب کا پیغام ہی نہ پہنچنے دے۔

"ٹھیک ہوں چاچا ــــ شاہ صاحب نے بطورِ خاص تمھارے پاس بھیجا تھا۔ سلام کہا ہے"

اُس نے اپنی آمد کا مقصد نتھو خاں کو سمجھا دیا۔

اور ــــ

نتھو خاں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اُس کا ذہن بعینہٖ وہی بات سوچ رہا تھا جو فضل شاہ اور ریاست شاہ ہی نے سوچی تھی۔

نتھو خاں بڑا با اصول آدمی تھا۔ اُس نے اس علاقے میں تیس سال بدمعاشی کی تھی لیکن اپنے اصولوں کے ساتھ۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ وہ کسی کو زبان دے کر مُکر گیا ہو۔ وہ مر تو سکتا تھا لیکن اپنی زبان سے پھر نہیں سکتا تھا اور اب حالات اچانک اس طرح پلٹا کھا گئے تھے کہ اُسے اپنی ساری عمر کی ریاضت خاک میں ملتی دکھائی دے رہی تھی ــــ

نتھو خاں کو اصل صورت حال کا تو علم نہیں تھا کہ اُس کا صاحبزادہ ہی طوائف کو دل دے بیٹھا ہے۔ اُسے تو صرف یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اگر حنیف خان اس کی مرضی کے برعکس بلوال چلا گیا تو اس کی عزت خاک میں مل جائے گی۔

ریاست شاہ اچھا تھا یا بُرا۔ اس سے اُسے بحث نہیں تھی۔ اُن لوگوں نے اُسے زبردستی اپنے ساتھ نہیں ملایا تھا۔ اُسے دوستی کی باقاعدہ قیمت ادا کی تھی۔ علاقے کے تھانیدار سے اِس کی عزت کروائی تھی۔ اور اُس کی اگلی زندگی کو تحفظ دیا تھا۔

نتھو خاں اب سرحد پار کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

وہ اکلوتے بیٹے کا باپ تھا اور اُس کی خواہش اب صرف یہی تھی کہ جتنی جلدی ممکن ہو اپنی بہن کی بیٹی کو بیاہ کر گھر لے آتے۔ اُس کا خاندان بڑا مختصر تھا۔ ایک بہن تھی جو جوانی میں بیوہ ہو گئی۔

لیکن ــــ

کیا مجال جو اس نے کبھی نتھو خاں کی غیرت پر آنچ آنے دی ہو۔ قرآن شریف پڑھی ہوئی تھی۔ بچوں کو قرآن پڑھا پڑھا کر اپنی بیٹی جوان کر لی۔ وہ بھی نتھو خاں کے گاؤں ہی میں رہتی تھی اور اب شاید اس انتظار میں زندہ تھی کہ کب اپنی اکلوتی بیٹی رضیہ کے ہاتھ پیلے کرے۔

نھتو خان نے بھی سمجھا تھا شاید عمر کے آخری حصّے میں اللہ تعالیٰ نے اس کی [illegible]
قبول کر لی ہے اور اب وہ باقی زندگی اطمینان سے گزار دے گا۔ اس کی زندگی کی
اب بیٹے کی شادی کے علاوہ اگر کوئی خواہش تھی تو صرف یہ کہ اپنی بیوی اور بہن کے
ساتھ حج کر آتے لیکن رضیہ کی شادی کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا۔

نھتو خان نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ الیکشن کے خاتمے پر وہ اپنے بیٹے کی دھوم دھام
سے شادی کروا دے گا۔ اسی درمیان وہ ریاست شاہ کی مدد سے پولیس کے ریکارڈ
سے اپنا اور اپنے بیٹے کا نام خارج کروانا چاہتا تھا تاکہ اس کی موت کے بعد بھی پولیس
والے ماضی کی طرح غنڈہ ایکٹ کی آڑ میں اس کے بیٹے کو تنگ نہ کر سکیں۔

ریاست شاہ کی طرف سے یہ دعوت ملنے پر نھتو خان نے خدا کا شکر ادا کیا کہ
اس طرح کم از کم اُسے مصروفیت کا بہانہ مل جائے گا اور اس کا بھرم رہ جائے گا۔

"ٹھیک ہے نذیرے تُو روٹی پانی کھا پی ——— مَیں انشاءاللہ کل صبح ہی حنیف خان
کے ساتھ پہنچ جاؤں گا۔"

اُس نے نذیر موچی سے کہا۔

نذیر موچی نے تب یہی سوچا تھا کہ شاید ملاٹل گئی ہے اور اب اُس کی جان [illegible]
جائے گی۔ اپنی دانست میں بھی اس طرح کہ وہ خوش و خرم فضل شاہ کو یہ خوشخبری
سُنانے پہنچا تھا۔

"ٹھیک ہے ——— اب تم ہر ممکن کوشش کرو کہ عنایت باتی اپنی بیٹی کو پلوال [illegible]
لے کر جائے۔ اُسے جتنی رقم بھی دینی پڑے فی الحال دے کر روک لو ——— اس کے
پھر اُس سے نمٹتے رہیں گے۔" ———

فضل شاہ نے اگلا حکم سُنا دیا ———

"لیکن شاہ جی ——— جب نھتو اور اس کا بیٹا یہاں آجائیں گے ——— پھر تو [illegible]

"زیادہ بک بک نہ کیا کر ادئے۔ ریاست شاہ کا حکم ہے کہ عنایت
اور اس کی بیٹی پلوال نہ جائیں تو وہ نہیں جا سکیں گی ——— سمجھ آگئی میری بات کہ [illegible]

فضل شاہ نے اس کی بات کاٹ کر اُسے ڈانٹ دیا۔

نذیر موچی کو زندگی میں آج شدّت سے اِس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ اس
کی حیثیت تو وقتی استعمال کی کسی شے سے زیادہ کچھ بھی نہیں، فضل شاہ سے اُسے کم از کم
یہ امید نہیں تھی کہ وہ اس طرح وقت آنے پر آنکھیں پھیر لے گا اور اُس کے ساتھ یہ سلوک
کرے گا۔

"ٹھیک ہے شاہ جی۔ نوکر کیا اور نخرہ کیسا؟"

نذیر موچی نے کہا۔

اُس نے دل ہی دل میں بڑا خطرناک منصوبہ بنا لیا تھا ———

اُسے صاف دکھائی دے رہا تھا کہ شاہ صاحبان وقت آنے پر اس کی قربانی دینے
سے بھی ہرگز دریغ نہیں کریں گے۔

نذیر موچی کو سمجھ آگئی تھی کہ اُس کا بُرا وقت آنے والا ہے۔ اِس علاقے میں اُس
کے جرائم کے ایسے ایسے ثبوت موجود تھے کہ وہ اگلی ساری زندگی جیل کی سلاخوں سے
باہر نہ آسکتا اور اس کی اس کمزوری پر فضل شاہ جب چاہتا آسانی سے بلیک میل
کر سکتا تھا۔

"فضل شاہ ——— میں تو نہیں چاہتا تھا کہ تمہارے ساتھ غدّاری کروں لیکن پہل
تم نے کی ہے۔ مَیں تمہیں بتا دوں گا کہ چیونٹی وقت آنے پر ہاتھی پر بھاری پڑتی ہے۔
تُو نے خود کو کیا سمجھ رکھا ہے" ———

اس نے دل ہی دل میں کہا پھر فضل شاہ سے گویا ہوا۔

"شاہ جی بیس ہزار تو اُسے ایڈوانس ملے ہیں۔ تیس چالیس ہزار سے ہی مُنہ
بند کر سکوں گا اس کا۔ میرا وعدہ رہا کہ الیکشن کے اگلے ہی روز یہ ساری رقم معہ سود آپ
کو واپس کر دوں گا" ———

"نذیرے۔ تو رہا موچی کا موچی۔ تو کے بجٹے [illegible] اگر [illegible]
لگیں تو ہم نے [illegible] ——— تم [illegible] ——— [illegible]

وقت کو ٹال دو — اس کا اگر کوئی باپ بھی تھا تو وہ بھی ہمیں خود رقم واپس لوٹا جائے گا۔ یہ ہمارا کام ہے۔ تم اپنا کام کرو —"

فضل شاہ کچھ زیادہ ہی ترنگ میں آگیا تھا۔

○

پچاس ہزار روپیہ فضل شاہ نے اپنے ہاتھ سے گن کر نذیر موچی کے حوالے کر دیا تھا —

"آج ہی نکل جاؤ — وقت کم ہے۔ کل صبح تک ہمیں خوشخبری مل جانی چاہیے۔ میں رات کو تمہارے ٹیلی فون کا انتظار کروں گا۔ اگر صبح تک بات نہ بنی تو پھر ہمیں کوئی سخت ایکشن لینا پڑے گا۔ تم ریاست شاہ کے غصے کو جانتے ہو — اور یہ بھی یاد رکھنا کہ سیاست میں کوئی کسی کا مائی باپ نہیں ہوتا — ہمیں اپنی عزت اور اسمبلی کی سیٹ بچانے کے لیے اگر اپنے کسی ملازم کی قربانی بھی دینی پڑے تو ریاست شاہ اس سے دریغ نہیں کرے گا۔ میری بات تم سمجھ گئے ناں —"

فضل شاہ نے پگھلتا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی آج تک آپ کا یہ غلام کبھی ناکام واپس نہیں لوٹا — اب ایسا کیوں ہو گا۔ آپ مطمئن رہیں۔ شاہ جی — بالکل اطمینان رکھیں آپ کو رات فون پر ہی اطلاع مل جائے گی" —

نذیر موچی نے مکاری سے دانت نکالے۔

"ٹھیک ہے اللہ بیلی" —

فضل شاہ نے اُسے ہاتھ سے اشارہ کیا اور نذیر موچی اُس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور باہر آگیا۔

پچاس ہزار روپیہ اُس نے حسب معمول کینوس کے ایک معمولی سے تھیلے میں ڈال لیا تھا اور کسی کو احساس ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ اُس کے پاس اتنی رقم بھی ہو سکتی ہے۔

اصولی طور پر تو اُسے یہاں سے نزدیکی بس سٹینڈ تک جانا تھا جہاں سے وہ بس

لے کر شہر تک جاتا —

لیکن —

نذیر موچی یہاں سے سیدھا اپنے گھر گیا تھا اُس کے گھر میں رکھا ہی کیا تھا۔ ساری زندگی اُس نے عیش و عشرت کی نذر کر دی تھی۔ بیوی لڑ کر چار پانچ سال پہلے میکے چلی گئی تھی اور آج تک واپس نہیں آئی تھی۔ اُس نے پچھلے سال ہی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔

نذیر موچی نے فضل شاہ کی معیت میں رہ کر اگر اور کچھ نہیں کیا تھا تو بڑے بڑے خواب ضرور سجا لیے تھے اس کی خواہش تھی کہ وہ گاؤں چھوڑ کر دوسرے شہر میں جا بسے اور باقی زندگی بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے رئیسوں کی طرح گزار دے۔

اس مقصد کے لیے اُس نے شہر کے ایک بینک میں اکاؤنٹ کھولا تھا جس کا علم سوائے اس کے یا خدا کی ذات کے اور کسی کو نہیں تھا۔ نذیر موچی نے یہاں ڈیڑھ دو لاکھ روپے کی رقم جمع کر لی تھی۔ شاید وہ ذہنی طور پر اس بُرے وقت کی تیاری کر رہا تھا۔ آج اسے اپنے فیصلے پر خود کو شاباش دینے کو دل چاہتا تھا۔

اپنے گھر سے جو دراصل میں فضل شاہ ہی کی حویلی کا ایک حصہ تھا اس نے اپنا بیگ لیا اور اسے کپڑوں سے بھر کر گاؤں سے باہر آگیا۔ یہ بیگ اُس نے ملحقہ گاؤں میں اپنے ایک دوست کے پاس رکھا اور اگلے گاؤں کا راستہ لیا۔

حمیدا اُسے گاؤں کے باہر حویلی پر ہی مل گیا۔

حمیدا مقامی سمگلر اور فضل شاہ کا ساتھی تھا۔

فضل شاہ نے اپنے اس نوعیت کے گھناؤنے کاموں میں نذیرے کو اپنا ہمراز بنا رکھا تھا۔ آج تک نذیرا ہی حمیدے کے پاس مال لایا اور لے جایا کرتا تھا۔ فضل شاہ اس کا ساتھی ضرور تھا۔

لیکن —

"اُس کی حیثیت "سلیپنگ پارٹنر" کی سی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس کے تمام مفادات کی نگرانی نذیر موچی ہی کرتا تھا۔ فضل شاہ کا صرف اتنا کام تھا اپنا آدھا حصّہ نذیرے کے ذریعے وصول کر لیا کرے اور پولیس کچہری میں اس کی مدد کرے ——

مقامی تھانے دار کو علم تھا کہ حمیدا فضل شاہ کا آدمی تھا اور انھیں باقاعدگی سے اپنا حصّہ مل جایا کرتا تھا اِس لیے انھوں نے کبھی حمیدے کو تنگ نہیں کیا تھا۔ فضل شاہ مال سرحد کے دوسری طرف پہنچانے کے لیے کسی نہ کسی پکٹ پر اپنا کوئی شکار تلاش کر رہا ہوتا تھا۔ جن کو حصّہ بخرہ دے کر وہ حمیدے کا مال پار پہنچا دیا کرتا تھا۔

ایسے تین چار اور گورکھ دھندے بھی اُس نے اس علاقے میں پھیلا رکھے تھے جنھیں ریاست شاہ سے پہلے بڑے شاہ صاحب کی بھی مکمّل پشت پناہی حاصل رہی تھی۔

فضل شاہ کا خاص ہرکارہ ہونے کے سبب نذیر موچی اُس کے اور ان گورکھ دھندوں کے "درمیانی آدمی" کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ حمیدے کے لیے نذیر موچی کی حیثیت وہی تھی جو فضل شاہ کی ہو سکتی تھی کیونکہ فضل شاہ نے اس کا تعارف اس حیثیت سے کروایا تھا۔ لاکھوں روپے وہ حمیدے سے لے جاتا اور اُسے فضل شاہ سے لا کر دیا کرتا تھا۔

"آ بھئی نذیرے —— خیر ہے کیا حال ہے تیرا" ——

حمیدے نے اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی کہا۔

"یار ایک ایمرجنسی آ گئی ہے۔ شاہ صاحب نے فوراً دو لاکھ روپے کا بندوبست کرنے کے لیے کہا ہے —— دراصل ایک سودا ——"

لیکن ابھی تین روز پہلے ہی تو ایک لاکھ لے گیا تھا۔ میرے پاس اتنی زیادہ رقم دو تین روز تک نہیں آ سکتی —— خیر ہے —— شاہ صاحب کو کیا ضرورت آن پڑی" ——

حمیدے نے قدرے حیرانگی سے پوچھا۔

"حمیدے یار تجھے تو علم ہے بڑے شاہ صاحب الیکشن میں حصّہ لے رہے ہیں۔ دوسری طرف پلوال والے سردار اچانک مقابلے پر آ گئے ہیں اور بالکل اچانک —— پارٹی دوسری تگڑی ہے۔ بس یار ان بڑے لوگوں کے اپنے ہی دھندے ہوتے ہیں —— ایک سرکاری

جیپ آئی ہوتی ہے شاید کوئی سودے بازی ہو رہی ہو گی تو جانتا ہے شاہ صاحب پیسے کی پرواہ نہیں کرتے —— ان کے لیے اپنی عزت اور اپنے بندے کی اہمیت دولت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے" ——

نذیر موچی نے تمہید باندھی۔

"میں بھی سوچ رہا تھا کہ آج کل شاہ صاحب اتنا کیش منگواتے ہیں" ——

حمیدے نے خود ہی بیوقوفوں کی طرح اپنے شک کا جواز بھی تلاش کر لیا۔

"ہاں یار —— تو ذرا جلدی کر دے۔ مجھے بس فوراً ہی جانا ہے —— ابھی شہر بھی واپس جانا ہے۔ آج کل تو میرا ایک قدم گاؤں میں اور دوسرا شہر میں ہوتا ہے ——"

نذیر موچی نے تیزی کا مظاہرہ کیا۔

"یار گھنٹہ دو گھنٹے دے دے۔ ابھی میرے پاس اتنا کیش نہیں ہے۔ غفورے کی طرف اپنا آدمی بھیج کر منگوا لوں گا" ——

حمیدے نے کہا۔

"ابھی کتنا بندوبست کر سکتا ہے ——"

نذیرے نے بے چینی سے دریافت کیا۔

"ایسے تو مشکل ایک لاکھ روپیہ ہو گا۔ وہ بھی اتفاق سے کل ایک سودا ہو گیا تھا اور شہر والی پارٹی خود آ کر مال لے گئی ہے" ——

حمیدے نے وضاحت کی ——

"اچھا یار —— تُو مجھے فوراً ایک لاکھ دے اور جتنی جلدی ممکن ہو۔ باقی ایک لاکھ لے کر فضل شاہ کی باہر والی حویلی پر پہنچ جا —— خیال رہے کہیں گھر نہ پہنچ جانا ——"

نذیر موچی نے کہا ——

"بہ تیری بات ٹھیک ہے —— اچھا ابھی لایا ——"

حمیدے نے گدھوں کی طرح سر ہلایا اور اسے انتظار کرنے کا کہہ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا اس کی واپسی بمشکل تین چار منٹ بعد ہی ہو گئی تھی ——

"یہ لے یار نوٹے ہزار روپیہ ہے۔ گن لے ——"

حمیدے نے ایک رومال میں لپٹے نوٹ اس کی طرف بڑھاتے۔

"یار گننے کا وقت کہاں ہے —— تُو جتنی جلدی ہو سکے باقی رقم لے کر آجا"

یہ کہتے ہوئے نذیر موچی نے اپنے ہاتھ میں پکڑے کینوس کے تھیلے میں وہ نوٹ کپڑے سمیت اُنڈیلے۔

"یہ دیکھ ایک اور پارٹی سے پچاس ہزار لے کر آیا ہوں —— شام تک شاہ جی کو تین لاکھ پورے کر کے دینے ہیں" ——

اُس نے حمیدے کے سامنے تھیلے کا منہ کرتے ہوئے کہا۔

حمیدے نے تھیلے میں موجود نوٹوں پر ایک چھچھلتی نظر ڈالی اور مطمئن ہو کر سر ہلا دیا۔ اگر اس کے دل میں کہیں کوئی واہمہ بھی تھا تو وہ اب نکل چکا تھا۔

واقعی شاہ صاحب کو اچانک ضرورت آن پڑی تھی۔

"چلا جاتے گا یا کوئی رائفل والا ساتھ کر دوں" ——

"خدا کا نام لے یار —— میرا اپنا طریقہ ہے کام کرنے کا —— یہ گولیاں بندوقیں والے کام تمھیں اور شاہ صاحب کو ہی زیب دیتے ہیں۔ مَیں تو سیدھا سادا بندہ ہوں۔ تُو بے فکر رہ۔ یہاں کے تو اینٹ پتھر شاہ صاحب کے تابعدار ہیں۔ میری طرف کسی نے میلی آنکھ سے دیکھ کر مرنا ہے کیا"؟

یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"اچھا بھائی حمید اللہ بیلی —— رقم ذرا جلدی پہنچا دینا"۔

اُس نے جاتے ہوئے کہا۔

"یار تُو بے فکر رہ —— شاہ صاحب کا حکم پورا ہو گا" ——

حمیدے نے چاپلوسی سے کہا۔

○

قریباً دو گھنٹے بعد جب حمیدا رقم لے کر فضل شاہ کی باہر والی حویلی پر پہنچا تو فضل شاہ

کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔ چونکہ یہ خاصا خفیہ معاملہ تھا اس لیے حمیدا دم سادھے بیٹھا رہا نہ ہی کسی نے اُس سے آمد کا مقصد دریافت کیا۔

اس حویلی پر فضل شاہ کے خاص نوکر ہی ہوا کرتے تھے اور انھیں علم تھا کہ یہاں آنے والی کوئی بھی ہستی معمولی نہیں ہو سکتی۔ انھیں مہمان کی صرف خدمت کرنے کا حکم تھا۔ اُس سے پوچھ گچھ کی اجازت نہیں تھی۔

حمیدے کو رہ رہ کر افسوس ہو رہا تھا کہ اُسے دیر ہو گئی۔ کہیں فضل شاہ غصے ہی نہ ہو جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے لیے قیامت آجاتی کیونکہ اُس کا اگر کوئی دھندہ چل رہا تھا تو صرف فضل شاہ کی وجہ سے۔ یہ فضل شاہ ہی تھا جس نے حمیدے جیسے معمولی سے چور کو علاقے کا با اثر سمگلر اور دو مربع اراضی کا مالک بنا دیا تھا۔

فضل شاہ کی آمد دو گھنٹے بعد ہوئی۔ حمیدے کو دیکھ کر پہلے تو اُسے غصّہ آ گیا پھر حیرت ہونے لگی کہ یہ یہاں کیوں آ گیا۔

فضل شاہ کا اپنا طریق واردات تھا اور وہ عموماً پس پردہ رہ کر کام کرنے کا عادی تھا۔ اس کے تمام جرائم پیشہ ساتھی اِس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ فضل شاہ کسی کا اس طرح منہ اُٹھا کر ڈیرے پر چلے آنا ہرگز پسند نہیں کرتا تھا۔

"تم یہاں —— تھیں کس نے کہا تھا آنے کے لیے ——"

فضل شاہ نے اس کے سلام کو نظر انداز کرتے ہوئے بڑے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"شاہ جی۔ میری کیا مجال ہے کہ آپ کے حکم کے بغیر اس گاؤں کی حدود میں بھی قدم رکھوں۔ مَیں تو نذیرے کے . . . ."

"کیا کہا تھا نذیرے نے ——؟"

فضل شاہ کو اچانک جھٹکا سا لگا۔ اُس نے فوراً ہی حمیدے کی بات کاٹ دی۔

"شاہ جی اُس نے کہا تھا ایک گھنٹے کے اندر بقایا رقم لے کر آپ کی خدمت میں پہنچ جاؤں بڑی ایمرجنسی ہے۔ مَیں نے تو مال بھی سستے داموں اُٹھا دیا ہے" ——

حمیدے نے احتجاجی انداز میں کہا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو ___ تمھارا دماغ تو درست ہے۔ کوئی نشہ تو نہیں کر

فضل شاہ کو واقعی غصہ آنے لگا تھا۔

حمیدے نے جواب میں قسمیں کھائی اور کلمہ شریف پڑھنا شروع کر دیا اور اُسے ساری واردات بتادی۔

جوں جوں وہ اپنی بپتا سُنا رہا تھا۔ توں توں فضل شاہ کا پارہ چڑھ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے ___ تُو رقم دے اور چلا جا اور آئندہ جب بھی وہ آئے بٹھا کر مجھے اطلاع کر دینا" ___

فضل شاہ نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا ___

اُسے فوراً سمجھ آگئی کہ نذیر موچی اُس کے ساتھ ہاتھ کر گیا ہے۔

لیکن ___

"اُس کی یہ ہمت" ___

فضل شاہ نے دانت پیستے ہوئے خود سے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی مَیں سمجھا نہیں ___ کیا نذیرا ___"

"ہاں ___ اُس حرام زادے نے اپنی اوقات دکھائی ہے۔ حمیدے اپنے بندے دوڑا دو۔ مجھے آج رات تک وہ زندہ یا مُردہ ہر حالت میں چاہیئے" ___

فضل شاہ نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میرے مولا ___ یہ کیا غضب ہو گیا ___ شاہ جی اُس کی موت ہی آئی ہو گی جو نے اُسے گمراہ کیا۔ کہاں جائے گا بچ کر۔ مَیں اُس کے کئی ٹھکانے جانتا ہوں" ___

اُس نے اپنے نمبر بنانے چاہے۔

"حمیدے تم جاؤ اور کل رات جو مال پار جانا ہے وہ بھی روک لو ___ بچانا وہ حرامی کیا کیا جکر چلا گیا ہے ___ اور ہاں اب مَیں خود تم سے رابطہ کروں گا"

فضل شاہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

حمیدا چلا گیا۔

فضل شاہ کا بس نہیں چلتا تھا کہ کچھ کر گزرے۔ نذیر موچی نے جس کمینگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کا تو فضل شاہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو نذیرے کو ایک بُزدل اور دلاّل قسم کا چمچہ سمجھتا تھا۔ نذیرا اِتنی جرأت کرے گا کہ شاہ صاحب کو ہی رگڑا دے جاتے۔

یہ سوچ کر اُس کا دماغ خراب ہونے لگا تھا۔

شام تک حمیدے کی طرح دو اور بدمعاش بھی اس طرح فضل شاہ کے ڈیرے پر پہنچ چکے تھے۔ نذیر موچی جاتے ہوئے فضل شاہ کے ساتھ تین لاکھ روپے کا ہاتھ کر گیا تھا۔

فضل شاہ کے لیے پیسوں سے زیادہ اہمیت اپنی ساکھ کی تھی۔ اگر اس کے کمّی کمین ہی اس طرح کی حرکتیں کرنے لگے تو اس کا کیا بنے گا۔ اس نے علاقے کے چپّے چپّے پر اپنے لوگوں کو پھیلا دیا تھا۔

شام ڈھلنے تک نزدیک دُور کے دیہاتوں میں تقریباً پچاس گھڑسوار نذیر موچی کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔

لیکن ___

اب وہ اُن کی دسترس سے باہر ہو چکا تھا۔



ریاست شاہ نے اس کی بات بڑے اطمینان سے سُنی تھی ___

"فضل شاہ تم نے دیکھ لیا انجام میری نصیحت پر عمل نہ کرنے کا ___ مَیں نے تم سے کہا تھا فضل شاہ کہ اِن کمّی کمینوں کو زیادہ لفٹ نہ دیا کرو ___ لیکن تم تو زناکاری کے چکر میں اندھے ہو رہے ہو۔ تمھیں تو عورت چاہیئے ___ ارے کیا شہر میں سب لوگ مر گئے ہیں۔ کبھی ہمارے متعلق بھی کوئی بات سُنی ہے ___"

اُس نے فضل شاہ کو تنبیہ کی۔

"شاہ جی وہ تو ٹھیک ہے لیکن اِس بندے کو بچ کر جانا نہیں چاہیئے"——
فضل شاہ کا خون ابھی تک کھول رہا تھا۔
"نہیں بچے گا —— کہاں جائے گا ہم سے بھاگ کر —— اور ہاں نقو خان کی اطلاع کیا ہے"——
ریاست شاہ نے گفتگو کا رُخ دوسری طرف موڑا۔
"شاہ جی —— وہ تو آجائے گا لیکن اس کا لڑکا —— کچھ کرنا ہو گا"——
فضل شاہ کو بھی اب تشویش ہونے لگی تھی۔
"فضل شاہ حنیف خان اگر ایک مرتبہ پلوان پہنچ گیا تو ہمارے قابو سے باہر ہو جائے گا۔ تم سمجھتے ہو نا سردار کو —— وہ بڑا کایاں بدمعاش ہے۔ مَیں جانتا ہوں نقو خان بڑا با اصول آدمی ہے لیکن اکلوتی اولاد کے سامنے اس کے اصول کیسے برقرار رہیں گے۔ اگر ہم باپ بیٹے کو الگ الگ بھی کر دیں تب بھی گھاٹے کا سودا ہے —— تب بھی سردار ہی کامیاب رہے ناں —— فضل شاہ کچھ بھی ہو جائے۔ سرداروں کے ہاں زہرہ بائی کا مجرہ نہیں ہونا چاہیئے"۔
یہی ایک صورت ہے حنیف خان کو اپنے ساتھ ملاتے رکھنے کی —— تم ہر ممکن کوشش کرو —— ہر ممکن —— میری بات سمجھ گئے ناں ——"
ریاست شاہ نے بڑے تشویشناک لہجے میں کہا۔
"شاہ جی —— زہرہ بائی کا مجرہ نہیں ہو گا —— مَیں ابھی بندوبست کرتا ہوں"۔
فضل شاہ نے بڑے اعتماد سے کہا ——
"فضل شاہ خیال رکھنا تمھارے پاس صرف کل کا دن ہے۔ پرسوں اُسے وہاں جانا ہے"——
ریاست شاہ نے اُسے صورتحال کی سنگینی کا احساس دلایا۔
"شاہ جی آپ مطمئن ہو جائیں۔ ایسا ہی ہو گا —— چاہے اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے"——

فضل شاہ اب نذیر موچی کا غصہ بھی عنایت بائی پر اُتارنے پر تُل گیا تھا۔
"ٹھیک ہے اب تم جاؤ —— فی الوقت نذیر موچی کو بھُول جانا —— جگ ہنسائی نہ کراؤ اپنی —— شریک کیا کہیں گے کہ ایک موچی ہمیں دغا دے گیا —— ہمارے تین لاکھ ٹھگ کرلے گیا۔ مَیں دیکھوں گا اُسے —— کہاں جائے گا وہ —— یوں بھی فضل شاہ اِس وقت ہمارے لیے الیکشن زیادہ اہم ہے —— ٹھہرو —— ایک بات آئی ہے میرے ذہن میں ——"
اچانک ہی ریاست شاہ کے شیطانی دماغ نے اُسے راستہ دکھایا۔
"حکم شاہ جی"——
فضل شاہ مؤدب ہو گیا۔

اور ——
جب ریاست شاہ نے فضل شاہ کو اس ترکیب سے آگاہ کیا جس پر وہ عمل کرنے جا رہا تھا تو فضل شاہ عش عش کر اُٹھا۔
اُسے یقین ہو چلا تھا کہ ریاست شاہ کے شیطانی دماغ کے سامنے سردار نہیں ٹک سکے گا اور بالآخر اس کی فتح ہو گی۔
ریاست شاہ نے بات ہی ایسی کر دی تھی۔
فضل شاہ اب اس ترکیب پر عمل کرنے جا رہا تھا۔



نورپور کے ماچھیوں کو جب فضل شاہ کی آمد کی اطلاع ملی تو وہ بے چارے ڈر گئے ——
"کوئی نیا عذاب نہ آ گیا ہو ——"
رُلتے ماشکی نے اپنے ساتھیوں سے کہا ——
"دیکھو تو کہیں —— ہمیں مار تو نہیں ڈالے گا"——
اُس کے ساتھیوں نے مشورہ دیا۔

نمبردار حکم دین نے جو اس گاؤں کا سب سے بڑا زمیندار اور فضل شاہ کا یار بھی تھا اور جس نے آج تک دباؤ ڈال کر اپنی اپنی لڑکی کے اغوا کا مقدمہ درج کروانے سے بھی روک رکھا تھا، سنے ہی انھیں بُلایا تھا کہ شاہ صاحب اُن سے ملاقات کرنے آتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی دُلّا ماشکی اپنے ساتھیوں سمیت نمبردار حکم دین کی حویلی پہنچ چکا تھا جہاں فضل شاہ اُن کا منتظر تھا۔

اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب فضل شاہ نے سب سے باری باری کھڑے ہو کر ہاتھ ملایا اور دُتّے ماشکی کو گلے لگا لیا۔

دُتّے غلطیاں انسانوں ہی سے ہُوا کرتی ہیں۔ ہمیں اِس بات کا علم نہیں تھا کہ نذیرا موچی اتنا گھٹیا اور ذلیل انسان ہو گا کہ ہمارے ہی علاقے کی عزّت کو نیلام کرتا پھرے گا۔ یوں بھی پُرانا خدمت گار ہونے کے ناطے جب اس نے قرآن پر حلف دے کر بڑے شاہ صاحب کو بتایا کہ وہ بے گناہ ہے تو انھوں نے اس کی بات کا یقین کر لیا اور اپنے نوکر کو پولیس سے بچاتے رکھا لیکن، اب شاہ صاحب کو اس کی خباثت کا ایک اور ثبوت ملا ہے تو انھوں نے مجھے حکم دیا ہے کہ تم لوگوں کی مدد کروں اور بچّی کو برآمد کرواؤں ـــ مَیں تمھارے ساتھ خود تھانے جاؤں گا اس کے خلاف رپٹ درج کروانے اور بچّی کی بازیابی میں بڑے شاہ صاحب اور مَیں ہر طرح تمھاری مدد کریں گے ـــ ہماری طرف سے جو غلطی نادانستگی میں ہو گئی ہے اس پر مَیں معذرت خواہ ہوں"ـــ

جیسے جیسے فضل شاہ کے مُنہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے۔ بے چارے دیہاتیوں کے دل پگھلتے چلے جا رہے تھے۔

"شاہ جی خدا کے لیے ہمیں شرمندہ نہ کریں۔ آپ سیّد بادشاہ ہیں۔ ہمارے سردار ہیں۔ ہم آپ کے پہلے بھی خدمت گار تھے اور آج بھی ہیں۔ ہمیں علم تھا کہ جب آپ کو حقیقت کا علم ہو گا تو آپ ضرور ہمارا ساتھ دیں گے۔ شاہ جی نذیرا موچی

بڑا حرامی آدمی ہے۔ اُس نے آپ کی پوزیشن بہت گندی کی ہوتی تھی۔ ہم تو خُدا کا شکر بجا لاتے ہیں کہ اُس نے نذیرے کی اہمیت آپ پر ظاہر کر دی ـــ"

دُتّے نے جواب دیا۔

"دُتّے بھائی تم جانتے ہو کہ شاہ صاحب کبھی چل کر کہیں نہیں گئے، لیکن تمھارے پاس آتے ہیں۔ اب ہمارا بھی فرض بنتا ہے کہ الیکشن میں ان کے ساتھ کندھے سے کندھا مِلا کر کھڑے ہو جائیں۔ تم اپنے دو تین بندے ساتھ لو۔ مَیں بھی تمھارے ساتھ تھانے چلتا ہوں۔ شاہ صاحب بھی چلیں گے اور نذیرے کے خلاف ہم اغوا کا پرچہ درج کروائیں گے کیونکہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ نوری کو اس نے اغوا کروایا تھا ـــ"

حکم دین نمبردار نے بات بڑھائی۔

تھوڑی دیر بعد ہی نور پور کے گاؤں کا ایک وفد تھانے میں فضل شاہ کے ساتھ موجود تھا۔ جسے فضل شاہ پہلے ہی تیار کر کے گیا تھا۔

تھانیدار نے اُن کا استقبال ایسے کیا جیسے وہ خود مجرم اور آنے والے پولیس کے ملازم تھے ـــ!

اُس نے فضل شاہ کے حکم پر نذیر موچی کے خلاف اغوا کا پرچہ درج کیا۔ حکم دین نمبردار دُتّے ماچھی اور اس کی برادری کے چار اور آدمیوں کی گواہی بھی ڈال دی۔

لیکن ـــ

یہ ساری کارروائی اس نے کورے کاغذ پر کی تھی۔

بے چارے دیہاتیوں کو اِس بات کا کیا علم تھا کہ اُن کے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے۔ اُن پر تو شاہ صاحب کی عقیدت کا نشہ سوار تھا اور یہ احساس کہ شاہ صاحب خود چل کر اُن کے گھروں تک آتے ہیں ان کی انانیت کو ہَوا کے گھوڑے پر اُڑاتے چلا جا رہا تھا۔

"تم بے فکر ہو جاؤ دُتّے ـــ نوری ہماری بھی عزّت ہے۔ ہم اُسے برآمد کروائیں

گے۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ نذیر موچی نے اُسے کہاں چُھپا رکھا ہے ـــ مَیں نے تھانیدار سے کہہ دیا ہے کہ فوراً اسے گرفتار کرکے اُس کے جسم کی ایک ایک ہڈی توڑ ڈالے اور اُس سے نوری کو برآمد کروالے" ـــ

فضل شاہ نے دُتے اور اس کے ساتھیوں کو تھانے سے رخصت ہوتے ہوئے کہا۔

وہ ان سب کو اپنی حویلی میں لے آیا تھا یہاں اُن کے لیے خصوصی ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ فضل شاہ نے ان کی ساری برادری کے لیے پلاؤ اور قورمے کی دیگیں پکوائی تھیں۔

اور ـــ

بے چارے ماتسکیوں کے لیے یہ دعوت کسی بھی طرح "دعوتِ شیراز" سے کم نہیں تھی۔ اگر ان میں سے کسی کے دل میں شاہ صاحبان کے متعلق کچھ گلہ شکوہ بھی تھا تو پلاؤ زردے اور قورمے میں بہہ گیا تھا۔

وہ سب ایک مرتبہ پھر شاہ صاحب کے تابعدار اور ان کے ایک اشارے پر جان نچھاور کرنے کا عزم لے کر واپس جا رہے تھے۔



مقامی ایس ایچ او اس وقت ریاست شاہ کے کمرے میں موجود تھا ـــ!

"حکم شاہ جی" ـــ

اُسے جیسے ہی ریاست شاہ کی طرف سے بلاوا آیا بھاگتا چلا آیا تھا۔

"کیا حال ہے چوہدری صاحب ـــ کام دھندہ تو ٹھیک چل رہا ہے ناں ـــ"

ریاست شاہ نے بے تکلفی سے اُس سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"شاہ جی آپ کے ہوتے ہوئے اِس غلام کی طرف کوئی میلی آنکھ سے دیکھ سکتا ہے کیا؟"

"کیا بنا تمھارے اس ایس پی صاحب کا ـــ بڑی بڑھکیں مارتا تھا۔ کہاں گیا وہ ـــ"

ریاست شاہ نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دے کر پوچھا۔

"واہ شاہ جی واہ ـــ مان گئے شاہ جی۔ آپ نے اُسے آنے والی جگہ بھیج دیا ہے ـــ اب تین چار سال تو آرام سے گزریں گے۔ اس نے بھی مجھے عذاب میں مبتلا کر رکھا تھا۔"

ایس ایچ او نے دانت نکالے۔

"چوہدری صاحب جو ہمارے بندے ہو جاتے ہیں اُن کی اور ہماری عزت، دوستی دشمنی سانجھی ہو جاتی ہے۔ اُس نے تمھیں لائن حاضر کیا تھا۔ ہم نے اُسے ضلع بدر کروا دیا اور دیکھ لو تم اس تھانے میں چوہدراہٹ کر رہے ہو ـــ"

ریاست شاہ نے تکبّر سے گردن پھلائی۔

"شاہ جی ـــ نوکر ہیں آپ کے ـــ میری تو سات پُشتیں آپ کا احسان نہیں اُتار سکتیں۔"

ایس ایچ او واقعی اُن کا احسان نہیں اُتار سکتا تھا۔

"ایک چھوٹا سا کام تم سے آن پڑا تھا" ـــ

ریاست شاہ نے اُس کے چہرے پر نظریں جمائیں جہاں شاہ صاحب کے لیے بے پناہ تابعداری کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"حکم شاہ جی حکم ـــ نوکر کیا اور نخرہ کیا شاہ جی" ـــ

تھانیدار نے اب باقاعدہ ہاتھ باندھ لیے تھے۔

"وہ جس طوائف کا مجرہ ہم نے کروایا تھا ناں ـــ"

"جی شاہ جی ـــ جانتا ہوں مَیں اُسے۔ عنایت باقی کی بیٹی۔ مَیں بہت عرصہ رہا ہوں اُس تھانے میں ـــ اُس نے کیا کوئی انکار کیا ہے آپ کی خدمت سے؟"

تھانیدار نے ریاست شاہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"چوہدری صاحب ہمارا اب ایسا گھٹیا شوق بھی نہیں ہے" ـــ

ریاست شاہ لفنگوں کی طرح ہنس دیا۔

" میرا یہ مطلب نہیں تھا حضور —— آپ تو بادشاہ ہیں، مالک ہیں علاقے کے —— آپ تو۔۔۔"

" اُس نے کچھ نہیں کیا چوہدری —— لیکن یہ جو پلوال والے سردار ہیں ناں۔ یہ اُسے ہمارے خلاف ہتھیار بنانا چاہتے ہیں —— چوہدری اس عورت کو دوراتوں کے لیے غائب کرنا ہے —— الزام تمھارے پاس موجود ہے۔ نذیر موچی نے اُس کے ہاتھ بیچا تھا نوری کو —— دونوں ماں بیٹی کو گرفتار کر کے لے آؤ —— پکا پرچہ کرنا۔ دو دن تک مَیں اُن کی ضمانت نہیں ہونے دوں گا۔ تمھیں ریمانڈ دلانا بھی میرا کام ہے —— ان سے نوری کو برآمد کرداؤ ہر صورت۔ تاکہ اِس کارنامے سے ہم ارد گرد کے غریب دیہاتیوں کے دل جیت سکیں اور ننھو خان اور اُس کے بیٹے میں بھی ایکا قائم رہے ——"

ریاست شاہ نے اس کی بات کاٹ کر اُسے ساری رام کہانی سُنا دی —— اور یہ بھی سمجھایا کہ اگر زہرہ بائی کا مجرہ پلوال ہو گیا تو ننھو خان کا بیٹا اُن کے ہاتھ سے نکل جائے گا جس کا مطلب سوائے شکست کے اور کچھ نہیں ——

" اور ہاں —— اس واقعے میں دُور دُور تک ہمارا وجود دکھائی نہ دے —— کسی کو یہ احساس نہ ہونے دینا کہ اس کے پس پردہ کون کام کر رہا ہے —— بس تم یہی کہنا کہ نور پور والوں کے دباؤ پر تم نے نذیر موچی کو گرفتار کر کے تفتیش کی ہے —— اور ہاں نذیر موچی کو بھی اشتہاری قرار دے دو —— یہ کام بھی مَیں کروا دوں گا۔ اُس پر کم از کم تین ڈاکے ڈال دو —— مَیں چاہتا ہوں اب وہ مفرور کی حیثیت سے ہی مارا جائے ——"

ریاست شاہ نے آخر میں کہا۔

" شاہ جی آپ کے تمام احکامات پر حرف بہ حرف عمل ہو گا —— آپ نے چوہدری نظافت کے ہاتھ نہیں دیکھے —— ہم بھی اپنے محسنوں کے لیے جان دے دیا کرتے ہیں چوہدری صاحب —— مَیں سارا کیس خود —— کروں گا اور کسی کو کانوں کان

نہ ہو گی —— شاہ جی ہم نے تو سینکڑوں لوگوں کی آنکھوں کے سامنے بندے اُٹھا کر انھیں مچھلیوں کی خوراک بنا دیا ——

اس بے چاری طوائف کی تو اوقات ہی کیا ہے ——"

ایس ایچ او چوہدری نظافت نے گردن پھلائی۔

" دیکھ لینا چوہدری —— ذرا سنبھل کے۔ اُس کے پیچھے سردار آئیں گے۔ بڑا پریشر آئے گا۔ مَیں تو ہر ممکن کوشش کروں گا کہ تم پر کوئی دباؤ نہ آئے —— لیکن تم بھی پیروں کے پکّے رہنا —— میری بات سمجھ گئے ناں" ——

ریاست شاہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بائیں آنکھ دبائی۔

" بس شاہ جی آپ مطمئن ہو جائیں —— اب میرا کام دیکھیں —— آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی —— مَیں تو کہتا ہوں شاہ جی آپ حکم دیں تو سرداروں کا ہی کھڑپپ دوں ——"

ایس ایچ او نے مزید نمبر بنانے چاہے۔

" ابھی نہیں چوہدری —— وقت آیا تو انھیں بھی دیکھ لیں گے ——"

ریاست شاہ نے اُس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

فضل شاہ کو اندر بلا کر اُس نے تھانیدار کے سامنے سارا منصوبہ اسے سمجھا دیا تھا اور فضل شاہ اپنے سوتیلے بھائی کے شیطانی دماغ کو دل ہی دل میں درجنوں مرتبہ داد دے چکا تھا۔

" یہ لو" ——

ریاست شاہ نے اپنے بریف کیس سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر چوہدری کی طرف بڑھائی۔

" شاہ جی —— اس کی ضرورت نہیں۔ آپ کے مجھ پر پہلے ہی کیا کم احسانات ہیں —— شاہ جی یہ ظلم نہ کریں"

تھانیدار نے باقاعدہ ہاتھ باندھ دیئے۔

لیکن ——

اُس کے بضد ہونے کے باوجود شاہ صاحب نے اُسے محبت سے ڈانٹے ہوتے نوٹوں کی گڈی پکڑا ہی دی جو چوہدری نظافت ایس ایچ او نے بادلِ نخواستہ اپنی پتلون کی بڑی جیب میں ٹھونس لی ——

دو دو ہاتھ

عنایت بائی کے لیے زندگی میں اس سے بڑا بزنس نہ کبھی پہلے ہاتھ آیا تھا نہ ہی آئندہ ایسے امکانات دکھائی دے رہے تھے۔ اُس نے تین چار روز پہلے ہی تیاری شروع کر دی تھی اور زہرہ بائی کا روزانہ بیوٹی پارلر کا صبح شام چکر لگ رہا تھا۔

زہرہ جانتی تھی کہ حنیف ایک مشہور سمگلر کا بیٹا ہی نہیں خود بھی اِس میدان کا دھنی ہے اور اُس کے پاس روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی جس کا ثبوت اس نے ماں بیٹی کو پہلی باقاعدہ ملاقات میں دے دیا تھا۔ زہرہ بائی بھی اس مجرے سے بہت اُمیدیں وابستہ کیے بیٹھی تھی۔

آج اُن کی تیاری کا آخری دن تھا کیونکہ اگلے روز شام کو انھیں پلوال سے سرداروں کی پجارو لینے کے لیے آ رہی تھی۔ عنایت بائی نے بڑا کڑوا گھونٹ بھرتے ہوئے آج مجرے کے لیے معمول کے مطابق بیٹھک نہیں سجائی تھی۔ وہ اپنی بچی کو تھکانا نہیں چاہتی تھی حالانکہ مقامی عُرس کی وجہ سے مضافاتی علاقوں سے ہزاروں دیہاتی شہر پر حملہ آور ہوتے تھے اور اُن کی مختلف ٹولیاں صبح شام بازاروں میں چکر لگا رہی تھیں۔

یہ سیزن کے دن تھے۔ آج کل تو اُن کے ہاں بھی رونقیں لگی تھیں جن کا دارومدار ہی دوسرے قسم کے کاروبار پر تھا جو کم از کم خاندانی کنجروں کو زیب نہیں دیتا۔

اس وقت رات کے دس بج رہے تھے جب اچانک ہی عنایت بائی کے کوٹھے پر قیامت آ گئی —— ! دھڑ دھڑ کرتے شاہ پور تھانے کے چار سپاہی سیڑھیاں چڑھ

کرا اوپر آگئے ان کے تعاقب میں مقامی تھانے کا ایس ایچ او اور شاہ پور کا ایس ایچ او چوہدری نظافت اوپر آ رہے تھے ۔۔۔!

"سس سس سلام سرکار۔"

عنایت بائی کے تو انھیں دیکھتے ہی ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے ۔

"نوری کہاں ہے؟"

چوہدری نظافت نے اُس کے سلام کو نظر انداز کرتے ہوئے پُوچھا۔

"کہ کہ کون سی نوری؟"

"اچھا سالی اب یہ بھی مَیں بتاؤں ۔۔۔"

نظافت چوہدری نے اُسے تین چار گالیاں دے کر پولیس کی مخصوص زبان میں کہا۔

"دیکھو عنایتی ۔۔۔ تیری خلاصی تب ہی ہوگی جب تُو سچی بات کرے گی۔ معاملہ بہت اوپر تک چلا گیا ہے ۔۔۔ اور ایس پی صاحب نے حکم دیا ہے کہ کل دن چڑھنے سے پہلے پہلے لڑکی کو اُن کے سامنے پیش کر دیا جائے ۔۔۔ مَیں چوہدری صاحب کے ساتھ صرف اس لیے آیا ہوں کہ اگر تُو تعاون پر راضی ہے تو تیری خلاصی کروا دوں"۔۔۔

مقامی ایس ایچ او نے کہا۔

"لیکن مائی باپ مجھے تو اس نام کی کسی لڑکی کا نہیں پتہ ۔۔۔ مولا سئیں کی قسم مجھے کچھ نہیں پتہ"

عنایتی نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ اُس کے اوسان قدرے بحال ہونے لگے تھے

"خان صاحب یہ بڑی خرانٹ کنجری نظر آتی ہے یوں نہیں کہے گی۔ شاید آپ نے اس کے ساتھ میرا تعارف نہیں کروایا ۔۔۔ خیر مَیں خود کروا دوں گا ۔۔۔ جب وہ آئے گا ناں نذیرا موچی ۔ اس کا دلال اس کے سامنے پھر دیکھنا کیسے طوطے کی طرح ٹیں ٹیں کرے گی ۔۔۔"

چوہدری نظافت نے اپنے ساتھی سے کہا ۔۔۔

عنایت بائی کو بھی سمجھ آگئی تھی کہ نذیرا موچی گرفتار ہوا ہے اور اس نے بک دیا ہے کہ نوری کو اُس نے عنایت بائی کے ہاتھ فروخت کیا تھا ۔۔۔

لیکن ۔۔۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ نذیرا موچی گرفتار ہو گیا ہو؟

یہ بھی تو ممکن تھا کہ پولیس نے نذیرے کے ذریعے اُن پر ہاتھ ڈالنا چاہا ہو یا پھر نذیرا موچی اُس سے بدلہ لینے پر تُل گیا ہو۔ اُس نے بھی تو گزشتہ دنوں اُس کی ضرورت سے زیادہ ہی بے عزتی کر دی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس نے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے اُسے ایک آدھا مالی جھٹکا لگانا ہی مناسب سمجھا ہو۔ وگرنہ ریاست شاہ اور فضل شاہ کے ہوتے ہوتے کس کی مجال تھی کہ نذیرے موچی پر ہاتھ ڈالتا ۔۔۔؟

لیکن ۔۔۔

کیا نذیرے نے یہ نہیں سوچا کہ اس کے بھی تو بے شمار راز عنایتی بائی کے پاس محفوظ ہیں یہ کوئی پہلا سودا تو نہیں تھا جو اُس نے عنایت بائی سے کیا۔

وہ تو گزشتہ دس سال سے اُس کے ساتھ مل کر یہی کام کر رہا تھا۔

دونوں نے اب تک درجنوں بے گناہ بچیوں اور لڑکیوں کو ملک کے بڑے بڑے شہروں کے بازارِ حُسن میں سجایا تھا۔

ٹھیک ہے ۔۔۔ شاید اُس نے پولیس کو "ٹپ" دی ہو اور خود سامنے نہیں آیا۔

عین ممکن ہے جب دونوں کا آمنا سامنا ہو تو نذیرا موچی کو اُس پر الزام لگانے کی ہمت ہی نہ ہو۔

"مائی باپ آپ بیٹھیے تو سہی ۔۔۔ اوئے مشتاق جا افسروں کے لیے چائے پانی کا بندوبست کر"۔۔۔

اُس نے معمول کے مطابق اپنے نوکر سے کہا لیکن اس کی اس بات کا ردِ عمل

اتنا سخت تھا جس نے عنایت بائی کے ہاتھ پاؤں پھلا دیئے۔

"تیرے چاہنے والی کی ماں ۔۔۔۔"

چوہدری نظافت نے اُسے موٹی سی گالی دی۔ اتنی زور سے ڈانٹا کہ ساتھ والے کمرے میں مسہری کے نیچے دبکی ہوئی زہرہ بائی کا دل دہل کر رہ گیا۔

"عنایت بائی شاید تو شریف آدمیوں والی زبان نہیں سمجھتی — تو ابھی چوہدری نظافت کو نہیں جانتی — یہ کسی کی پرواہ کرنے والا افسر نہیں ہے — اپنی ہڈی پسلی بھی تڑوائے گی اور اپنی لڑکی کو بھی تھانے کچہری میں ذلیل کروائے گی۔ چُپ چاپ لڑکی چوہدری صاحب کے حوالے کر دے۔ اگر معمول کی بات ہوتی تو میں چوہدری صاحب کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی معاملہ دبا دیتا — تو جانتی ہے ہم یاروں کے یار ہیں۔ پرسوں تیرے کوٹھے سے جو لڑکی جان بچا کر بھاگی تھی ہم نے اُسے پکڑ کر دوبارہ تیرے پاس نہیں پہنچایا؟ — ہم احسان فراموش نہیں ہیں عنایت بائی — لیکن یہاں معاملہ نوکری کا آن پڑا ہے — ایس پی بڑا سخت آدمی ہے — اور تیرے اوپر بڑی مضبوط گواہی بھگتی ہے — پولیس کے پاس سارے ثبوت موجود ہیں تیرے اُس یار نے کیا نام ہے اُس کا نذیر موچی نے پولیس کو ساری کہانی سُنا دی ہے۔ وہ اتنا پُرانا بردہ فروش ہے اور پولیس کے دو جوتے نہیں کھا سکا تیری تو کوئی اوقات ہی نہیں — چوہدری صاحب کو مزید غصہ نہ دلا —"

مقامی ایس ایچ او نے پھر عنایت بائی کو راہ راست پر لانا چاہا —

عنایت بائی نے کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔

وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے پولیس کے دباؤ میں آکر نوری کو برآمد کروا بھی دیا تو یہ سلسلہ شروع ہو جائے گا اور پولیس کے منہ ایسا لہو لگے گا جس کی چاٹ اسے بار بار اس کوٹھے پر لایا کرے گی —

وہ پہلے ہی مقامی تھانے کو منتھلیاں دے دے کر تنگ آ چکی تھی۔ آج تک اُس نے یہ دھندہ رازداری سے چلایا تھا۔

پولیس کو صرف اس بات کا علم تھا کہ وہ گانا بجانے کا دھندہ کرتی ہے۔ کبھی کبھی جب مال پانی سے ٹوٹ جائے تو اپنے کوٹھے پر تماش بینی بھی کروا لیتی ہے۔

اور —

یہ یہاں کا معمول تھا۔

جب سے مقامی بازار پر سختی شروع ہوئی تھی اور حکومت نے چکلہ بزور بند کروایا تھا۔ تب سے آئے روز پولیس ان کے گھروں پر چھاپے مارتی رہتی تھی اور مقامی تھانے کے ذریعے فضا ایسی دہشت ناک بنا دی جاتی تھی کہ عام آدمی تو شام کے بعد اس طرف پھٹکنے سے بھی ڈرتا تھا۔

جو کچھ لوگ آتے تھے وہ گانا سُننے میں کم اور دوسرے [illegible] میں زیادہ دلچسپی لیا کرتے تھے جس کے بعد سے بڑی بڑی خا[illegible] کی کنجریاں بھی اپنے ڈیرے کا خرچ چلانے کے لیے چھوٹا موٹا دھندہ کرنے لگی تھیں۔

لیکن —

اگر پولیس کو اس بات کی بھنک بھی لگ جاتی کہ عنایت بائی قحبہ خانہ بھی چلاتی ہے اور اس کے پاس مختلف علاقوں سے اغوا ہو کر آنے والی بچیاں اور عورتیں فروخت کی جاتی ہیں تو اُس کی جان عذاب میں آ جاتی کیونکہ ایسی کسی خبر کی بھنک بھی اگر کسی اخبار نویس کو ہو جاتی اور وہ اخبار میں یہ کچھ شائع کر دے تو پولیس کے اعلیٰ افسران مزید کارروائی سے پہلے فوری طور پر مقامی انچارج اور اُس کے درجنوں ماتحتوں کا تبادلہ کر دیا کرتے تھے اور کم از کم اس نقصان کا متحمل کوئی تھانیدار نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ اس تھانے کو سونے کی کان سمجھا جاتا تھا اور یہاں کی انچارجی حاصل کرنے کے لیے کسی بھی تھانیدار کو کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے تھے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ عنایت بائی نے "وقتی سہولت" کے لیے ساری زندگی کا عذاب گلے لگانے سے انکار کر دیا تھا اور فی الوقت ڈٹ جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

"خان صاحب آپ سے زیادہ ہمیں کون جان سکتا ہے۔ ہم خاندانی لوگ ہیں۔ ہم تو کبھی ایسے گندے اور گھناؤنے دھندے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔"
عنایت بائی نے بظاہر بڑی مکّاری دکھائی۔
"جاؤ بھر ایسی تیسی میں ——"
خان صاحب نے اُسے دو چار موٹی موٹی گالیاں دیتے ہوئے کہا۔
"ٹھیک ہے چوہدری صاحب جیسے آپ کی مرضی۔"
انھوں نے چوہدری نظافت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"کہاں ہے تیری وہ چھمک چھلو۔"
چوہدری نظافت نے پولیس والی زبان میں پوچھا۔
"خان صاحب یہ زیادتی ہے —— ہم آپ کے تابعدار ہیں۔ ساری زندگی آپ کی خدمت کی ہے۔ اس کا یہ صلہ دیا آپ نے۔"
عنایت بائی نے چاہا کہ مقامی تھانیدار کو غیرت دلائے۔
لیکن ——
جواب میں اس کو خان صاحب نے ایسی ایسی مغلظات سے نوازا کہ الامان الحفیظ

○

زہرہ بائی نے اپنے سر میں بے شمار پنیں پھنسا رکھی تھیں جن کی مدد سے اس کے بال گھنگھریالے ہو رہے تھے۔ یہ بھی صبح کی تیاریوں کا ایک مرحلہ تھا۔ اُس وقت وہ کمرے میں چارپائی پر ٹانگیں پسارے بیٹھی تھی اور ڈیرے کا ایک نوکر اس کے پاؤں دبا رہا تھا جب اچانک یہ قیامت ٹوٹی ——!
اُس سے پہلے ڈیرے کے نوکر کو حالات کی سنگینی کا اندازہ ہو گیا تھا۔
"بی بی جی پولس ——"
یہ کہتے ہوئے وہ ننگے پاؤں ہی باہر کو دوڑا تھا۔ اس نے چاہا تھا کہ سیڑھیوں کے راستے فرار ہو جائے۔

لیکن ——
سیڑھیاں پھلانگتے حوالدار جنن دین نے اُس کو یوں ہاتھ لمبا کر کے گردن سے دبوچا جیسے بگلا پانیوں پر تیرتی کسی مچھلی کو اپنے پنجوں میں پھنساتا ہے ——
زہرہ بائی کو اور تو کچھ نہ سُوجھا وہ جھٹ سے اُسی مسہری کے نیچے دبک گئی جس پر تھوڑی دیر پہلے تک وہ مہارانی سندراں بن کر لیٹی اپنی خدمت کروا رہی تھی ——
چوہدری نظافت کے ساتھیوں نے مکان کے تین چار کمروں میں جھانک کر وہاں سے ایک نوکر اور دو سہمی ہوئی لڑکیوں کو بھی برآمد کر لیا تھا۔
لیکن ——
کسی کی نظر ابھی تک زہرہ بائی پر نہیں پڑی تھی۔
یوں بھی وہ یہاں سے کوئی ہیروئن برآمد کرنے نہیں آتے تھے کہ مکان کے کونوں کھدروں کی تلاشی لیتے پھرتے۔
ممکن ہے وہ پولیس کی نظروں سے اوجھل رہتی اور وہ یہی سمجھتے کہ زہرہ بائی کوٹھے پر موجود نہیں لیکن جب اُس کی ماں پر مغلظات کی بارش ہوئی اور اس نے یہ بھی محسوس کیا جیسے کسی تھانیدار نے عنایت بائی کی گدی میں ایک آدھ ہلکا سا ہاتھ بھی جمایا ہے تو بے چاری سہم کر ہی باہر نکل آئی۔
اسے یہ خوف دامن گیر ہوا کہ کہیں اس کی وجہ سے ہی اس کی ماں کی کمبختی نہ آ جائے۔ اس کے برعکس عنایت بائی کی یہ خواہش تھی کہ اگر وہ پولیس کی نظروں میں نہیں آتی تو چھپی ہی رہے کیونکہ اس کے تھانے چلے جانے کی صورت میں واحد امید ہی زہرہ بائی تھی جو بھاگ دوڑ کر کے اپنی ماں کی جان بچا لیتی۔
جب اُس نے کمرے سے سہمی ہوئی زہرہ بائی کو برآمد ہوتے دیکھا تو بجانے کیوں اسے غصہ آ گیا۔ اس نے پولیس کی موجودگی ہی میں اپنی صاحبزادی کو گالیاں بکنا شروع کر دیں کہ آخر وہ باہر کیوں آ گئی ہے۔
چوہدری نظافت نے ساری کارروائی پکے پیروں پر کی تھی ——!!

اُس نے سب سے پہلے لڑکی کے اغوا کی ایف آئی آر درج کر کے نذیر موچی کی گرفتاری ڈالی تھی پھر یہ اندراج کیے تھے کہ نذیر موچی لڑکی برآمد کروانے کے لیے انھیں شہر میں عنایت بائی کے ڈیرے پر لا رہا تھا کہ راستے میں فرار ہو گیا — جس پر اس نے صورت حال سے بے خبر مجسٹریٹ صاحب سے عنایت بائی اور اس کی بیٹی کی باقاعدہ گرفتاری کا وارنٹ حاصل کیا تھا اور مقامی پولیس لائن سے دو لیڈی کانسٹیبل بھی اپنے ساتھ لایا تھا جو پیچھے ایک آرام دہ کار میں بیٹھیں چلغوزے کھا رہی تھیں —! ماں بیٹی کو وہ لوگ خاصا ذلیل کرنے کے بعد نیچے لائے تھے۔ دونوں کو لیڈی کانسٹیبلوں کے ساتھ انھوں نے پچھلی سیٹ پر پھنسا دیا اور خود چوہدری نظافت، ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا —

سارا بازار کھڑکیوں میں سمٹ آیا تھا —!

لوگ حیران تھے کہ پولیس نے عنایت بائی پر کس طرح ہاتھ ڈال دیا جبکہ اپنی بے عزتی کے احساس سے عنایت بائی کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ زمین نہیں پھٹتی تھی کہ وہ اُس میں سما جاتی۔

ایسی ذلالت کا تصور تو اُس نے بھلے دنوں میں نہیں کیا تھا اب تو بات ہی اور تھی۔ اب تو اس کی بیٹی کا شمار خیر سے بازار کی چند گنی چُنی طوائفوں میں ہوتا تھا۔

"چوہدری جی۔ ہمیں تو فارغ ہی کر دیں — ہم کہاں اِن کنجریوں کے ساتھ پھنس کر بیٹھی رہیں" —

ایک نک چڑھی لیڈی کانسٹیبل نے جس کے سانولے رنگ پر پھسلتی سرخیوں پر ساری پولیس لائن کے لائن حاضر جوان قربان ہو ہو جایا کرتے تھے چوہدری نظافت سے کہا۔

"میرا تو خیال تھا آپ ہمارے ساتھ ہی چلیں۔ کبھی ہمیں بھی خدمت کا موقع دے دیا کریں ناں" —

چوہدری نظافت نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بے ہودہ سا اشارہ کیا!

"ہائے چوہدری جی — قسم سے ضرور جاتی لیکن مجھے آج بہت ضروری کام کرنے ہیں"۔ سانولی سی لیڈی کانسٹیبل نے جس کے ناک کی نتھنی بھی اس کے سانسوں کی طرح پھڑکنے لگی تھی چوہدری نظافت کی طرف دیکھ کر مسکرانے کی اداکاری کی۔

ٹھیک ہے جیسے تمھاری مرضی — نوکر کیا اور نخرہ کیا لیکن اپنا وعدہ ضرور یاد رکھنا — شاہ پور کی دعوت نہیں بھلانی" —

چوہدری نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اُن کے تعاقب میں آنے والی پولیس جیپ بھی رُک گئی تھی —

ایس ایچ او چوہدری نظافت نے باہر نکل کر دونوں لیڈی کانسٹیبلوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر دو بڑے نوٹ نکالے اور ایک ایک کر کے ان کی طرف بڑھا دیتے۔

"ہائے چوہدری صاحب بھلا اس کی کیا ضرورت تھی" —

نک چڑھی نے پیشہ ور نائکہ کی طرح نوٹ پر جھپٹتے ہوئے کہا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں میری جان کبھی شاہ پور آؤ پھر تمھاری ٹھیک ٹھاک خدمت کریں گے"۔

چوہدری نظافت نے اُن کی طرف دیکھ کر بے شرمی سے آنکھ دبائی۔

اُس کے سپاہیوں نے ایک ٹیکسی روک کر دونوں کو اُس میں سوار کروا دیا تھا اور اب کار میں دونوں ماں بیٹی کے ساتھ صرف چوہدری نظافت ہی رہ گیا تھا —!

عنایت بائی اِس حادثے سے قدرے سنبھل چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس صورتحال سے اسے چوہدری نظافت ہی نکال سکتا ہے اور یہاں کوئی دھمکی وغیرہ کارگر نہیں ہو گی۔ اگر ایسا ممکن ہوتا تو وہ لوگ انھیں اپنے ساتھ ہی کیوں لاتے۔

"چوہدری صاحب ہم تو آپ کے غلام ہیں — آپ کوئی حکم کریں اگر پورا نہ ہو تو آپ کا غصہ بجا ہے — کم از کم یہ تو بتا دیں کہ ہم جا کہاں رہے ہیں" —

عنایت بائی نے اپنے حلق میں تھوک نگلتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

"چُپ چاپ بیٹھی رہ — تجھے نہیں علم ہم شاہ پور جا رہے ہیں" —
چوہدری نظافت نے اپنے لہجے کی سختی برقرار رکھی۔

"شاہ پور —"

عنایت بائی بڑبڑائی۔

"ہاں شاہ پور — کیا صدمے سے بہری ہو گئی ہو۔ یا ابھی تک تمھارا فتور نہیں"
ایس ایچ او نے اسے تقریباً ڈانٹتے ہوئے کہا۔

اچانک ہی عنایت بائی کو اندھیرے میں اُمید کی ایک کرن دکھائی دی تھی۔

"فضل شاہ" — یہی تھا وہ نام جو اُسے کچھ اُمید دلا سکتا تھا۔ جس سے اُسے کسی
کی توقع ہو سکتی تھی۔

لیکن —

اُس نے بلوال کے سرداروں کی دعوت قبول کر کے اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی
چلائی تھی۔ اور پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ نذیر موچی نے اپنے مالکوں کو اعتماد میں لیے بغیر
حرکت کی ہو؟ اُسے اچانک خیال آیا اور وہ قدرے مایوس ہو گئی۔ پھر بھی اُس
سوچا۔ آخر تو نوکر نوکر ہی ہوتا ہے ممکن ہے وہ فضل شاہ کی ناراضی دُور کر دے۔
آخر یہ زہرہ بائی کس مرض کی دوا ہے —

ایک مرتبہ منت سماجت کر لینے میں کیا ہرج ہے —

"چوہدری صاحب، ہم فضل شاہ صاحب کے پُرانے خدمت گار ہیں۔ آپ
تو جانتے ہوں گے"

عنایت بائی نے کہا۔

"خبردار جو شاہ صاحب کا نام بھی لیا تو — تم انھیں کیسے جانتی ہو" —
چوہدری نظافت نے ڈرامہ شروع کیا۔

"جناب آپ ہمارا پیغام تو وہاں تک پہنچا دیں" —
اس مرتبہ زہرہ بائی نے ہمت کر کے کہا تھا۔

"ٹھیک ہے — ٹھیک ہے — وہاں جا کر دیکھ لیں گے" —
چوہدری بھی پوری پوری اداکاری کر رہا تھا۔



عنایت بائی یہی سمجھی تھی کہ تھانیدار شاہ صاحب کا نام سُن کر چالو ہو گیا ہے اور
اب اُس کا کام بن جائے گا۔

لیکن —

کیا فضل شاہ اُسے اپنے سیاسی دشمنوں کے ہاں رنگ رلیاں منانے کے لیے
آزاد کروائے گا؟ اُس کے دماغ میں سوال پیدا ہوا اور عنایت بائی گھبرا گئی۔ واقعی
اُس نے اس کمبخت چھوٹے تھانیدار کی بات مان کر اپنے تابوت میں آخری کیل گاڑا
ہے —

اب اُسے خود پر غصّہ آنے لگا تھا —

تھانے میں پہنچ کر ایک مرتبہ پھر اس نے فضل شاہ اور ریاست کے نام کی دُہائی
دے دی تھی۔

"دیکھو بائی — تم نے اُن لوگوں کا نام لے دیا ہے جن کے سامنے ہم دَم مارنے
کی مجال نہیں رکھتے — لیکن اس وقت رات کے اس پہر میں کسی کو حویلی پر بھیجنے
کی گستاخی نہیں کر سکتا — میں سید بادشاہوں کے صدقے تم پر اتنی مہربانی ضرور کر دوں گا
کہ تمھیں آج رات حوالات کے بجائے اپنے کمرے میں رکھتا ہوں — صبح شاہ صاحب
کو تمھارا پیغام پہنچا دیں گے۔ اس کے بعد اُن کی مرضی — لیکن یہ بات میں تمھیں بتا
دوں کہ تم پر بڑا خطرناک کیس بن گیا ہے۔ جس سے تمھاری جان شاہ صاحب بھی بڑا
زور لگا کر ہی چھڑا سکتے ہیں اور تو کوئی مائی کا لال تمھیں رہا نہیں کروا سکتا — تم
یہاں سے سیدھی جیل جاؤ گی جہاں سے پھر پانچ چار سال تک تمھارے باہر آنے کا
کوئی امکان نہیں —"

ایس ایچ او نے اُن پر یہی ظاہر کیا تھا کہ اس کا لہجہ شاہ صاحب کے نام کی وجہ

سے قدرے شریفانہ ہُوا ہے ___

"لیکن چوہدری صاحب ___ ہم بھی عزت دار لوگ ہیں اگر رات . . ."

"تمھاری عزت داری تو اب تک نکل جاتی ___ یہ ہٹے کٹے جوان دیکھ رہی ہوناں ___ انھوں نے شاید کئی سال سے تمھاری بیٹی جیسی عورت نہیں دیکھی ___ یہ سب مِل کر تمھاری عزت کا وہ تیا پانچہ کرتے کہ تم مرتے دم تک یاد رکھتیں ___ تو تمھاری خوش قسمتی ہے کہ تم نے شاہ صاحب کا نام لے دیا ہے جس کی وجہ سے مَیں تمھارا احترام کر رہا ہوں ___ اب ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالنا ___ جو مَیں نے کہہ دیا وہی ہوگا ___ زیادہ ٹرٹر کی تو حوالات میں باقی ملزموں کے ساتھ ہی ساری رات کے لیے بند کر دوں گا "___

چوہدری نظافت نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اُسے ڈانٹ پلائی۔

وہ بڑی کامیابی سے ریاست شاہ کے سٹیج کردہ ڈرامے کو نبھا رہا تھا۔ فضل شاہ نے اُسے بتایا تھا کہ جب عنایت بائی اُن کا نام لے گی تو اُسے کیا کرنا ہے ؟ ___ اُس نے اپنے ایک جوان کو دونوں کو ایک کمرے میں بند کرنے کا حکم دیا اور خود رپورٹ دینے شاہ صاحب کی حویلی کی طرف چل دیا۔

سپاہی محمد دین جس کی رال شہر سے یہاں تک مسلسل ٹپکتی آئی تھی دونوں کو ہانکتا ہوا اُس خاص کمرے تک لے آیا جو تھانیدار چوہدری نظافت نے اس طرح کے کاموں کے لیے رکھا ہوا تھا۔

اِس کمرے میں ایک مسہری ، دو کُرسیاں اور چھوٹی سی میز موجود تھی۔ عموماً اِس ملزموں کی نگرانی کی خصوصی خدمات سپاہی موج دین ہی انجام دیا کرتا تھا جو تھانیدار کا خاص چمچہ تھا۔ اُسے امید تھی کہ چوہدری صاحب کم از کم عنایت بائی کو ہی اُس کے لیے چھوڑ دیں تو یہی بہت بڑا انعام تھا۔

عنایت بائی اور اُس کی بیٹی کی ہر ممکن کوشش یہی تھی کہ وہ رات یہاں نہ گزاریں

اور جس طرح بھی ممکن ہے اُن کا کوئی شناسا انھیں راتوں رات یہاں سے لے جائے۔ اگر وہ رات تھانے میں رہ گئے تو ساری زندگی کے لیے بازار میں ناک کٹ جائے گی اور اُن کی بنی بنائی عزت اور رُعب داب سب خاک میں مل جائے گا کیونکہ بازار والے آج تک اُن سے صرف اِس لیے ڈرتے تھے کہ عنایت بائی کے تعلقات بڑے بڑے لوگوں سے ہیں اور پولیس والے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ___ وہ لوگ تو ان کا جینا دوبھر کر دیں گے ___

"کیا نام ہے تمھارا "___

کمرے میں پہنچ کر عنایت بائی نے مُسکراتے ہوئے سپاہی سے پُوچھا۔

"جی۔ محمد دین "

محمد دین نے ہوسناک نظروں سے اُس کے جسمانی اُبھاروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

عنایت بائی اس کے لیے کم از کم اس حالت میں بھی اپنی بیوی سے کئی گُنا زیادہ خوبصورت تھی ___

"محمد دین ہم ساری زندگی تمھارا احسان نہیں بُھلا پائیں گے ___ تمھاری مہربانی اگر ہمارا ایک کام کر دو "___

عنایت بائی نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ رشتہ خطمی اُن کا پیغام شاہ صاحب تک پہنچا دے گا۔

"ہم تمھاری خدمت بھی کریں گے ___ تمھیں انعام بھی ملے گا "___

زہرہ بائی نے اپنی ماں کی مدد کے لیے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"آپ حکم کریں مَیں حاضر ہوں ___ انعام کی کیا بات ہے جی "___

محمد دین بھی ضرورت سے زیادہ تابعداری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"یہ لو ___ یہ انگوٹھی رکھ لو۔ سونے کی ہے اور فضل شاہ صاحب کو ہمارا پیغام پہنچا دو "___

عنایت بائی نے اپنی چھنگلی اُنگلی سے ایک ہلکا سا سونے کا رِنگ اُتار کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"نہ نہ ناں جی ___ خدا کے لیے کوئی اور کام بتائیں میری جان بھی حاضر ہے لیکن اس وقت شاہ صاحب کی حویلی کی طرف جانے کی ہمّت نہیں کر سکتا آپ کا پیغام تو شاید وہاں پہنچے نہ پہنچے اُن کے خونخوار کُتّے میری تِکّا بوٹی کر ڈالیں گے ___ کوئی اور خدمت بتائیں میری جان بھی حاضر ہے" ___

محمد دین نے سہم کر کہا۔

"اچھا تم نے حنیف خان کا نام سُنا ہے" ___

اچانک ہی زہرہ بائی کو نیا خیال سُوجھا تھا۔ اُس نے اندازہ لگا لیا کہ صبح تک اُن کا پیغام یہاں سے کوئی بھی شاہ صاحبان تک پہنچانے کی جرأت نہیں کرے گا۔

"وہ نتھو خان کا لڑکا ___"

محمد دین نے سوالیہ انداز سے پُوچھا۔

"ہاں ہاں وہی ___ وہی۔ اسے تم میرا پیغام دو کہ ہم یہاں تھانے میں بند ہیں" ___

زہرہ بائی نے بیقراری سے کہا۔

"لیکن اس کا تو گاؤں یہاں سے چار یا پانچ میل دُور ہے اس وقت گھوڑی لے جانا پڑے گی" ___

محمد دین اِس مہم کے لیے تیار تھا۔

"گھبراؤ نہیں ___ جتنا خرچ آئے گا اُس سے دس گنا زیادہ تمھیں ملے گا۔ لو یہ بھی رکھ لو ___ اور تمھیں حنیف خان سے بھی انعام دلاؤں گی" ___

اُس نے بھی اپنا سونے کا رِنگ اُتار کر محمد دین کی طرف بڑھایا ___

محمد دین نے ہاتھ بڑھا کر اُس کا رِنگ بھی قابو کر لیا تو عنایت بائی کو یوں لگا جیسے کسی نے اُس کے دل پر زور سے گھونسہ مار دیا ہو ___ اُس نے کھا جانے والی

نظروں سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا جس نے معمولی سے کام کے لیے اتنا زیادہ خرچ کر دیا تھا۔

لیکن ___

آج اس کی بیٹی کو اپنی ماں کی نظروں کی بالکل پرواہ نہیں تھی ___

"مَیں ابھی نکل جاؤں گا۔ آپ بے فکر رہیں" ___

محمد دین نے انھیں مطمئن کیا۔

"مولا تمھارا بھلا کرے ___ ہم تمھیں کبھی نہیں بھلائیں گے ___ وہاں شہر میں آنا تمھیں اچھی طرح موج میلہ بھی کرا دوں گی" ___

عنایت بائی نے بادل نخواستہ کہا۔

سپاہی محمد دین نے ساری زندگی حرام کمایا اور کھایا تھا لیکن اس طرح اس پر کبھی ہُن نہیں برسا تھا۔ اُس کے تو خوشی کے مارے ہاتھ پاؤں پھُول گئے۔

اُس گرگ جہاں دیدہ نے اندازہ کر لیا کہ ضرور اس طوائف زادی کا حنیف خان سے کوئی ناجائز تعلق ہے۔ وہ خود نتھو خان کا ہمسایہ اور اس کے ساتھ والے گاؤں کا رہنے والا تھا اُسے علم تھا کہ نتھو خان کتنا بڑا اسمگلر ہے اور اُس کا بیٹا تو باپ سے بھی دو ہاتھ آگے تھا ___

آج تک ان لوگوں نے دولت کے بل بوتے پر ہی تو خود کو پولیس سے بچاتے رکھا تھا۔ محمد دین کو اُمید تھی کہ جب وہ حنیف خان تک اُس کی محبوبہ کا پیغام پہنچائے گا تو حنیف خان بھی خوش ہو کر اُسے ضرور کسی بڑے انعام سے نوازے گا۔

اور ___

یہ کوئی ایسی معمولی "ڈیل" نہیں تھی جو وہ محض چوہدری نظافت کے خوف یا جذبہ تابعداری کے تحت چھوڑ دیتا۔ اُس نے کمرے کا دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں پہنچتے ہی شدید پیٹ درد کا سوانگ رچایا تھا۔

ایسا درد اُسے کبھی کبھی اُٹھا کرتا تھا۔

اگلے ہی لمحے وہ تھانے کی سرکاری گھوڑی پر ڈاکٹر سے ادا لینے کے بہانے حنیف خان کے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔ تھانیدار چوہدری نظافت کا چہیتا ہونے کے سبب، اُسے چھٹی لینے کی ضرورت نہیں تھی۔



ریاست شاہ نے اپنے بھائی فضل شاہ کے ساتھ خود آگے بڑھ کر اُس کا استقبال کیا تھا ——!

"شاہ جی مَیں تو سمجھتا تھا کہ بڑی ٹیڑھی عورت ہو گی لیکن وہ تو سالی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی" ——

ایس ایچ او نے اپنی گردن پھلا کر نمبر بنانے شروع کیے۔

"چوہدری صاحب اصل امتحان تمھاری ہماری دوستی کا اب شروع ہو گا۔ بڑے حساب سے سارے معاملات نمٹانے ہیں۔ میری بات سمجھ گئے ناں ——! ہاں علی الصباح ہی اُن دونوں کو ڈیوٹی مجسٹریٹ کی کوٹھی پر لے جانا —— مَیں نے فی الوقت تین دن کے ریمانڈ کا بندوبست کر لیا ہے —— اسی طرح تم پر کتنا ہی دباؤ آئے تم تین دن تک تو انھیں اپنے قبضے میں رکھ ہی سکتے ہو —— میری بات سمجھ گئے ناں —— اور ہاں مَیں بھی کل اس وقت فضل شاہ کو تھانے میں بھیجوں گا جب تم ان کا ریمانڈ حاصل کر چکے ہو گے —— اس کے بعد کیا کرنا ہے؟ اس کا فیصلہ آنے والے حالات کو دیکھ کر کریں گے —— عین ممکن ہے کوئی نئی چال چلنی پڑے۔ ابھی تو بہت کچھ ہونا ہے —— کہیں بھی اپنے منصوبے میں تبدیلی کرنی پڑے گی۔ بنیادی بات یہ ہے کہ تین دن تک دونوں کو رہا نہیں کرنا جس کے لیے قانونی تحفظ ہم فراہم کر دیں گے اور جب رہا کرنا ہے تو ہماری سفارش سے اور کسی کی نہیں —— نہ ہی انھیں کسی اور کی سفارش حاصل کرنے کی کوشش کرنے دینا۔ میری بات سمجھ گئے ناں" ——

ریاست شاہ نے اسے تفصیل سے اپنے اگلے منصوبے سے آگاہ کرتے ہوئے

"شاہ جی نوکر ہیں آپ کے۔ جیسا آپ چاہیں گے ویسا ہو گا۔ یہ تو آپ خوامخواہ کا تکلّف کر رہے ہیں —— ریمانڈ نہ بھی حاصل کریں تو کوئی مائی کا لال انھیں تین روز تک نہیں لے جا سکتا —— میرا نام بھی چوہدری نظافت ہے۔ چوہدری نظافت" ——

ایس ایچ او کی گردن کچھ زیادہ ہی پھولنے لگی تھی۔ وہ نمبر بنانے کے چکر میں کچھ زیادہ ہی وفاداری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"چوہدری تم جانتے ہو ہم کبھی خوامخواہ کا تکلّف نہیں کیا کرتے۔ میرا اصول ہے چوہدری یا تو مَیں دشمن کے منہ کے سامنے مکّا لہرایا کرتا ہوں یا پھر اسے اتنی کاری ضرب لگاتا ہوں کہ وہ اپنے قدموں پر اُٹھ کر کھڑا نہ ہو سکے —— تم پلوال کے سرداروں کو نہیں جانتے —— انھوں نے گزشتہ تین سال میں بڑا "ہوم ورک" کیا ہے —— اپنی شہر والی کوٹھی انھوں نے صرف دی آئی پی کے لیے مخصوص کر رکھی ہے —— انھوں نے تین سال تک افسران بالا کو اپنا کانا کیا ہے جس کے بعد یہ لوگ میدان میں اُترے ہیں۔ یہ ساری دوڑ صرف شفقت خان اور اس کے بیٹے کو ٹکرا دینے کے لیے لگائی جا رہی ہے —— میری طرف سے عام حالات میں دونوں جہنم میں جائیں۔ عین ممکن ہے کہ الیکشن جیتنے کے بعد ہم ہی دونوں کا کانٹا صاف کر دیں لیکن ابھی نہیں —— فی الوقت باپ بیٹا ایک طوائف کے چکر میں آپس میں ٹکرا گئے تو سرداروں کی فتح ہو جائے گی جو ہماری سیاسی موت ہو گی چوہدری ہم گزشتہ پچاس سال سے اس علاقے پر حکمرانی کر رہے ہیں —— ہماری جڑیں یہاں بہت گہری ہیں کوئی عام قسم کا بدمعاش یا شریف زادہ ہم سے ٹکرانے کی ہمت نہیں کر سکتا —— سردار رشید نے بڑی لمبی پلاننگ کر کے میدان میں قدم رکھا ہے —— مَیں اُسے کبھی "انڈر ایسٹیمیٹ" کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا —— تم سمجھ گئے ناں میری بات" ——

ریاست شاہ نے اپنی آنکھیں دُور خلاؤں میں جما رکھی تھیں۔ شاید وہ چشمِ تصوّر سے آنے والے دَور کی ایک دھندلی سی تصویر دیکھ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے شاہ جی ــــ ایک عرض کرنا تھی اگر ۔ ۔ ۔"

اُس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ شاید کہنے کا حوصلہ نہیں پا رہا تھا۔

"ہاں ہاں کہو کیا بات ہے ــ کچھ پیسوں وغیرہ کی ۔ ۔ ۔"

"نہیں پیر بادشاہ ــــ نہیں نہیں ــــ بخدا یہ بات نہیں مَیں دراصل ۔ ۔ ۔"

اس مرتبہ تھانیدار نے تڑپ کر اُس کی بات کاٹی تھی اور ریاست شاہ
گھاگ نظروں نے اس کے اندر کی ہوسناکی کو دیکھ لیا تھا۔

"اوہ یہ بات ہے" ــــ

ریاست شاہ نے قہقہہ بلند کیا تو ایس ایچ او چوہدری نظافت کے
ہوتے اعصاب بھی ڈھیلے پڑ گئے۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ بڑے شاہ صاحب
کے دل کی بات سمجھ گئے ہیں۔

"چوہدری ہم اپنی برسوں کی دوستی کو دو ٹکے کی طوائف پر قربان نہیں کیا کرتے
ہم نے تمھاری محنت کا معاوضہ دے دیا ہے۔ اُن سے خود وصول کر لینا ـ
کی رات تمھیں ہماری طرف سے مکمل اجازت ہے" ــــ

ریاست شاہ نے کہا اور چوہدری نظافت بے قابو اس کے گھٹنے چھو
آگے بڑھ گیا۔

"آپ کے بچے جئیں شاہ جی ــــ بڑے طویل عرصے کے بعد ایسا ہیرا
لگا ہے" ــــ

اُس نے بے شرموں کی طرح قریباً ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔

"اب تم جاؤ" ــــ

ریاست شاہ نے اُٹھتے ہوئے کہا اور فضل شاہ کو اشارہ کر دیا جس نے
کی ایک اور گڈی زبردستی ایس ایچ او چوہدری نظافت کی جیب میں ٹھونس



تھانے پہنچ کر چوہدری نے سب سے پہلے سپاہی محمد دین کو اپنے کم

طلب کیا تھا۔

"سر جی وہ ڈاکٹر کی طرف گیا ہے"

منشی محرّر نے ایڑیاں بجاتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا؟ کیا دورہ پڑ گیا تھا اُسے؟"

چوہدری کو خوامخواہ ہی غصہ آ گیا۔

"جناب والا! وہی پرانا پیٹ درد ــ آپ حکم کریں سرکار خادم حاضر ہے ـ
جو خدمت بھی ہو" ــ

منشی کو اگر اپنے نمبر بنانے کا موقعہ ملا تھا تو وہ کیوں ضائع کرتا۔ وہ تو پہلے ہی
محمد دین سے بہت خار رکھتا تھا۔

چوہدری نے ایک بھرپور نظر اُس پر ڈالی اور اندازہ لگا لیا کہ بندہ اپنے کام
کا ہے ــــ

"اوئے کیا بنا ہے اُن عورتوں کا ــ انھیں کھانا دیا ہے یا نہیں ــ"

اُس نے اگلا سوال داغا۔

"جناب والا! کھانا انھوں نے نہیں کھایا۔ کچھ پھل فروٹ کھا لیا ہے"

منشی نے مؤدب لہجے میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے مَیں کرواتا ہوں انھیں ڈنر ـ منشی لڑکی کو میرے کوارٹر میں پہنچا دو ــــ
اور اُس کی ماں کو اپنی حفاظت میں رکھنا ــــ خبردار تمھارے علاوہ کوئی بھی اُن
کے نزدیک پھٹکا ــــ محمد دین کو بھی گشت ڈیوٹی پر بھیج دینا ــــ سمجھ گئے ناں" ــــ

چوہدری نظافت نے اُس کی طرف دیکھ کر آنکھ دباتی۔

منشی کے لیے تو بلّی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔

"حکم کی تعمیل ہو گی جناب"۔

اس نے ایڑیاں ــــ بجائیں۔

"کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیئے ــ ورنہ سالو ــ سب کی ایسی کھچائی کروں گا کہ

ساری زندگی پھر لائن ہی میں گزر رہے گی"

ایس ایچ او نے دبی دبی ڈانٹ پلا دی۔

"جناب آپ کو شکایت کا موقعہ ہی نہیں ملے گا"——

منشی نے غلاموں کی طرح گردن جھکا دی۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ ضروری اندراج کے بہانے زہرہ بائی کو اس کی ماں الگ باہر لے آیا۔ عنایت بائی نے جب سے اُن کے سامنے فضل شاہ کا نام تھا اس نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ یہ لوگ بہت ڈر گئے ہیں۔ بے چارے تھے قانون کے ہاتھوں مجبور تھے ورنہ انھیں بڑی عزت سے گھر پہنچا کر آتے۔ انھوں نے ماں بیٹی کو اتنا ہی احترام دیا تھا جتنا وہ اپنے گھر آنے والے گاہکوں کو د کرتی تھیں۔

جب منشی زہرہ بائی کو لے جانے لگا تو اُس نے یہی سوچا تھا کہ معمول کی کھ پڑھت ہوگی۔ یوں بھی اس کی بیٹی کوئی ایسی چھوچی نہیں تھی کہ شریف بچیوں کی طرح اُن کے قابو آجاتی۔ اس نے تو بڑی ہوشیاری سے حنیف خان کو بھی بہا بھیج دیا تھا۔

لیکن ——

اس کے اندازوں کے برعکس جب پانچ کے بجائے پندرہ بیس منٹ گئے تو اسے دھڑکا سا لگ گیا۔ پھر آدھا گھنٹہ گزر گیا لیکن زہرہ واپس نہ آئی تو اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس کے خدشات بجا ہیں۔ اُس نے شروع ہی تھانیدار کی آنکھوں میں ہوسناکیاں تیرتے دیکھ لی تھیں وہ نجانے کب سے اُس کی بیٹی پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

"کہیں بچی کو نقصان نہ پہنچ جائے —— یہ لوگ تو بڑے وحشی اور درند ہوتے ہیں"

اُس نے دل ہی دل میں سوچا اور سہم کر خود کو حالات کے دھار

چھوڑ کر بیٹھ گئی۔

اچانک ہی اُسے اپنے کمرے کے باہر لگا تالا کھلنے کی آواز سنائی دی۔

"یا مولا خیر"

اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

لیکن ——

اس کی خواہش کے برعکس وہاں "شر" موجود تھا۔ شراب کے نشے میں دھت منشی اندر داخل ہوا۔ اس نے سویلین کپڑے پہن رکھے تھے اور دیسی شراب کے بھبھوکے اُس کے منہ سے اُٹھ رہے تھے۔

"کیا بات ہے۔ تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟"

اُس نے معمولی سی مزاحمت کی پھر ہتھیار ڈال دیئے کیونکہ بصورت دیگر منشی کی طرف سے اُسے سنگین نتائج کی دھمکیاں دی گئی تھی اور تعاون کی صورت میں اگلے روز رہائی کا وعدہ بھی کر لیا گیا تھا۔

ساری رات منشی محرر اس کی بوٹیاں نوچتا رہا۔

ایسی صورت حال کا سامنا اس تھانے کے ایک اور کونے والے کمرے میں اُس کی صاحبزادی کو بھی تھا جس کے مزاحمت کرنے پر چوہدری نے سارے تھانے کو وہاں بلا لینے کی دھمکی دی تھی اور کہا تھا کہ وہ فضل شاہ کی سفارش اُسی صورت میں قبول کرے گا اگر زہرہ بائی اس کے ساتھ تعاون کرے۔

زہرہ بائی کے لیے یہ کوئی مہنگا سودا نہیں تھا۔ وہ کوئی باکرہ نہیں تھی۔ نہ ہی اُس کے لیے یہ کوئی نئی صورت حال تھی۔ اس طرح کی جسمانی رشوت اپنی ماں کے حکم پر وہ درجنوں مرتبہ پہلے بھی اس قماش کے پولیس افسروں کو پیش کر چکی تھی——!

اُن کے پاس اس سے زیادہ کارگر ہتھیار اور کون سا ہو سکتا تھا؟

اپنی ماں کے برعکس اُس نے چوہدری نظافت سے اس کی توقعات سے بڑھ کر تعاون کیا اور جلد ہی اُسے چاروں شانے چت کر دیا۔

صبح تک دونوں ماں بیٹی پھر اکٹھے بند تھے ——!

انھوں نے تھانیدار کے ذاتی باتھ روم میں غسل کیا اور پُرتکلف ناشتہ کیا تھا۔
تھوڑی دیر بعد میں ایس ایچ او چوہدری نظافت انھیں رہائی دلانے کے لیے معمولی سی قانونی کارروائی کے بہانے ڈپٹی مجسٹریٹ کے گھر کی طرف لے جا رہا تھا۔
آج چھٹی کی وجہ سے مجسٹریٹ صاحب گھر پر موجود تھے۔ سید ریاست شاہ کا خاص سرکاری وکیل پہلے ہی سے اُن کی خدمت میں موجود تھا۔ عورتوں کو یہاں لانا تو محض تکلف ہی تھا۔

اُن لوگوں نے ریمانڈ کے کاغذات اُن کی آمد سے پہلے ہی مکمل کر لیے تھے۔

○

رات ایک پہر ڈھل گئی تھی جب انعام کے لالچ میں سپاہی محمد دین نے حنیف خان کو گہری نیند سے بیدار کیا۔

اتنی رات گئے حنیف خان تک پہنچنے کے لیے کئی انکوائریوں سے گزرنا پڑا۔
اُس کے ڈیرے پر موجود لوگ شاید اُس کی ہڈی پسلی ہی توڑ دیتے وہ تو اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہاں موجود ایک بدمعاش نے اُس کی شناخت کر لی کہ یہ ساتھ والے گاؤں کا رہنے والا سپاہی محمد دین ہے۔

اُن لوگوں نے تو اُسے کافی دیر تک اس سلسلے میں بٹھائے رکھا کہ وہ آخر حنیف خان کے لیے کیا پیغام لایا ہے کیونکہ اتنی رات گئے اُسے بیدار کرنا بھی وہ مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ ایک بات کا اندازہ تو انھیں تھا کہ محمد دین کم از کم اُسے گرفتار کرنے نہیں آیا نہ ہی کسی غلط ارادے سے آیا ہے ورنہ وہ سانپ کی باہی میں اکیلا ہاتھ نہ دیتا اپنے ساتھ مکمل گارد لے کر آتا۔ بس اُن کی یہ خواہش تھی کہ اپنے مالک کو نیند سے بیدار کر کے تنگ نہ کریں۔ اگر کوئی معمولی بات ہے تو یہیں نمٹا لیں۔

لیکن ——

محمد دین بھی بضد تھا کہ وہ صرف حنیف خان سے ہی بات کرے گا۔
بالآخر انھیں محمد دین کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے اور انھوں نے حنیف خان کو نیند سے بیدار کر کے یہ پیغام پہنچایا۔ پہلے تو حنیف خان نے نیند سے اُٹھانے والے کو بے شمار مغلظات سے نوازا کہ ایسی کیا قیامت آگئی تھی انھوں نے اُسے جگانا ہی مناسب سمجھا پھر بڑے غصے میں حویلی کے اس حصے میں آیا تھا کہ محمد دین کا استقبال دو چار تھپڑوں سے کرے۔

لیکن ——

مبادا وہ کوئی بہت ایمرجنسی کی خبر نہ لایا ہو۔ یہی سوچ کر اُس نے باقی نوکروں کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور اُس سے پیغام وصول کر لیا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم"؟

حنیف خان نے جب محمد دین کے مُنہ سے عنایت بائی اور زہرہ بائی کا نام سُنا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

اُس نے اگلے روز کے لیے بڑے بڑے پروگرام بنائے تھے جن میں ایک رات کے لیے زہرہ بائی کا مجرہ اپنے گاؤں میں کروانا بھی شامل تھا۔

لیکن ——

یہاں تو گنگا ہی اُلٹی بہہ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے شکریہ تم جاؤ —— اگر رات رہنا ہے تو یہیں قیام کرو۔ میں بندوبست کروا دیتا ہوں"۔

اُس نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا کہ محمد دین کی "خدمت" کر دے۔ جس نے محمد دین کی جیب گرم کر دی۔ حنیف خان کے اشارے پر اسے ضرورت سے زیادہ ہی خوش کر دیا گیا تھا۔ محمد دین نے اب یہاں مزید ایک پل رُکنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا اور گھوڑی کو بھگاتا ہُوا تھانے تک لے آیا تھا۔

رات کا باقی پہر کروٹوں کی نذر ہو گیا۔

حنیف خان کو ایک پل کے لیے بھی نیند نہیں آئی تھی۔ اُسے رہ رہ کر خیال آرہا تھا کہ زہرہ بائی اُس کی راہ دیکھ رہی ہو گی۔ اس نے آخر حنیف خان کو پیغام بھیجا ہے تو اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ ان حالات میں سب سے زیادہ اعتماد اس پر کرتی ہے۔ حالانکہ تھوخان نے اُسے اپنے ساتھ شاہ پور جانے کے لیے کہا تھا کیونکہ شاہ صاحب کا پیغام آیا تھا۔

لیکن ——

حنیف خان نے محض زہرہ بائی کے مجرے کے لیے اس پیغام کی پرواہ نہیں کی تھی اور اپنے باپ سے بھی زندگی میں پہلی مرتبہ جھوٹ بول دیا تھا کہ وہ اس کے پیچھے پیچھے آرہا ہے۔ اب اُسے واقعی اپنے باپ کے پیچھے جانا تھا۔ اس وقت وہ شدت سے نذیرے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ اگر نذیرا مل جائے تو سارا مسئلہ منٹوں میں حل ہو جائے گا۔

لیکن ——

نذیرا ہی کیوں؟

اُس نے سوچا۔ آخر وہ کیوں نہ فضل شاہ سے براہِ راست بات کرے۔ زہرہ بائی کو رہا ہونا چاہیئے تھا اُس نے زہرہ بائی اور اُس کی ماں کے سامنے اپنی نمود و نمائش کا بڑا زبردست بندوبست کر رکھا تھا۔ چار رائفل بردار اور جیپ تیار رکھی تھی کہ خوب بن سنور کر اور ٹھاٹ باٹھ سے وہاں جائے گا۔

ان حالات میں اگر کوئی اُس کے کام آسکتا تھا تو وہ ریاست شاہ اور فضل شاہ تھے حنیف خان کو سیّدوں کی طاقت کا علم تھا۔ وہ جانتا تھا اُن کا حکم پہنچنے پر تھانے دار خود دونوں ماں بیٹی کے ساتھ معافی مانگنے چلا آئے گا۔ اس طرح اسے زہرہ بائی اور اس کی ماں کے سامنے شیخی بگھارنے کا بھی موقعہ مل سکتا ہے۔

علی الصبح وہ اکیلا ہی شاہ پور کی طرف روانہ ہو گیا۔

ریاست شاہ کے نوکروں نے اُس کا استقبال خاص مہمان کی طرح کیا تھا اور

ایک خاص آدمی فضل شاہ کو حنیف خان کی آمد کی اطلاع دینے چلا گیا تھا جو ابھی ابھی ناشتہ کر کے فارغ ہوا تھا۔

ایک پُراسرار سی مُسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیلتی چلی گئی اور وہ بھاگا بھاگا ریاست شاہ کے کمرے کی طرف چل دیا۔

"تو تیر نشانے پر خود بخود ہی جا لگا۔ مَیں تو منصوبہ بنا رہا تھا کہ کس طرح زہرہ بائی کی طرف سے حنیف خان کو پیغام بھیجا جائے اور وہ ہمیں زہرہ بائی کی سفارش کے لیے درخواست کرے۔ اِس کے بعد ہی ہم اُسے قابو کر سکیں گے۔ چلو اچھا ہوا یہ مسئلہ تو حل ہوا فی الحال تو آدھا گھنٹہ اُسے انتظار کرواؤ تاکہ چوہدری ضابطے کی کارروائی مکمل کر لے۔ اِس کے بعد مجھ سے ملاقات میں مزید آدھا گھنٹہ لگا دو —— اُس کی آتشِ شوق کو بھڑکاتے جاؤ فضل شاہ —— لیکن خیال رکھنا ایک نذیرے موچی نے اتنا نقصان کر دیا ہے کہ اب ہم کسی اور نذیرے کے متحمل نہیں ہو سکتے ——"

ریاست شاہ نے حقّے کا کش لگاتے ہوئے دُھواں فضا میں بکھیرا۔

"ٹھیک ہے شاہ جی —— ایسے ہی ہو گا" ——

یہ کہہ کر فضل شاہ باہر آگیا۔

اُس نے اپنے خاص آدمی کو جو یہ پیغام لایا تھا مزید ہدایات کے ساتھ باہر بھیج دیا۔ جس نے باہر جاتے ہی حنیف خان کو خبر دے دی۔

"مَیں نے حویلی میں پیغام بھیج دیا ہے تھوڑی دیر میں شاہ صاحب اُٹھ جائیں گے اُن کا حکم ہے کہ اگر اُن کے سوتے میں بھی آپ آئیں تو انھیں اُٹھا دیا جائے درصل رات شاہ جی بہت دیر تک میٹنگیں کرتے رہے ہیں ناں —— بہرحال آپ ناشتہ کیجیے" ——

اُس نے حنیف خان کا جواب سُنے بغیر اپنے ایک ساتھی کو آنکھ مارتے ہوئے حنیف خان کے لیے ناشتہ لانے کا حکم دیا تھا

تھوڑی دیر بعد حنیف خاں کے سامنے دودھ، دہی، انڈے مکھن اور پراٹھے موجود تھے اور دو ملازم ہمہ تن اُس کی خدمت پر مامور ہو گئے۔

لیکن ——

اُسے اِن سب چیزوں کی ضرورت کہاں تھی ؟ پھر بھی اس نے اپنی مردانگی برقرار رکھنے کے لیے کچھ زہر مار کر لیا۔ جس کے بعد نوکر برتن اُٹھا کر لے گئے اور اب دودھ کا جگ اُس کے سامنے آگیا تھا۔

انھوں نے بڑی ہوشیاری سے اُلٹے سیدھے کاموں میں آدھا گھنٹہ ضائع کر دیا تھا۔ تقریباً پون گھنٹے بعد فضل شاہ اسے تیزی سے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔

"اوہ میرا بھائی آیا —— میرا ویر آیا۔ میرا حنیف خان آیا"

اُس نے حنیف خان کی شکل پر نظر پڑتے ہی مکاری سے باہیں پھیلا کر اُس کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔

بیٹھک میں موجود باقی لوگ فضل شاہ کے احترام میں خاموش ہو گئے تھے جو حنیف خان نے مسلسل اُس کی اور گھربار کی خیریت دریافت کر رہا تھا۔

"چاچا تو شاید نور پور کی طرف گیا ہے۔ وہاں آج بڑے شاہ صاحب کا جلسہ ہے ناں ——"

اُس نے حنیف خان سے کہا۔

"شاہ جی ایک ضروری کام آن پڑا ہے" ——

حنیف خان نے فوراً ہی کہہ دیا۔

"اوہ میں صدقے جاؤں۔ تمھارا کام ہمارا کام ہے حنیف خان —— حکم کرو سائیں حکم کرو ——"

فضل شاہ نے پھر اونچی آواز میں جوش و خروش کا مظاہرہ شروع کر دیا۔

"شاہ جی پرائیویٹ بات ہے"

حنیف خان نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"اوئے تم لوگ جاؤ اوے ——"

فضل شاہ نے اپنے خاص آدمی کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

"شاہ جی —— آج صاحب کا دورہ ہے —— ابھی تھوڑی دیر بعد انھوں نے آنا ہے۔ رات سے منشی آیا بیٹھا ہے اُسے حکم دیں تو واپس جائے۔ وہاں سب لوگ بہت پریشان ہیں" ——

اُس کے خاص آدمی نے کہا۔

"اوئے بلاؤ یار اُسے بھی اس وقت آنا تھا۔ میرا بھائی آیا ہوا ہے اور تم لوگوں کو اپنے کاموں کی پڑی ہے۔ ایک منٹ یار حنیف خان۔ اِدھر اسے سی نے آنا ہے۔ اگر اجازت دو تو منشی کو فارغ کر دوں" ——

اُس نے حنیف خان کی طرف مسکراتے ہوئے اجازت لی۔

"اوہ شاہ جی کوئی بات نہیں۔ آپ اطمینان سے بات کریں" ——

حنیف خان نے بادلِ نخواستہ اجازت دے دی۔

اور ——

شاہ صاحب کے منشی نے اِدھر اُدھر کی باتوں میں مزید آدھا گھنٹہ ضائع کر دیا۔ اس درمیان حنیف خان بیقراری سے پہلو بدلتا رہا۔ فضل شاہ کی زمانہ شناس آنکھیں اُس کے ایک ایک پل کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"اب دفع ہو جاؤ اور کسی کو اندر نہ آنے دینا" ——

اُس نے اپنے منشی سے بالآخر کہا اور سب لوگ باہر چلے گئے۔ فضل شاہ نے اندازہ کر لیا تھا کہ اب تک چوہدری نظافت دونوں کا ریمانڈ لے کر واپس آچکا ہو گا۔

"کیا کہہ رہے ہو یار —— تمھیں کس نے اطلاع دی" ——

فضل شاہ نے حنیف خان کی بات پر حیرانگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی بالکل صحیح ہے۔ تھانے کے ایک سپاہی نے مجھے پیغام پہنچایا ہے" —— حنیف نے کہا۔

حنیف خان یار اللہ خیر کرے نذیرا بھی کل سے غائب ہے۔ اب تم نے یہ خبر سنا

دی ــــ کہیں کوئی بڑا افسر تو نہیں پڑ گیا اوپر سے ــــ اس تھانیدار کی کیا مجال ہے کہ ہمارے علم میں لائے بغیر ہمارے کسی آدمی کو گرفتار کرے ــــ اگر ایسا ہوا بھی ہے تو عنایت بائی کو ہماری طرف پیغام بھیجنا چاہیے تھا۔ خیر میں دیکھتا ہوں"۔

یہ کہتے ہوئے اُس نے اپنے منشی کو آواز دی جو دوسرے ہی لمحے اس کے سامنے موجود تھا ــــ

"فوراً تھانے جاؤ اور ابھی چھوٹے تھانیدار امیر علی کو بلا لاؤ ــــ پہلے دیکھیں تو سہی معاملہ کیا ہے۔ کمال ہے ہمارے علاقے میں اتنا اہم واقعہ ہوا اور ہمیں خبر نہ ملے۔ اور اُدھر نذیرے کو بھی دیکھتے جانا ــــ وہ بھی کل سے نہیں آیا" ــــ

اس نے منشی کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

منشی اس کا اشارہ سمجھ کر سر ہلاتا چلا گیا۔

اس کی واپسی قریباً ایک گھنٹہ بعد ہوئی تھی ــــ

"اتنی دیر تک کہاں مر گئے تھے ــــ"

فضل شاہ نے اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی اس پر چڑھائی کر دی۔

"شاہ جی میری عرض سُن لیں بادشاہو ــــ تھانے میں کوئی افسر نہیں تھا۔ چھوٹا تھانیدار نور پور گیا ہوا ہے۔ میں اس کا انتظار کرتا رہا ــــ اب وہ آیا ہے تو آپ کا حکم پہنچا آیا ہوں۔ وہ بے چارہ میرے ساتھ ہی آ رہا تھا کہ ڈی آئی جی صاحب کا فون آ گیا ــــ مجھے تو کوئی گڑبڑ نظر آتی ہے۔ سُنا ہے شہر سے دو عورتوں کو گرفتار کر کے لائے ہیں ــــ"

منشی نے ہوشیاری سے بات بڑھائی۔

"کہیں نور پور والا کیس تو نہیں کُھل گیا ــــ مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ سردار کوئی بدمعاشی ضرور کریں گے۔ انھوں نے ہی شاید ــــ خیر کچھ بھی ہو امیر علی کہاں ہے ؟"

فضل شاہ نے بات بدل کر پوچھا۔

"آ رہا ہے سرکار ــــ چند منٹ میں پہنچ جائے گا ــــ"

منشی نے کہا ــــ

چند منٹ کے بجائے قریباً ایک گھنٹے بعد امیر علی آیا تھا۔ جس نے آتے ہی ڈیری کی معافیاں مانگنی شروع کر دیں۔

"سید بادشاہ ہم پر تو عذاب نازل ہو چکا ہے۔ ایس پی نے کل سارا دن تھانے میں گزارا اور اپنے سامنے بٹھا کر کارروائی مکمل کی ہے ــــ وہ نور پور سے جو لڑکی اغوا ہوئی تھی ناں ــــ وہی ماچھن ــــ اُس کے لواحقین نے بڑا طوفان اُٹھایا۔ خدا جانے یہ لوگ شہر میں کس طرح پہنچ گئے اور انھوں نے گورنر صاحب کے سامنے مظاہرہ کیا ــــ جنھوں نے ایس پی صاحب کو سخت ڈانٹ پلائی اور حکم دیا کہ خود سارے آپریشن کی نگرانی کریں ــــ ایس پی نے اپنی خصوصی گارد بھیج کر نذیرو موچی کو گرفتار کیا اور ہمیں کانوں کان خبر نہیں ہونے دی۔ خدا جانے اُسے کہاں لے گئے ہیں۔ جس کے بعد چوہدری صاحب کو حکم ملا کہ شہر سے عنایت بائی کو گرفتار کر لائے جس پر لڑکی فروخت کرنے کا شک کیا جا رہا ہے ــــ مائی باپ ہم تو بہت شرمندہ ہیں۔ چوہدری صاحب نے مجھے حکم دیا تھا کہ آپ کو خود اطلاع پہنچاؤں لیکن ایس پی تو ٹلنے کا نام نہیں لے رہا تھا ــــ اب وہ گیا ہے تو میں آیا ہوں" ــــ

منشی نے امیر علی کو پڑھا دیا تھا کہ اُس نے کیا کہانی سُنانی ہے۔

"ہوں ــــ تو یہ بات ہے۔ اب میں سمجھا۔ میں بھی حیران تھا کہ کیا بلا آن پڑی ہے۔ خیر ــــ دیکھ لوں گا ایس پی کو بھی۔ بڑا ایماندار بنتا ہے سالا ــــ تم یہ بتاؤ کہ وہ دونوں عورتیں کہاں ہیں ــــ"

فضل شاہ نے پوچھا۔

"سرکار ــــ اُن کا تو تین دن کا ریمانڈ ہو گیا۔ اُن کے ڈیرے سے دو اغوا شدہ لڑکیاں برآمد ہوئی ہیں۔ ایس پی صاحب تو کم از کم دس دن کے ریمانڈ کا کہہ رہے تھے لیکن انھوں نے رات آپ کا نام لے دیا ــــ ہم نے آپ کو جگانا مناسب نہیں سمجھا لیکن فکر کی کوئی بات نہیں مائی باپ ــــ مجسٹریٹ بڑے چوہدری صاحب کے ملنے والے ہیں۔ انھوں نے کارروائی ڈالنے کے لیے تین دن کا ریمانڈ ہی لیا

ہے ۔ایس پی نے بے چارے ایس ایچ او صاحب کو بہت ذلیل کیا لیکن کیا کر
جناب عورتیں آپ کا حوالہ دے رہی تھیں جس کے بعد اُن پر ہاتھ اُٹھانا ہمارے ل
توحرام ہو گیا ناں مائی باپ ——"

امیر علی نے چاپلوسی سے کہا۔

" امیر علی اُن عورتوں کو کسی کو اُنگلی نہ لگانے دینا اور جیسے ہی ایس ایچ او آ
اُسے میری طرف بھیجو —— میری بات سمجھ گئے ناں ——"

اُس نے امیر علی کی طرف مُنہ کر کے آنکھ دبائی۔

"جو حکم مائی باپ ۔ جیسے ہی چوہدری صاحب آتے ہیں ۔میں آپ کی خد
میں انھیں روانہ کرتا ہوں ——"

اور وہ سلام کر کے چلا گیا۔

دوپہر کے بعد پھر ایس ایچ او صاحب کی باری آئی جو قریبًا بھاگتے ہوئے
شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ بے چارے کا تیز تیز چلنے
سانس پھُول رہا تھا۔ اُس نے قریبًا فرشی انداز سے فضل شاہ کو سلام کہا تھا۔

" واہ چوہدری صاحب کمال کے آدمی ہیں آپ بھی —— ہمارے بندے ا
گرفتار کر لیے"——

فضل شاہ نے چھُٹتے ہی کہا۔

" سید بادشاہ مجھ کُتے کی یہ مجال کہاں ۔آپ کو کیا بتاؤں عالی جاہ کہ ہمارا ک
حشر ہو رہا ہے ۔اُن نور پور کے ماچھیوں نے تو ہمیں ناکوں چنے چبا دیئے ہیں ۔حضو
ہمیں تو کل سے ایس پی صاحب نے سانس نہیں لینے دیا ۔ساری رات تو وہ تھا
میں رہے ۔سارا آپریشن انھوں نے اپنی نگرانی میں کروایا —— ہم تو مفت میں ما
گئے شاہ جی ۔ جیسے ہی مجھے عِلم ہوا کہ وہ عورتیں آپ کا نام لے رہی ہیں میری
سرکار جان ہی نکل گئی ۔مائی باپ اپنی جان پر کھیل کر تین دن کا ریمانڈ کروایا ہے

اور ایس پی کو یہ کہہ کر تسلی دی ہے کہ مَیں خود ان کی تفتیش کر رہا ہوں — مجھے تو یہ
بھی علم نہیں کہ نذیرا اماں ہے ؟ خدا جانے کہیں اُسے سٹاف والوں کے حوالے
نہ کر دیا ہو —— یہ ایس پی بڑا خرانٹ ہے مالکو !کیا مجال جو وہ فون کے سامنے
سے ایک منٹ کے لیے بھی ہٹا ہو —— سارا تھانہ اس نے کل سے "سٹینڈ ٹو" کر
رکھا تھا۔ مجھے تو بازارِ حُسن روانہ کر دیا ۔کچھ گارد میرے ساتھ کر دی ۔باقی گارد کو
امیر علی کے ساتھ تھانے میں ہمہ وقت موجود رہنے کا حکم دے دیا —— سرکار ان سے
تو یوں لگتا ہے کسی نے بڑی اچھی طرح پڑھا کر بھیجا تھا —— کیا مجال جو اس نے آپ
سے رابطہ کرنے کی مہلت بھی دی ہو —— اب بھی بار بار فون کر کے کیس کی پراگریس
دریافت کر رہا ہے —— اصل میں معاملہ زیادہ خراب اس لیے ہوا ہے کہ اُن کے
ڈیرے سے دو اغوا شدہ لڑکیاں برآمد ہوتی ہیں"۔

اپنی بات مکمل کرنے کے بعد ایس ایچ او چوہدری نظافت نے داد طلب نظروں
سے فضل شاہ کی طرف دیکھا ۔جس نے گردن کے ہلکے سے اشارے سے اُسے شاباش
دی ——

" بڑا خطرناک آدمی ہے ۔ضمانت کی ذرا گنجائش نہیں چھوڑی ——"

فضل شاہ نے تشویشناک نظروں سے اُس کی طرف دیکھ کر کہا۔

" آپ سے بہتر کون جانتا ہے مائی باپ ——"

چوہدری نے انکساری سے کہا۔

" دیکھو چوہدری کچھ بھی ہو —— اب دونوں عورتیں ایک پل کے لیے تھانے میں
نہیں رہیں گی ۔اُن کی گنتی وہیں ڈالے رکھو —— انھیں ہمارے پاس رہنے دو —— اگر
ایس پی اچانک ریڈ کرے تو عورتوں کو یہاں سے لے جا کر پیش کر دینا —— اور
ہاں جو لڑکیاں برآمد ہوتی ہیں اُن کی طرف سے بیان لکھ لو کہ انھیں کسی نے اغوا
نہیں کیا اور وہ اپنی مرضی سے عنایت بائی کے پاس رہ رہی تھیں —— تاکہ مَیں تین
روز بعد ہائی کورٹ سے اُن کی ضمانت کروا سکوں —— عورتوں کو جیل نہیں جانا چاہیے

کسی بھی قیمت پر — خواہ تمھاری نوکری ہی کیوں نہ داؤ پر لگ جائے۔ ہم
تمھیں ایسی کتنی نوکریاں دلا دیں گے" —

فضل شاہ نے بظاہر فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

"جو حکم شاہ جی — آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔ میں خود انھیں لے کر حاضر ہوتا
ہوں۔ کچھ دیر ہو جائے تو معاف کر دینا سیّد بادشاہ — ذرا حکمت سے کام کرنا
پڑے گا۔ مجھے اپنی نوکری کی نہیں سرکار آپ کی عزت کی زیادہ فکر ہے۔"

چوہدری نے ڈرامے کا کلائمکس کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ — اپنا انعام لے جانا" —

فضل شاہ نے اس کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

"آپ کا دیا ہی کھاتے ہیں مائی باپ — آپ کے نوکر ہیں مائی باپ —"

اس نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر فضل شاہ اور حنیف خان کو سلام کیا جسے اب
سمجھ آ رہی تھی کہ جتنا خطرناک یہ معاملہ تھا۔ سرداروں کا تو باپ بھی انھیں رہا نہیں
کروا سکتا تھا — یہ تو فضل شاہ ہی تھا جس نے انھیں تھانے سے باہر نکلوا لیا تھا۔

اُسے امید ہو چلی تھی کہ جس طرح فضل شاہ کا رُعب داب تھانیداروں پر ہے اور
وہ اس کے حکم پر کٹھ پتلیوں کی طرح عمل کرتے ہیں اُس کے بعد سے تو دونوں کی رہائی
میں کوئی شک باقی نہیں رہ جاتا تھا۔

فضل شاہ تو اس کی توقع سے بڑھ کر اثر و رسوخ کا مالک نکلا تھا۔ یہ واقعی اس کا
کام تھا کہ وہ حنیف خاں کی خواہش پوری کر رہا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید حنیف خاں
ساری زندگی زہرہ بائی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہتا۔

○

تھانے پہنچ کر اس نے دونوں ماں بیٹی کو اپنے کمرے میں طلب کیا۔ جنھوں نے
حالات کے آگے مکمل ہتھیار ڈال کر خود کو تقدیر اور حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ
رکھا تھا۔

میں نے تمھارا پیغام شاہ صاحب تک پہنچا دیا ہے۔ جن کے حکم پر تمھیں ان کی
حویلی لے جا رہا ہوں۔ تمھارے متعلق بڑے سخت احکامات ہیں۔ فی الحال تمھارا تین
دن کا تفتیشی ریمانڈ ہے۔ شاہ صاحب نے حکم دیا ہے کہ میں تمھاری گنتی تھانے میں
ڈالوں لیکن تم ان کی حویلی میں رہو۔ کیونکہ فوراً تمھاری ضمانت نہیں ہو سکتی — تین روز
بعد ہی کچھ کریں گے تمھارے لیے — ایک بات کا خیال رکھنا اگر رات والے واقعات کا
اشارۃً بھی کبھی ذکر کیا تو ساری زندگی کے لیے جیل میں سڑتی رہو گی — خبردار — انھیں
یہ بھی بتانا کہ ان کا نام لینے کے بعد ہم نے تمھیں کچھ نہیں کہا — میری بات سمجھ گئیں
ناں" —

اس نے ماں بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"مولا تمھیں خوش رکھے چوہدری صاحب۔ آپ نے کیا کیا ہے — یہ تو ہمارا
فرض تھا۔ کبھی ڈیرے پر آئیں تو آپ کی جی بھر کر خدمت کریں گے۔ میں تو آپ کا مُنہ
موتیوں سے بھر دوں گی چوہدری صاحب — بس خدا کے لیے کسی طرح ہماری جان اس
کیس سے چُھڑا دیں۔"

"اُس موئے نذیرے پر ہی سارا عتاب ڈال دیں —"

عنایت بائی نے منت سماجت کرتے ہوئے کہا۔

واقعی اُسے رات کے سلوک پر کوئی پشیمانی نہیں تھی۔ پولیس سے وہ ایک طوائف
ہونے کے ناطے اس سے زیادہ اچھے سلوک کی توقع بھی نہیں رکھ سکتی تھی۔ یہ تو
چوہدری صاحب کی مہربانی تھی کہ انھوں نے خود ہی موج میلہ کیا — اگر کوئی اور تھانہ
ہوتا تو شاید وہ صبح ہونے تک اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل بھی نہ رہ جاتیں۔!
اور اب فضل شاہ اُن کی مدد کو آ گیا تھا —

اور اس نے کیا کیا تھا —

اُس کے لیے تو یہی بہت کچھ تھا۔ جان بچی سو لاکھوں پائے۔

تھوڑی دیر بعد تھانیدار اُن دونوں کو فضل شاہ کی گاڑی میں بٹھا کر اُن کے ساتھ

ہی فضل شاہ کی گاڑی سے باہر والی حویلی پر آ گیا تھا۔ جہاں حنیف خان نے ان کا استقبال کیا۔ اب زہرہ بائی کو سمجھ آ گئی کہ دراصل حنیف خان کی سفارش سے انھیں رہائی نصیب ہوتی ہے۔

"کیا حال ہے عنایت بائی ـــ سُنا ہے آج کل بڑی دعوتیں آ رہی ہیں تمھیں ـــ بھئی ہم نے تو اپنے یار کا حکم پورا کیا ہے ـــ"

فضل شاہ کے تین فقروں نے عنایت بائی کو ساری کہانی سمجھا دی تھی۔ اسے سمجھ آ گئی تھی کہ دراصل اُسے پلوال کے مجرے کی "ساقی" پکڑنے کی سزا ملی ہے۔

"شاہ جی ہم آپ کے تابعدار ہیں ـــ نوکر ہیں آپ کے شاہ جی" ـــ

یہ کہتے ہوئے عنایتی نے آگے بڑھ کر فضل شاہ کے گھٹنے پکڑ لیے ـــ

"خیر ہے ـــ خیر ہے ـــ کچھ نہیں ہوتا۔ حنیف خان ہمارا یار ہے۔ اس نے کہا تھا کہ تمھیں تھانے میں نہیں رہنا چاہیے سو ہم نے یہ کر دیا۔ تین دن تم ہماری مہمان رہو گی یہاں ـــ مجبوری ہے۔ قانون کا معاملہ ہے۔ اور ایس پی ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا ہے ـــ کسی وقت بھی تھانے پر ریڈ کر سکتا ہے۔ میں ذرا کام سے جاتا ہوں شام کو اکٹھے کھانا کھائیں گے ـــ"

اُس نے حنیف خان کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی۔

حنیف خان بے شرموں کی طرح دانت نکالنے لگا۔

اُسے سمجھ آ گئی تھی کہ فضل شاہ نے اُسے اکیلا کیوں چھوڑا ہے ـــ تھانیدار بھی اُس کے ساتھ واپس لوٹ گیا تھا۔

"پرچہ کچا کاٹا ہے ناں ـــ"

فضل شاہ نے جاتے جاتے کہا۔

"سرکار کے حکم کی تعمیل کی ہے"

چوہدری نے دانت نکالے۔

"ویل ڈن چوہدری ـــ اب پتہ لگے گا سردار رشید کو کہ ہم اُس سے بڑے

ڈرامے باز ہیں۔ آیا تھا ہمیں بے وقوف بنانے ـــ سکھوں کی اولاد ـــ بھلا کبھی سکھوں کو بھی عقل آتی ہے" ـــ

فضل شاہ نے کہا اور دوسری طرف گھوم گیا۔

حویلی میں ایک علیحدہ بلاک اُن کے لیے مختص کر دیا گیا تھا جہاں تمام جدید سہولتیں موجود تھیں۔

عنایت بائی تو آرام کرنے اپنے کمرے میں چلی گئی ـــ اُس نے جان بوجھ کر بیٹی کو حنیف خان کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ تاکہ وہ حنیف خان کا شکریہ ادا کر سکے جس نے اس نازک موقع پر اُن کی جان بچائی تھی۔

اور ـــ

زہرہ بائی نے اپنی ماں کے وہاں سے جاتے ہی حنیف خان کا اچھی طرح شکریہ ادا کر دیا۔

حنیف خان خود کو شہزادہ گلفام سمجھنے لگا تھا جس نے بے چاری خوبصورت شہزادی کو خطرناک جنات کے چنگل سے نجات دلائی تھی۔



اے ایس آئی محمد دین نے جب چوہدری نظافت کو تھانے میں آتے دیکھا تو اُس کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ پہلے تو اس نے یہی سوچا کہ عین ممکن ہے وہ کسی ذاتی کام سے آیا ہو۔ لیکن ـــ

ذاتی کام سے آنے کے لیے اُسے اپنے ساتھ اپنے تھانے کی گارد لانے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر اُسے خود ہی اپنے سوال کا جواب بھی مل گیا۔ جب انچارج خان صاحب نے اُس سے کہا کہ دو تین جوان تیار کر دے بازار میں چھاپہ مارنا ہے ـــ

محمد دین تو یہ اطلاع ملنے پر کہ وہ لوگ عنایت بائی کو گرفتار کرنے جا رہے ہیں چونک پڑا اور وہاں سے بہانہ کر کے کھسک گیا تھا۔ وہ اپنے بزنس پارٹنرز کے سامنے شرمندہ ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنی دانست میں بڑی محنت سے سارا منصوبہ بنایا

تھا اور جیسے عالم داد نے کہا تھا ویسے ہی کیا۔

لیکن ——

اس کی بد قسمتی کہ مقابلہ بھی زور والوں سے تھا۔

چوہدری نظافت اپنے ہمکاروں میں اپنے اکھڑپن کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتا تھا۔ کسی کو اس کے منہ لگنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

محمد دین سے اور تو کچھ نہ بن سکا۔ اُس نے فوراً ہی عالم داد کو فون کر کے اس حادثے کی خبر کر دی تھی۔

عالم داد نے اس کا فون سردار رشید اور سردار مُرید کی موجودگی میں سنا تھا۔

"کیا بات ہے۔ تمھارا منہ کیوں لٹک گیا"——

سردار رشید نے اس سے پوچھا۔

"سردار صاحب دشمن ہم سے زیادہ ہوشیار نکلا۔ ریاست شاہ نے عنایت بالا اور اس کی بیٹی کو کسی عورت کے اغوا کے الزام میں گرفتار کروا دیا ہے اور یہ بات تو مَیں بھی سمجھ سکتا ہوں کہ اس نے کم از کم تین دن کے لیے اُسے پولیس حراست میں رکھنے کا مکمل بندوبست کر رکھا ہوگا"——

عالم داد نے سردار رشید سے آنکھیں ملائے بغیر بات کی۔

"اوہ میرے خدایا —— یہ تو بہت بُرا ہوا۔ ہمارا تو سارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا"

سردار مُرید نے بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"مَیں نے تمھیں پہلے ہی کہا تھا عالم داد کہ ہاتھ پکا ڈالنا —— لیکن تم نے ——"

سردار رشید دانت پیسنے لگا ——

"بھائی جان عالم داد نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی —— یہ تو بس تقدیر نے ہی ہمیں ہار دے دی"——

سردار مُرید نے عالم داد کی وکالت کی۔

"چھوڑو یار —— یہ ہر بات تقدیر کے کھاتے میں نہ ڈال دیا کرو —— گاڑی نکالو اور شہر چلو۔ ہمیں فوراً آصف سے ملنا ہے"——

سردار رشید نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ تینوں اپنے دو باڈی گارڈز کے ساتھ شہر کی طرف جا رہے تھے۔ جہاں سردار رشید کا ایک بھانجا حال ہی میں اے ایس پی بن کر آیا تھا۔

"بیٹا معاملہ عزت کا بن گیا ہے —— دونوں عورتوں کو رہا ہونا چاہیئے اور تمھارے بھائی کی منگنی میں اُن کا مجرہ بھی ضرور ہونا چاہیئے ——"

ساری بات اپنے اے ایس پی بھانجے کو سمجھانے کے بعد اُس نے کہا۔

"دیکھتا ہوں انکل"——

بھانجے نے بد دلی سے کہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ مقامی تھانے میں رابطہ قائم کر چکا تھا۔ جہاں سے اُسے اطلاع ملی کہ دونوں عورتیں رہا ہو گئی ہیں۔

"وہ تو رہا ہو گئی ہیں انکل —— اُن کی ضمانت ہو گئی"——

اُس نے کاغذ پر کچھ نوٹ کرنے کے بعد اپنے ماموں سے کہا۔

"کس نے کروائی ضمانت"——

اس مرتبہ عالم داد نے بے چینی سے دریافت کیا تھا۔

"کسی فضل شاہ نے کروائی ہے"——

اے ایس پی نے اپنے سامنے رکھے کاغذ پر نظریں دوڑاتے ہوئے جواب دیا۔

"فضل شاہ ہم سے بڑا ڈرامے باز نکلا سردار صاحب —— خیر! کوئی بات نہیں۔ دیکھ لوں گا اسے —— کبھی دادے کی کبھی بابے کی —— ایک مرتبہ میری داڑھ تلے آ گیا تو پیس کر نہ رکھ دیا تو عالم داد نہ کہنا مجھے ——"

عالم داد نے غصّے سے کھولتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے۔ ایسا مکار آدمی۔ خود ہی گرفتار کروا دیا اور خود ہی رہا بھی کروا لیا ——"

"خیر ـــ کب تک رکھے گا اکٹھے باپ بیٹے کو۔ ایک منصوبہ ہے میرے ذہن میں۔"
اس نے سردار رشید کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اگلی بات کہہ دی۔
"فی الوقت تو اُس نے ہمیں نیچا دکھایا ہے عالم داد ـــ بعد کی دیکھتے رہو، خیر! اب ہمت ہارنے والی بھی کوئی بات نہیں ـــ ابھی تو کھیل کا آغاز ہوا ہے۔"
تینوں اُٹھ کر گاؤں کی طرف واپس لوٹ آتے۔

گھاؤ

تین دن اور راتیں حنیف خاں اُن کے ساتھ رہا ـــ
فضل شاہ نے اگلے ہی روز نتھو خاں کو گاؤں واپس بھیج دیا تھا تاکہ وہاں جلسے جلوس کا بندوبست کرے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُسے اپنے بیٹے کے کرتوت کا علم ہو۔
تین دن اور راتیں حنیف خاں نے خوب گلچھرے اڑاتے تھے۔ اس درمیان عنایت بائی کے لیے حیران کن بات یہ تھی کہ نذیرا وہاں نہیں آیا تھا۔ خدا جانے وہ کہاں مر گیا تھا۔ آخر تیسرے روز اس نے فضل شاہ سے پوچھ ہی لیا۔
"چھوٹی ذات کا تھا۔ کمینہ نکلا ـــ خیر بچ کر کہاں جائے گا۔"
فضل شاہ نے مختصر سی بات کر دی۔
عنایت بائی نے مزید کچھ پوچھنا مناسب ہی نہ سمجھا۔ اس کے لیے یہ اطلاع کافی تھی کہ نذیرے موچی کے سر سے فضل شاہ کا دستِ شفقت اُٹھ گیا ہے۔ اب اس کے پاس نذیرے کو اپنے گھر سے دھکے دے کر نکالنے کا جواز پیدا ہو گیا تھا۔
تیسرے دن اُن کی نام نہاد ضمانت بھی ہو گئی اور دونوں ماں بیٹی رہا ہو کر گھر آ گئیں ـــ فضل شاہ نے اپنی گاڑی اور ڈرائیور انھیں چھوڑنے کے لیے ساتھ کر دیا تھا۔
اس نے دمِ رخصت عنایت بائی کو الگ سے لے جا کر سمجھا دیا تھا کہ ان کی مرضی کے بغیر یا ان کے دشمن کی باتوں میں آ کر اگر اس نے آئندہ کوئی غلط حرکت کی تو وہ ماں بیٹی کو قتل کے الزام میں گرفتار کروا دے گا اور کوئی اُن کی سفارش کرنے والا نہیں ہو گا۔
"میں تمھیں دھندہ کرنے سے نہیں روکتا عنایت بائی ـــ لیکن تم نہیں جانتی کہ تمھیں

ایک خطرناک کام کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی گئی تھی — بظاہر تم بھی سمجھ رہی تھیں کہ تم بلوال میں مجرہ کرنے جا رہی ہو لیکن دراصل تمھیں ہمارے خلاف استعمال کیا جا رہا تھا اور ایسا کم از کم فضل شاہ کی زندگی میں نہیں ہو سکتا" —

عنایت بائی نے نذیر موچی کی غیر موجودگی میں سارا بوجھ اس کے سر پر پھینکنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"شاہ جی مولا تمھیں سلامت رکھے۔ اس میں ہمارا کیا قصور — میں نے تو خاص طور پر نذیرے غرقی پڑنے سے پوچھا تھا کہ ہم بلوال چلے جائیں کہیں آپ ناراض تو نہیں ہوں گے۔ اُس خانہ خراب نے مجھے گمراہ کیا اور کہا کہ اس پر بھلا آپ کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ورنہ میری کیا مجال تھی شاہ جی کہ آپ کے حکم کی خلاف ورزی کر سکوں۔ کچھ تو سوچیے کیا آپ مجھ سے ایسی توقع رکھتے ہیں — خدا نہ کرے شاہ جی کبھی ایسا دن آئے کہ میں آپ کے حکم سے سرتابی کروں — اس سے پہلے مجھے موت نہ آ جائے" —

عنایت بائی نے ٹسوے بہاتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی۔

"ہوں — تو اس کا مطلب ہے یہ سارا کیا دھرا اس آستین کے سانپ کا ہے —"

فضل شاہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"اور کیا شاہ جی — مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے وہ موا اندر خانے آپ کے دشمنوں سے ملا ہوا تھا اور اس نے جان بوجھ کر یہ کام کروایا تھا" —

عنایت بائی نے مزید تیل جلتی پر پھینکا —

اس کی تو شدید خواہش تھی کہ فضل شاہ نذیرے کو مروا ہی دے۔ اس طرح کم از کم نذیرے کی موت کے ساتھ اس کے بہت سے جرائم کا گواہ تو ختم ہو جاتا۔ نذیرا ہی تو آتے روز اُسے احساس دلاتا رہتا تھا کہ وہ بھی اُس کے جرم میں برابر کی حصہ دار ہے۔

"تم اس کو بھول جاؤ عنایت بائی — وہ ہم سے بچ کر کہاں جائے گا۔ اب حنیف خاں کو سنبھالے رکھنا — حنیف خاں کو ہمارے ہاتھ سے نہیں نکلنا چاہیے جب تک کہ ہم

چاہیں — اس کی ہر ضرورت پوری کرنا۔ پیسوں کی کوئی فکر نہ کیا کرو — ہمیں دولت سے بہت محبت ہے لیکن ہم نے اُسے اپنی عزت پر کبھی ترجیح نہیں دی —"

فضل شاہ نے کہا۔

"شاہ جی آپ نے باندی پر بہت احسان کیے ہیں۔ آپ کے ہر حکم کی تعمیل ہو گی۔ میں اُسے باندھ کر رکھوں گی — بچ کر نہیں جا سکے گا۔ ہم سے بچ کر جاتے گا بھی کہاں۔"

اُس نے بڑے تیقن سے کہا۔

"ٹھیک ہے اب تم جاؤ یہ رقم رکھ لو میں تمھارا نقصان نہیں چاہتا —"

یہ کہتے ہوئے اُس نے بڑے نوٹوں کی تین چار گڈیاں اس کی طرف بڑھا دیں۔

"شکریہ شاہ جی — مولا آپ کو آباد رکھے۔"

عنایت بائی نے ندیدے بچوں کی طرح نوٹوں پر جھپٹتے ہوئے کہا۔

"فضل شاہ کا ڈرائیور انھیں گھر کے باہر اُتار رہا تھا۔ جب اے ایس آئی محمد دین کو یہ اطلاع وہاں ڈیوٹی پر موجود اس کے ایک خاص سپاہی نے پہنچائی —

"چوہدری صاحب آ گئی ہیں واپس — اور وہ بھی ساتھ ہے وہی لمبا تڑنگا سا۔ گھنی مونچھوں والا نوجوان جس کے متعلق آپ نے بتایا تھا" —

"ٹھیک ہے شاباش — تم جاؤ اور اس کے گھر کے سامنے ہی ٹہلتے رہنا۔ سمجھ گئے ناں۔ اور ہاں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے —"

اُس نے سپاہی کو واپس بھیج دیا۔

محمد دین کو اس اطلاع کا انتظار تھا۔

دوسرے ہی لمحے وہ تھانے سے باہر تھا جہاں سے ایک پی سی او پر اس نے عالم داد کا نمبر ملایا اور اسے اپنے تازہ کارنامے کی خبر دی۔

ہوں ں ں — تو یہ بات ہے۔ شاباش محمد دین۔ شکریہ یار۔ تو نے میرا کام بہت آسان کر دیا۔"

اُس نے فون بند کر دیا اور اب وہ سیدھا سردار رشید کی حویلی کی طرف جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سردار رشید کے ساتھ اگلے پلان پر بات چیت کر رہا تھا۔

"عالم داد ـــــ یار اب مجھ میں مزید ذلالت برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں۔ ذرا سنبھل کر قدم اُٹھانا۔ میرا مطلب ہے سوچ سمجھ کر ـــــ کہیں پھر بازی اُلٹی نہ پڑ جائے۔"

سردار رشید نے عندیہ ظاہر کیا۔

"سردار صاحب ـــــ یہ ترپ چال ہے۔ آخری چال۔ جو کہ اُلٹی نہیں پڑتی۔ یہ نام بھی حوالدار عالم داد ہے۔ بس یہ سمجھیے کہ بارُود پر تیلی پھینکنے جا رہا ہوں ـــــ اب مَیں دیکھوں گا کہ ریاست شاہ کون سا پتّہ پھینکتا ہے۔ اُس نے اپنے آپ کو سمجھ کیا رکھا ہے ـــــ پولیس کی دھونس سے ہر کام نہیں چلا کرتا سردار صاحب ـــــ"

عالم داد نے بڑے تیقّن سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ گو آھیڈ ـــــ"

سردار رشید نے سگنل دے دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی سردار مرید اور عالم داد جیپ پر نتھو خاں کے گاؤں کی طرف جا رہے تھے۔ انھوں نے جانے سے پہلے اس بات کی تصدیق کر لی تھی کہ نتھو خاں گھر ہی پر موجود ہے ـــــ وہ آج صبح ہی شاہ پور سے واپس لوٹا تھا۔

ایک مرتبہ پھر سردار مُرید اور عالم داد کی آمد کی خبر نے نتھو خاں کو پریشان کر دیا۔ وہ گھر آئے مہمان کو دھکّے دے کر نکالنے سے تو رہا۔

لیکن ـــــ

اِن لوگوں کی آمد بھی اُس کے لیے کوئی نیک شگون نہیں تھا۔

خدا جانے اِس مرتبہ وہ لوگ کیا کھیل کھیلنے آئے تھے۔ پہلی مرتبہ تو وہ باپ اور بیٹا میں اختلافات کے بیج بو کر واپس لوٹے تھے۔

بادلِ نخواستہ نتھو خاں نے اُن کو خوش آمدید کہا تھا۔

"نتھو خاں مَیں نے تمھیں اُس روز بھی کہا تھا کہ سیاست اپنی جگہ اور ہمارے تعلقات اپنی جگہ۔ تم ہمیں ووٹ نہ دو ـــــ تمھاری برادری ہمیں ووٹ نہ دے۔ سردار صاحب

الیکشن ہار جائیں۔ ہمارے لیے یہ صدمات تو قابلِ قبول ہیں لیکن تمھاری واحد اولاد نرینہ کو محض اپنی گرفت میں رکھنے کے لیے ریاست شاہ اور فضل شاہ جو گھناؤنا کھیل تمھارے ساتھ کھیل رہے ہیں وہ تمھاری واحد اولاد تمھارے بیٹے اور ہمارے علاقے کے سُورمے حنیف خاں کو تباہ کر کے رکھ دے گا ـــــ"

"عالم داد ـــــ ہوش کے ناخن لو ـــــ کیا اوچھی حرکتوں پر اُتر آئے ہو"ـــــ

نتھو خاں نے تیزی سے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

اپنے بیٹے کی تباہی کے ذکر پر اُسے لگا جیسے کسی نے اُس کے کلیجے پر ہاتھ ڈال لیا ہو۔

"مَیں قول کا مرد ہوں نتھو خاں ـــــ اگر اپنی بات سچی ثابت نہ کر دوں تو ساری برادری کے سامنے میری مونچھیں کٹوا دینا"ـــــ

عالم داد نے اُسے مزید طیش دلایا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو عالم داد بھائی"ـــــ

اس مرتبہ نتھو خاں کا سالا اُس سے مخاطب ہوا تھا۔

"نذر محمد ـــــ نتھو خاں ہے سیدھا سادا بندہ۔ اُس نے بدمعاشی کی ہے مردوں کی طرح۔ لیکن اس کا واسطہ بڑے مکّار لوگوں سے پڑ گیا ہے۔ جنھوں نے حنیف خاں کو نشے اور عورت کی چاٹ لگا دی ہے تاکہ ساری زندگی کے لیے وہ انہی کا محتاج ہو کر رہ جائے۔ وہ طوائف جس نے ہمارے ہاں مجرہ کرنا تھا۔ فضل شاہ نے اُسے مٹھی میں لے کر حنیف خاں سے چپکا دیا ہے۔ جو آہستہ آہستہ ہمارے علاقے کے اِس شبر جوان کا بدن کھوکھلا کر رہی ہے۔ ابھی وہ شراب کے نشے پر لگا ہے جس کے بعد یہ لوگ اُسے ہیروئن کا نشہ لگا دیں گے اور پھر ساری زندگی کے لیے وہ فضل شاہ کی چوکھٹ سے لگا رہے گا"۔

عالم داد کی بات سُن کر نتھو خاں کا چہرہ شدّتِ غضب سے سُرخ ہونے لگا اُس کا جی چاہتا تھا کہ عالم داد کی زبان کاٹ دے۔

لیکن ـــــ

اُس کے سالے نذر محمد نے بڑی دُنیا دیکھی تھی۔ وہ ریاست شاہ کے باپ دادا

کو جانتا تھا اُن سے کچھ بعید نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ عالم داد سچ کہہ رہا ہو۔ نذر محمد جانتا تھا کہ نھتو خاں سیدھا سادا بدمعاش ہے اور اس کے سر میں دماغ نام کی کوئی شے موجود نہیں۔ اس سے پہلے کہ نھتو خاں طیش میں آکر صورتحال بگاڑتا نذر محمد نے صورتحال کو سنبھال لیا۔

"عالم داد بھائی ہم تیرے شکر گزار ہوں گے اگر تو ہمیں اس کا ثبوت دے دے۔ دوسری صورت میں ہم یہی سمجھیں گے کہ تم لوگ نھتو خاں کے ساتھ کوئی خطرناک کھیل کھیلنا چاہتے ہو"——

اُس نے کہا۔

"نذر محمد یہی بہترین موقعہ ہے۔ اس سے پہلے کہ ثبوت میرے ہاتھ سے نکل جائے نھتو خاں اور دو تین معززین کے ساتھ تم میرے ساتھ فوراً چلو۔ عین ممکن ہے کہ اگر فضل شاہ کو خبر لگ گئی تو وہ کھیل کا پانسہ ہی نہ پلٹ دے——"

عالم داد نے کہا۔

"عالم داد ایک بات یاد رکھنا اگر تم نے ہمیں دھوکہ دیا تو ہماری برادری کا بچہ بچہ کٹ جائے گا لیکن ہم تمھاری نسل کو ختم کر ڈالیں گے"——

نھتو خاں نے غصّے سے کانپتے ہوتے کہا۔

"نھتو خاں ہم وقت ضائع کر رہے ہیں۔ مَیں بطورِ ضمانت جا رہا ہوں۔ اگر عالم داد نے غلط بات کی ہو تو جو سزا تم مقرر کرو ہمیں قبول ہو گی"——

اِس مرتبہ سردار مُرید نے کہا تھا۔

"چلو چلتے ہیں"——

نھتو خاں نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد نھتو خاں، نذر محمد اپنی برادری کے تین اور معززین کے ساتھ ہو مُرید کی جیپ میں شہر کی طرف جا رہا تھا۔

دو گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ لوگ شہر کے بازارِ حُسن میں پہنچ گئے تھے جہاں

اے ایس آئی محمد دین بے چینی سے اُن کا منتظر تھا۔

عنایت بائی کے کوٹھے کے نزدیک واقع ایک ہوٹل کے کیبن میں اُس نے سب کو بٹھا لیا۔ اس سے پہلے جب تک اُس نے کوٹھے پر حنیف خاں کی موجودگی کی تصدیق نہیں کر دی۔ عالم داد کی جان میں جان نہیں آئی تھی۔

"نھتو خاں یہ اس علاقے کے تھانیدار صاحب ہیں۔ میرے دوست ہیں۔ تم نذر محمد کے ساتھ بے فکر ہو کر جاؤ۔ محمد دین تمھاری حفاظت کے لیے ساتھ جائے گا۔ تم جانتے ہو کہ حنیف خاں جوان آدمی ہے۔ اُس کا خون گرم ہے۔ کہیں ہماری شکل دیکھ کر اُسے یہ شک نہ ہو جائے کہ تمھیں ہم یہاں لائے ہیں اور وہ ہماری جان کا دشمن بن جائے —— ہماری ایک اور درخواست یہی ہے کہ یہاں سے واپسی کا سفر تم اپنے بیٹے کے ساتھ علیحدہ کرنا۔ ہمارا ساتھ جانا ٹھیک نہیں۔ میرا مطلب ہے مَیں کمزور آدمی ہوں سامنے نہیں آنا چاہتا"——

عالم داد نے رازداری سے کہا۔

"چلو جی چوہدری جی——"

نھتو خاں نے عالم داد کی بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے کہا۔ اُس کا غصہ دیدنی تھا۔



حنیف خاں کو اس کے باپ نے سوائے سرحد پار چوری اور سمگلنگ کے اور کچھ نہ سکھایا تھا اور نہ ہی چاہا تھا کہ وہ اس کے علاوہ کوئی گندا کام کرے——

اُسے شراب کے ذکر سے گھن آتی تھی۔

اُس نے اپنے بیٹے کو ساری زندگی ایک ہی سبق پڑھایا تھا کہ اگر اس نے اپنی مردانگی قائم رکھنی ہے تو اُسے شراب اور عورت سے بچ کر رہنا ہو گا۔ وہ اپنے بیٹے سے کہا کرتا تھا کہ مرد کے تناور وجود کو یہ دونوں چیزیں گھن کی طرح چاٹ جاتی ہیں——

اُس نے اپنے بیٹے کو اپنے پیشرو بدمعاشوں کے کئی واقعات سُنا کر ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ جس بدمعاش سے انگریز کی پولیس بھی تفتیش میں کچھ نہیں اُگلوا سکتی تھی۔ اس کو کسی طرح شراب یا عورت نے بزدل بنا کر اپنی ہی نظروں میں گرا دیا تھا۔

لیکن ——

آج اس کی واحد اُمید۔

اس کا شیر جوان بیٹا۔

اس کے خاندان کی آبرو حنیف خان ایک رنڈی کے پہلو میں بیٹھا گھٹیا قسم کی شراب سے دل بہلا رہا تھا۔

محمد دین کو پہلی مرتبہ اپنے جرم کی دُنیا کے دیرینہ ساتھی حوالدار کے سامنے ہزیمت اُٹھانی پڑی تھی۔ وہ تو جانے کب کا طیش کھائے بیٹھا تھا۔ عنایت بائی کے ایک پُرانے ملازم کو اپنی مُٹھی میں لے کر اُس نے اس گھر کے سارے راز اکٹھے کر لیے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ زہرہ بائی اس وقت حنیف خان کو کس کمرے میں لیے بیٹھی تھی۔

عنایت بائی اُن دو دیہاتیوں کو تو نہ پہچان سکی جو محمد دین کے ساتھ دھڑ دھڑاتے اس کے کوٹھے پر چڑھ آئے تھے۔

لیکن ——

اے ایس آئی محمد دین کی شکل پر نظر پڑتے ہی اس کا نشہ ہرن ہونے لگا۔ اُس نے آج بہت عرصے بعد حنیف خاں کے پیسوں سے ولایتی شراب کی بوتل خریدی تھی اور ندیدے بچوں کی طرح اُس پر پل پڑی تھی۔ اِس بات کا تو اُسے احساس تھا کہ اسے اے ایس آئی محمد دین کو اس پر بہت غصّہ آرہا ہو گا حالانکہ اُس بے چاری کا اس میں کوئی دوش نہیں تھا۔

ایک مرتبہ تو وہ لرز کر رہ گئی ——!

لیکن ——

خاندانی طوائف تھی۔ حوصلہ کرتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"آیئے چوہدری صاحب۔ ہمارے دھن بھاگ جو آپ تشریف لائے۔"

اُس نے اپنی روایتی زبان بولنی چاہی لیکن محمد دین اُس کی طرف دیکھے بغیر اُس بڑے سے کمرے سے گزر کر اس سے ملحقہ چھوٹے کمرے کا دروازہ کھول رہا تھا جسے بظاہر باہر سے کُنڈی لگا کر عنایت بائی نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ اندر کوئی موجود نہیں۔

محمد دین نے دروازے کی کُنڈی کو جیسے ہی ہاتھ لگایا۔ اندر موجود زہرہ بائی کا دل دھک سے رہ گیا۔

"کیا مصیبت آگئی ہے۔"

اُس کے مُنہ سے جیسے ہی یہ الفاظ نکلے۔ دروازہ زور سے کُھلا اور حنیف خان کو سامنے اپنے والد، ماموں اور ایک رشتہ دار کی شکلیں دکھائی پڑیں تو اس کے ہاتھ پاؤں گھبراہٹ سے پُھول گئے۔

اور ——

ننھو خاں کے لیے زندگی کا یہ سب سے بڑا جانگسل اور اندوہناک لمحہ تھا۔

اُس نے ساری زندگی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بسر کی تھی۔ سرحد کے آر پار وہ گولیوں کی بارش میں سے رینگ کر گزر جاتا تھا —— زندگی میں درجنوں مرتبہ ایسے مقامات آئے جہاں اُس کے اور موت کے درمیان چند ثانیے کا فرق ہی رہ گیا تھا۔

لیکن ——

اس پر کبھی ایک لمحے کے لیے گھبراہٹ یا خوف طاری نہیں ہوا تھا۔ اُس نے ساری زندگی شیر مردوں کی طرح گزاری تھی اور اپنے بیٹے کو بھی اس نہج پر پالا پوسا اور جوان کیا تھا۔ اُس نے اپنے بیٹے کو لاشعوری طور پر اس بات کا قائل کرنے کی کوشش کی تھی کہ بُزدلی کی زندگی جینے سے بہادری کی موت مر جانا کہیں احسن عمل ہے۔

لیکن ——

آج اُسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اُس کے ہاتھوں اور پیروں سے جان نکل گئی ہو۔ عمر کے اس حصّے میں بھی اس کی توانائیاں ناقابلِ چیلنج تھیں لیکن اب اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ صدیوں کا مریض رہا ہو اور کسی بھی لمحے اس کا چراغِ زندگی گُل ہونے والا تھا۔ غصّے اور افسوس سے اس کے منہ سے ڈھنگ کے الفاظ بھی نہیں نِکل پا رہے تھے۔ اُسے یہ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس وقت اپنے بیٹے کو کیا کہے۔!

" حنیفے ـــــ باہر آجا۔"

اُس لمحے جب نذر محمد نے حنیف خاں کو غصیلی آواز میں کہا تو نتھو خاں کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سالے نے اس کے دماغ سے منوں بوجھ اُتار دیا ہو ـــــ

" ماما تُو اَبّے کو لے چل مَیں آتا ہوں" ـــــ

حنیف خاں نے خود کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

" حنیفے ـــ کھڑا ہو جا۔۔۔۔"

اچانک ہی نتھو خاں گلا پھاڑ کر چلایا اور اپنے بیٹے کو اس نے آگے بڑھ کر بالوں سے پکڑ کر ایسا جھٹکا دیا کہ وہ سامنے دھرے صوفے پر جا گرا۔

جانے اُس کی آواز میں کیا رعد کڑکی تھی کہ زہرہ بائی کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی ـــ عنایت بائی بجلی کی طرح اپنی بیٹی کی طرف لپکی۔

لیکن ـــــ

نتھو خاں کو وہاں سوائے حنیف کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُس نے دوبارہ اُسے بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دے کر کھڑا کیا اور دیوانہ وار اُس پر پِل پڑا۔ زہرہ بائی اور اس کی ماں تو چیختی چلاتی کمرے سے باہر بھاگ گئی تھیں جب کہ نذر محمد اور محمد دین کے لیے نتھو خاں پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔

" نتھو ـــ ہوش کر۔ کیا سارے شہر کو تماشا دکھائے گا ـــ"

بالآخر نذر محمد نے جب اُسے بازو سے پکڑ کر جھٹکا دیا تو نتھو کو ہوش آ گیا۔ اس نے اندازہ کر لیا کہ یہ شہر کا بازارِ حسن ہے واقعی یہاں کسی بھی لمحے تماشا لگ جاتا۔ اس

کی بھلائی اسی میں تھی کہ اپنے بیٹے کے ساتھ یہاں سے نکل جائے۔

" چل میرے ساتھ چل ـــــ"

نتھو نے چلاتے ہوئے اپنے جواں سال چشم و چراغ کو سیڑھیوں کی طرف دھکا دیا تھا وہ بچوں کی طرح سر جھکائے شرمندگی سے اُس کے ہاتھوں پٹ رہا تھا۔

عنایت بائی اور اس کی بیٹی کے لیے یہ منظر اتنا اذیت ناک تھا کہ دونوں بھاگ کر دوسرے کمرے میں چھُپ گئی تھیں۔ انھوں نے احتیاطاً کمرے کو اندر سے کُنڈی لگا کر بند کر لیا تھا۔ عنایت بائی کی زندگی میں اس نوعیت کے صدمات کبھی نہیں آتے تھے۔ اس نے تو ساری زندگی بڑے طمطراق سے گزاری تھی۔

نتھو خاں اپنے بیٹے کو دھکیلتا ہوا نیچے تک لایا تھا جہاں نذر محمد نے فوری طور پر ایک ٹیکسی کار کا بندوبست کیا اور وہ لوگ لاری اڈے کی طرف چل دیئے ـــ"

حنیف خاں کا نشہ اُترا تو سب سے پہلے اُسے اپنی بے عزّتی کا جان لیوا احساس ہوا۔ اس کا محبوبہ کے گھر میں، اُس کی آنکھوں کے سامنے حنیف خاں کی جو دُرگت بنی تھی اُس نے حنیف کو کاٹ کر رکھ دیا تھا۔

" اَبّا تُو نے اچھا نہیں کیا ـــ"

بالآخر وہ لاری اڈے پہنچتے ہی پھٹ پڑا۔

" اور تو نے بہت اچھا کیا ـــ اوے کمبخت تجھے سمجھ نہ آئی کہ یہ تو تیری جوانی کے خلاف کھُلی سازش تھی ـــ فضل شاہ نے تیرے ساتھ دشمنی کی ہے۔ وہ تجھے مار ڈالنا چاہتا ہے ـــ"

نتھو کے بجائے نذر محمد نے جواب دیا۔

" تجھے یہاں بھیجا کس نے تھا" ـــ ؟

نذر محمد کی بات کا جواب حنیف خاں نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں سوال کرتے ہوئے دیا۔

تجھے اس سے کیا؟ تو چُپ چاپ گاؤں چل۔ مَیں دیکھوں گا اس مراثی کی اولاد

کو۔ اس چھوٹے شاہ کو دیکھوں گا مَیں ——— کس طرح جیتتا ہے الیکشن۔ سالے
پر مارتا ہوں پیسے ——— کیا سمجھ رکھا ہے اُس نے مجھے ——— ساری زندگی
سرحد پر بدمعاشی کی ہے۔ کسی کو جرأت نہیں تھی کہ میری طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتا
جانے کب میرے دماغ میں یہ فتور سما گیا جو مَیں اس موذی کے چنگل میں جا پھنسا

نتھو خاں نے پچھتاوے کا اظہار کیا۔

حنیف خاں کے گمراہ ذہن نے فوراً ہی اُسے دوسرا راستہ دکھا دیا۔ اس
سمجھ لیا کہ یہ ساری شرارت سرداروں کی ہو سکتی ہے۔ اُنھوں نے فضل شاہ سے
لینے کے لیے اُس کے باپ کو فضل شاہ کے خلاف بدظن کیا ہے ——— تاکہ نتھو خاں
ریاست شاہ کی حمایت سے الگ کیا جا سکے ———

لیکن ———

یہ ظلم ہو گیا تو زہرہ بائی سے بھی اُسے الگ ہونا پڑے گا۔ کیونکہ زہرہ اور اس
ماں کا تو رواں رواں فضل شاہ کا احسان مند تھا۔ اُنھوں نے زندگی میں شاید پہلی
اس کے حکم سے سرتابی کی جرأت کی اور اس کا خمیازہ بھی بھگت لیا اب تو اس
کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اس کی مرضی کے خلاف کچھ بھی کریں ———

نذیرا بھی نہیں رہا تھا۔ خدا جانے اس کے ساتھ کیا گزری اور وہ بھی بھاگ

اگر اس کا باپ ریاست شاہ کی حمایت سے الگ ہو گیا تو عین ممکن ہے کہ فضل
کے حکم یا اشارے پر زہرہ بائی بھی اُسے منہ لگانا چھوڑ دے۔

وہ تو زہرہ کے بغیر مر جائے گا۔

نہیں یہ نہیں ہونا چاہیے۔" اُس کے شیطانی ذہن نے راہنمائی کی کہ اُسے
فضل شاہ کے پاس پہنچ کر اُسے سارا معاملہ سمجھا دینا چاہیے تاکہ فضل شاہ پہلے ہی
بندوبست کر کے نتھو خاں کو ٹھنڈا کرے۔ وہ اپنے باپ کو جانتا تھا جس نے سا
زندگی نہ تو شراب کو چھوا تھا نہ ہی کسی غیر عورت کی طرف نظر بھر کے دیکھا تھا
کے نزدیک یہ دونوں ناقابلِ معافی جرم تھے۔

اور ———
اپنے بیٹے کا یہ جرم وہ کبھی معاف نہیں کر سکتا تھا۔ جن لوگوں نے اس موقعہ واردات
پر پہنچایا تھا وہ یقیناً اُسے یہ بھی سمجھا کر لاتے ہوں گے کہ یہ سارا کیا دھرا فضل شاہ کا ہے۔

"تم لوگ چلو مَیں بھی تمھارے پیچھے آ رہا ہوں"

حنیف خاں اتنا کہہ کر ایک طرف چل دیا۔

نتھو خاں اُسے گالیاں دیتا۔ اس ارادے سے اُس کی طرف بڑھا تھا کہ اسے اپنے
ساتھ ہی لے کر جائے۔

لیکن ———

اچانک اس کو زبردست ذہنی جھٹکے سے دوچار ہونا پڑا۔

"ابّا ہوش کر ——— مَیں نے تیری بہت عزت رکھ لی۔ تُو نے طوائفوں کے سامنے
مجھے ذلیل کیا مَیں خاموش رہا ——— اب تو بھی میری عزت کا خیال کر ——— مَیں کوئی
دودھ پیتا بچہ نہیں ہوں۔ کہہ دیا ناں کہ آ جاؤں گا تُو چل گھر ———"

اتنا کہہ کر وہ تیزی سے دوسری طرف مُڑ گیا۔

نتھو خاں غصّے سے بے قابو اُس کی طرف لپکا لیکن نذر محمد اور اس کے ساتھی نے
نتھو خاں کو پکڑ لیا۔

"نتھو ——— عقل کر۔ جوان اولاد ہے۔ ہاتھ سے نکل گیا تو ساری زندگی ہاتھ ملتا
رہ جائے گا" ———

نذر محمد نے اُس سے چلّاتے ہوئے کہا تو نتھو خاں کو واقعی عقل آ گئی۔

اُس نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ ایک بات اُسے اچھی طرح سمجھ آ
گئی تھی کہ اُس نے چوری کا دھندہ چھوڑ کر سیاست کا جو کاروبار شروع کیا تھا یہ اس
کے لیے نرے کا گھاٹا تھا ———

یہ لوگ اتنا اثر رکھتے ہیں اور اتنے گھٹیا ثابت ہوں گے۔ اس نے تو کبھی اس کا
تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس سے تو وہ چوری ہی ہزار گنا بہتر تھا۔

تھوڑی دیر بعد نتھو خاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس عزم کو لے کر اپنے گھر واپس جا رہا تھا کہ آج کے بعد وہ کبھی شاہ پور کی طرف مُنہ کر کے پیشاب بھی نہیں کرے گا۔

فضل شاہ اپنے بھائی ریاست شاہ کے ساتھ ہی موجود تھا جب حنیف خاں وہاں پہنچا۔ اُس کی خصوصی حیثیت اور اہمیت کے پیشِ نظر اُسے فوراً ہی شاہ صاحبان کے سامنے پیش کر دیا گیا جہاں حنیف خاں نے اچانک خود پر ٹوٹنے والی قیامت کی کہانی ان کے گوش گزار کر دی۔ فضل شاہ کے چہرے پر تو چند ثانیے کے لیے تشویش کے سائے لہرانے لگے۔

لیکن ——

ریاست شاہ کا چہرہ بالکل سپاٹ رہا۔

اُس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد حنیف خاں کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے شیطانی چال چلی ——

"حنیف خاں! تم مرد ہو۔ اس علاقے میں تمہارا ایک نام ہے۔ مرد جس کا ہاتھ پکڑ لیں اُسے چھوڑا نہیں کرتے۔ ہمیں کسی طوائف سے کچھ لینا دینا نہیں۔ ہم نے اُسے رہائی صرف تمہارے کہنے پر دلائی ہے لیکن ایک بات میں ضرور کہوں گا کہ اگر اس عورت نے تم پر اعتماد کیا ہے تو تمہارا فرض ہے کہ اُس کا ساتھ نبھاؤ"——

اُس نے حنیف خاں کی مردانگی کو للکارتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی! میں بھی نتھو خاں کا بیٹا ہوں۔ اگر زہرہ بائی کا ہاتھ پکڑا ہے تو مرتے دم تک نہیں چھوڑوں گا۔ ہم زبان کے پکّے لوگ ہیں۔ اگر میرے باپ نے الیکشن میں آپ کی حمایت کا فیصلہ کیا ہے تو اُسے بہر صورت پورا کرنا ہوگا۔ خواہ ہمیں اس کی کوئی بھی قیمت ادا کرنی پڑے ——"

حنیف خاں کو طیش آ گیا۔

ریاست شاہ بڑے مکّاری سے ایک ایک مہرہ آگے بڑھا رہا تھا۔ اس نے زندگی

کو کبھی شطرنج سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔

"حنیف خاں تمہارا خون ابھی گرم ہے —— تم سرداروں کو نہیں جانتے۔ وہ بڑے حرام کار ہیں۔ انھوں نے ہی یہ سارا چکر چلایا ہوگا۔ وہ جو حوالدار کی اولاد اُن کے ساتھ موجود ہے ناں —— وہ عالم داد وہی اس شرارت کی بنیاد ہوگا —— اس کا دماغ شیطان کا چرخہ ہے۔ سارا دن وہ شیطانی منصوبے بُنتا اور سرداروں کو پیش کرتا رہتا ہے اور سردار اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ یہ ساری سازش اُس نے تیار کی ہو گی۔ وہی تمہارے باپ کو وہاں لے کر گیا ہے۔ ادھر کس کی یہ جرأت ہو سکتی تھی۔ کوئی بات نہیں حنیف خاں تم ہمارے دوست ہو۔ ہم اپنے یاروں کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑا کرتے۔ ہم سرداروں اور عالم داد سے اس اوچھی حرکت کا بدلہ ضرور لیں گے۔ مجھے احساس ہے کہ تمہاری بہت بے عزّتی ہوئی ہے۔ مرد کو اگر اُس کی معشوقہ کے سامنے ذلیل کر دیا جائے تو وہ مٹی میں مل جاتا ہے لیکن تم مطمئن رہنا —— فضل شاہ! تم جاؤ اور نتھو خاں کو سمجھاؤ کہ یہ ساری شرارت سرداروں کی ہے جس کا مقصد اس کے اور ہمارے درمیان اختلافات پیدا کرنا ہے۔ وہ ہمارا بزرگ ہے اگر تمہیں گالیاں بھی دے تو خبردار اُف تک نہ کرنا۔ اس کے سامنے زبان نہیں کھولنا اور کیا نام ہے اُس کا زہرہ بائی اُسے بھی سمجھا دینا کہ وہ حنیف خاں کی عزّت میں ذرا فرق نہ آنے دے —— سمجھ گئے ناں"——

اُس نے اپنے بھائی کی طرف مُنہ پھیر کر آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

"بالکل سمجھ گیا بھائی جی —— بالکل سمجھ گیا۔ میں چاچے نتھو خاں کے پاؤں بھی اگر پڑ گیا تو کوئی بات نہیں۔ وہ ہمارے یار کا باپ ہے۔ اس کی ہم بہر صورت عزّت کریں گے اور حنیف خاں! تم بالکل مطمئن رہنا زہرہ بائی کی طرف سے اُس کی کیا مجال کہ تمہارے سامنے اُف بھی کر سکے —— میں اُسے سمجھا دوں گا کہ تم نے یہ ساری ذلّت اسی کی خاطر برداشت کی ہے —— اوہ یار تو بے فکر ہو جا۔ تو اب شاہ پور میں ہی قیام کر۔ میں سات آٹھ دن کے لیے تیری معشوقہ کو یہیں بُلا لیتا ہوں —— کس کی ہمت ہے جو یہاں

تیری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھے ــــ اور ہاں کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بالکل فکر نہ کرنا۔ آج رات ہی زہرہ بائی تیرے پاس پہنچ جائے گی ــــ ابھی تُو گاؤں نہ جا۔ تُو جوان آدمی ہے۔ سرداروں نے تیرے باپ کو بھڑکایا ہوا ہے وہ تو چاہتے ہیں کہ تم دونوں آپس میں ٹکرا جاؤ تاکہ وہ جی بھر کے تماشا دیکھیں لیکن ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے ــــ حنیف خاں! ہم انھیں تماشا دیکھنے کا موقعہ نہیں دیں گے ــــ"

فضل شاہ نے اپنے بھائی کی بات آگے بڑھائی۔

"شاہ جی آپ کا بہت شکریہ۔ مجھے بھی آپ ہمیشہ اپنا وفادار ہی پائیں گے۔ کبھی شکایت کا موقعہ نہیں ملے گا ــــ"

حنیف خاں نے گدھوں کی طرح بے وقوفی سے گردن ہلائی۔

"تم چلو حویلی میں ــــ تمھارے لیے مَیں نے حویلی کا ایک الگ حصّہ مخصوص کر دیا ہے۔ وہاں کوئی تمھاری اجازت کے بغیر نہیں آ سکتا ــــ چلو تم" ــــ

یہ کہہ کر اُس نے اپنے منشی کو آواز دی اور اُسے کچھ ہدایات دے کر حنیف خاں کے ساتھ باہر بھیج دیا۔

"فضل شاہ! آج رات ننھو خاں کی آخری رات ہونی چاہیئے ــــ اُسے کل صبح ڈھلنے سے پہلے پہلے قتل کروا دو ــــ قاتل کا کھُرا پلوال کی طرف جانا چاہیئے۔ حنیف خاں پر آج شام ہی کو زہرہ بائی کو مسلط کر دو ــــ اُس کا دماغ صرف وہی سوچے جو ہم چاہتے ہیں۔ اُس کے باپ کا قتل سرداروں پر ڈال دو۔ حنیف خاں کو یقین ہو جائے تاکہ سرداروں نے باپ اور بیٹے کے درمیان لڑائی میں ناکامی کے بعد باپ کو قتل کرا دیا ہے تاکہ اُسے ہماری حمایت کی سزا مل سکے ــــ ننھو خاں کے گاؤں میں موجود اپنے مہروں کو حرکت میں لاؤ۔ موقعے کے دو گواہ تیار کرنے چاہئیں جنھوں نے عالم داد اور سردار مرید کو موقعہ واردات کی طرف جاتے دیکھا تھا ــــ"

ریاست شاہ نے حنیف خاں کی روانگی کے فوراً ہی بعد فضل شاہ کو ہدایات دیتے ہوئے اگلا مشن سونپا۔

"شاہ جی ایسا ہی ہو گا ــــ آپ کے حکم کی تعمیل ہو گی" ــــ

فضل شاہ نے اپنے سوتیلے بھائی کے شیطانی ذہن کو دل ہی دل میں ہزاروں مرتبہ سلام کہتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

اُس کی گھنی مونچھوں کے نیچے مسکراہٹ رینگ رہی تھی اور آنکھوں میں وحشت کے سائے لہرا رہے تھے۔

"جلدی کرو ــــ وقت کم ہے اور کام زیادہ" ــــ

ریاست شاہ نے کمرے سے باہر نکلنے سے پہلے اس کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

"ہو گیا شاہ جی ــــ ہو گیا" ــــ

فضل شاہ نے سانپ کی طرح سرسراتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ اپنے موبائیل ٹیلی فون پر عنایت بائی سے رابطہ کر رہا تھا جس پر ابھی تک گزشتہ روز کے پے در پے واقعات کی وجہ سے لرزہ طاری تھا ــــ عنایت بائی کو مطمئن کرنا اُس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ یوں بھی اِس نازک مرحلے پر جب کہ بازار میں اس کی عزت دو کوڑی کی بھی نہیں رہ گئی تھی۔ عنایت بائی کو فضل شاہ جیسے کسی مضبوط مالی اور جذباتی سہارے کی ضرورت تھی۔

"میرا منشی تیس ہزار روپے لے کر آ رہا ہے۔ زہرہ کو ہمارے ہاں بھیج دو ــــ تم بھی آ جاؤ۔ ذرا تمھاری ہَوا بدلی بھی ہو جائے گی اور زخم بھی مندمل ہو جائیں گے۔ میری بات سمجھ گئی ناں ــــ"

اُس نے فون پر زہرہ بائی کی ماں کو ہدایات دیتے ہوئے کہا۔

"سیّد بادشاہ تیرے بچے جیئیں۔ مولا تجھے نہال رکھے۔ ہم غریبوں کا تمھیں کتنا خیال ہے۔ مَیں تیار ہوں۔ منشی کو گاڑی دے کر بھیجنا ہم دونوں ہی آ رہے ہیں" ــــ

عنایت بائی نے چاپلوسی سے کہا۔

"یہ ہوئی ناں بات ــــ شاباش۔ منشی ابھی پہنچتا ہے۔"

فضل شاہ نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

گھنی مونچھوں کے نیچے اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہو چلی تھی۔ اب وہ ایک اور نمبر ملا رہا تھا۔ یہ اُس کا خاص نمبر تھا۔

"بلاّ کہاں ہے"——

اُس نے سلسلہ ملنے پر پُوچھا۔

"حاضر ہے سائیں۔ موجود ہے"——

دوسری طرف سے آواز آئی۔

"اُسے میری طرف بھیج دو——ابھی فوراً۔ احتیاط سے۔ سمجھ گئے ناں"——

فضل شاہ نے دوسری طرف ہدایت دی۔

"سمجھ گیا سائیں۔ سمجھ گیا"

جواب ملا۔

بلاّ اشتہاری مجرم تھا جو دوسرے کسی صوبے کی جیل سے فرار ہو کر اُس کے پاس پناہ لینے آیا تھا۔ بلےّ کے لیے کسی انسان کا قتل کیڑے مکوڑے کو مسل دینے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ گزشتہ چھ ماہ سے اُس نے ریاست شاہ کے پاس پناہ لے رکھی تھی۔

اب فضل شاہ نے اس سے اپنی چھ ماہ کی محنت اور مہمانداری کی قیمت وصول کرنا تھا۔ یہ اُن لوگوں کے لیے کوئی نیا کام نہیں تھا۔ نہ ہی بلےّ اشتہاری کے لیے کوئی مشکل مشن تھا۔ قریباً دو گھنٹے بعد بلےّ اشتہاری کو اس کے خاص آدمی فضل شاہ کے ڈیرے پر پہنچا گئے تھے۔

بلےّ کے لیے یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں تھا——

اُس نے اپنی زندگی میں ایسے درجنوں قتل کیے تھے۔ وہ پیشہ ور قاتل اور اشتہاری مجرم تھا جسے دیکھتے ہی گولی مار دینے کے احکامات جاری ہو چکے تھے۔ اس صوبے میں وہ پہلی مرتبہ پناہ لینے آیا تھا۔ فضل شاہ سے اُس کا تعارف جرائم کی زیرِ زمین دنیا میں ہو چکا تھا جس نے اُسے کہا تھا کہ مشکل کے وقت وہ جب بھی چاہے اُن کے پاس مدد کے لیے آسکتا ہے۔ فضل شاہ نے آج سے تین سال پہلے اُسے کہا تھا کہ اُس کی حویلی کے دروازے بلےّ کے لیے کُھلے ہیں۔

لیکن——

ان کُھلے دروازوں کے آگے کیا تھا۔ اس کا احساس اُسے نہ ہو سکا۔ اُس نے نتھو خاں کو قتل کرنے کی ہامی بھی اپنے محُسن کا حقِ نمک اَدا کرنے کے لیے بھری تھی۔ جس کے لیے اگلے روز رات کا پہر مقرر ہُوا تھا۔ تب تک فضل شاہ نے اُسے حنیف خاں کی آنکھوں سے چُھپائے رکھا تھا۔

یوں تو اگر وہ حنیف خاں کی آنکھوں کے سامنے بھی موجود رہتا تو انھیں کوئی فرق نہ پڑتا کیونکہ اُس کو ساون کے اندھے کی طرح ہر طرف زہرہ باتی کی ہریالی ہی دکھائی دے رہی تھی۔ جو اپنی ماں کے ساتھ فضل شاہ کی گاڑی میں سرِ شام ہی اُس کے پاس پہنچ گئی تھی۔

عنایت باتی کو اُس کی بیٹی کی رنگین راتوں کی قیمت خلافِ توقع زیادہ اَدا کی گئی تھی۔ اور یہ امر اس کے لیے مزید باعثِ اطمینان تھا کہ اس کی بیٹی حنیف خاں کے پاس ہی پہنچائی گئی تھی۔

فضل شاہ نے اُن کے لیے اپنی حویلی کا ایک مکمل حصّہ مختص کر دیا تھا جہاں ضروریاتِ زندگی کے ساتھ تعیّش کے بھی مکمل سامان موجود تھے——

عنایت باتی تو ایک کمرے میں وی سی آر پر فلموں سے اور اُس کی بیٹی دوسرے کمرے میں حنیف خاں سے دل بہلاتی رہی جو شراب اور شباب کے نشے میں اِتنا بہک گیا تھا کہ دن اور رات کی تمیز بھی اس کے لیے ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

فضل شاہ نے اُس کے لیے بطورِ خاص وِلایتی شراب کی وہ بوتل نکالی تھی جو وہ عام حالات میں کبھی نہیں نکالتا تھا لیکن ایسی چند بوتلیں ریاست شاہ نے ہمیشہ اپنے پاس محفوظ رکھی ہوتی تھیں تاکہ شہر سے اس طرف دورے پر آنے والے اعلیٰ افسران کو پیش کر سکے——

اِس بات کا شدّت سے ریاست شاہ کو احساس تھا کہ نتھو خاں اب کبھی اُن کی حمایت پر کمر بستہ نہیں ہو گا۔

وہ اصولوں والا بدمعاش تھا۔

ساری زندگی اُس نے اصولوں کی بھینٹ چڑھائی تھی۔

ریاست شاہ اندازہ کرسکتا تھا کہ سرداروں نے نتھو خاں کو اُس کی حمایت سے الگ کرنے کے لیے اُس پر ہر ممکن معاشرتی دباؤ ڈالا ہوگا۔

لیکن ——

ایک مرتبہ ریاست شاہ سے وعدہ کر لینے کے بعد نتھو خاں کے لیے اپنی زبان سے پھر جانا ممکن نہیں تھا۔ ریاست شاہ نے اپنی دانست میں نتھو خاں اور اُس کے بیٹے کو بڑے مضبوط شکنجے میں جکڑا تھا لیکن، وہ اس تلخ حقیقت کو نظر انداز کر گیا کہ سرداروں کے ساتھ عالم داد جیسا شیطان بھی موجود ہے جو یونین کونسل کی چیئرمین شپ پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

عالم داد نے دنوں میں ترقی کی تھی ——

پولیس کا معمولی حوالدار عالم داد اُن کے دیکھتے ہی دیکھتے کتنا آگے نکل گیا تھا۔ سرحد پار اس کی اچھی خاصی ساکھ بن چکی تھی۔ یہ عالم داد ہی تھا جس نے اس علاقے میں سب سے پہلے بین الاقوامی سمگلنگ کا چکر چلایا تھا۔ اُس نے تین چار کامیاب چکر اپنے بندوں کے ذریعے یورپ کے لگوا دیئے تھے جس کے بعد سے اس کے پاس اتنا پیسہ آ گیا تھا جو اُس کا دماغ خراب کرنے کے لیے کافی تھا۔

لیکن ——

عالم داد جیسے شاطر کو اس بات کا احساس ضرور تھا کہ یہ پُرانے پاپی ہیں بلکہ سردار ابھی اس بزنس میں نئے نئے آئے ہیں۔ اُس نے سمگلنگ سے اتنا روپیہ کما لیا تھا کہ اب وہ سیاست میں آ جاتا اور سیاست میں آنے کے بعد کوئی اہم پوسٹ حاصل کرنے کے لیے اُس کے راستے میں اگر کوئی دیوار آ سکتی تھی تو وہ ریاست شاہ ہی تھا۔

یہی وجہ تھی کہ عالم داد کا جھکاؤ شروع ہی سے سرداروں کی طرف رہا ——

پولیس میں دس بارہ سال کی نوکری نے عالم داد کو وہ داؤ پیچ سکھا دیئے تھے جو کبھی ریاست شاہ کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتے تھے۔

اب بھی اُس نے ایسا ہی داؤ کھیلا تھا۔

اس کھیل کے مرکزی کردار حنیف خاں اور زہرہ باتی کے مہروں کو ریاست شاہ بڑی

کامیابی سے چلا رہا تھا جب اُس نے اچانک ہی ریاست شاہ کو شہ مات دی تھی —— !

ریاست شاہ جانتا تھا کہ عالم داد نے نتھو خاں کو پٹی پڑھا دی ہوگی کہ فضل شاہ نے اس کے بیٹے کو ساری زندگی اپنا محتاج رکھنے کے لیے اس چکر میں ڈالا ہے ——

اس علاقے میں دشمنی نبھانے کا بہترین طریقہ یہی سمجھا جاتا تھا کہ یہ لوگ اپنے دشمن کو نشہ لگا دیتے تھے ——

ریاست شاہ نے تو اس کے بیٹے کو دو نشے اکٹھے لگا دیئے تھے۔

حنیف خاں اُس کی واحد اولادِ نرینہ تھی۔

نتھو خاں اپنے بیٹے کے ساتھ ہونے والی اِس زیادتی پر انھیں کبھی معاف نہیں کر سکتا تھا جس کا علم بھی انھیں اُس رات ہو گیا تھا جب اس کے گاؤں ہی سے اس کا ایک خاص ہرکارہ رات ڈھلے فضل شاہ کے پاس پہنچ گیا۔

"شاہ جی —— بڑا ظلم ہو گیا ——"

بیجے تیلی نے چھوٹتے ہی کہا

"کیا مصیبت آ گئی ہے —— تمھاری ہوائیاں کیوں اُڑ رہی ہیں۔ ڈھنگ سے بات تو کر ——"

فضل شاہ نے اُسے قریباً ڈانٹتے ہوئے کہا

"شاہ جی نتھو خاں نے آج شام ہی اپنی برادری کی میٹنگ بُلائی ہے۔ جس میں انھوں نے اس الیکشن میں آپ کی حمایت کا فیصلہ واپس لے لیا ہے —— اُس کی برادری والے بہت غصّے میں ہیں —— شاید صبح وہ لوگ آپ کے پاس آئیں گے۔ وہ حنیف خاں کو فوراً لے جانا چاہتے ہیں —— اور ہاں عالم داد اور سردار مرید بھی اِس میٹنگ میں موجود تھے۔"

بیجے نے اُسے ساری بات سمجھاتے ہوئے کہا ——

"کوئی بات نہیں بیجے —— ہم نتھو خاں کے لیے صبح ہونے ہی نہیں دیں گے —— تم اپنے بندوں کو تیار رکھنا ——"

یہ کہہ کر اس نے سرگوشی کے انداز میں اُسے کچھ باتیں سمجھائیں۔

" ایسا ہی ہوگا شاہ جی ——"

بیجے تیلی نے اُس کی گفتگو کے خاتمے پر کہا

" دیکھنا کہیں بیوقوفی نہ کر لینا —— جو مَیں نے سمجھایا ہے۔ اس پر حرف بہ حرف عمل ہونا چاہیئے "

یہ کہتے ہوئے فضل شاہ نے اپنی الماری کھولی اور نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ بیجا تیلی نوٹوں پر اس طرح لپکا جیسے خارش زدہ کتا چیچھڑوں پر لپکتا ہے ——

" اپنے دونوں ساتھیوں کو بھی اِس میں سے حصّہ دے دینا —— اور ایک بات یاد رکھنا کہ تم جو کچھ کرو گے یا کھوگے اُس کی قیمت وصول کر چکے ہو —— اس کے بعد اگر تمھارے بیان بدلے یا تم سرداروں کے کسی چکر میں آئے تو تمھاری دونوں بیٹیاں۔ ۔ ۔ "

" نہیں شاہ جی —— سوال ہی پیدا نہیں ہوتا "

اُس نے تڑپ کر فضل شاہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا

" ٹھیک ہے تم اس وقت نکل جاؤ۔ لیکن جس طرح تمھارے یہاں آنے کی کسی کو خبر نہیں ہوتی اسی طرح تمھارے یہاں سے واپس جانے کا بھی کسی کو پتہ نہیں لگنا چاہیئے —— شاباش اپنے دونوں آدمیوں کو تیار رکھنا کہیں جاکر سو نہ جانا —— یاد رکھنا بیجے اگر تم سو گئے تو پھر کبھی نہیں جاگ سکو گے ——"

فضل شاہ نے اُسے دمِ رخصت آخری وارننگ دیتے ہوئے کہا

" شاہ جی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا —— میں کوئی بچہ ہوں —— ہم تو نوکر ہیں آپ کے۔ بس ایک التجا ہے کہ بعد میں ہمیں عالم داد سے بچاتے رکھنا "

بیجے نے نوٹوں کا بنڈل اپنے تہہ بند میں مضبوطی سے گانٹھ دے کر باندھتے ہوئے کہا۔

" تم بے فکر ہو جاؤ —— نتھو خاں کے بعد ہم تمھیں عالم داد کے خطرے سے بھی ہمیشہ کے لیے بے نیاز کر دیں گے "

فضل شاہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

نتھو خاں کو ایک لمحے کے لیے چین نہیں آیا تھا۔ نذر محمد نے ہر ممکن کوشش اُسے ٹھنڈا رکھنے کے لیے کر لی تھی لیکن وہ اس وقت شاہ پور جانے پر تُلا ہوا تھا۔ نذر محمد اپنے بھتیجے کی طبیعت سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نتھو خاں اگر اس حالت میں شاہ پور چلا گیا تو اُس کے واپس آنے کے امکانات باقی نہیں رہیں گے۔

نتھو خاں سے کچھ بعید نہیں تھا کہ فضل شاہ اور اس کے بھائی کو موت کے گھاٹ اُتار دیتا۔ انھوں نے ایک طرح سے اُس کے بیٹے کو اغوا ہی تو کر رکھا تھا۔

نذر محمد نے اس کا غصّہ قدرے ٹھنڈا کرنے کے لیے ہی برادری کی میٹنگ طلب کی تھی جس میں اس نے مستقبل کے خدشات کو پیشِ نظر رکھ کر سردار مُرید اور عالم داد کو بھی دعوت دی تھی جو اپنے اِس کارنامے پر پھُولے نہیں سما رہے تھے۔ نذر محمد جانتا تھا کہ اس مرحلے پر اُن لوگوں کو ضرور ایک مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ مقامی طور پر تو وہ ریاست شاہ کی بدمعاشی کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

لیکن ——

سرکار دربار میں انھیں بہرحال ایک مددگار کی ضرورت تھی۔ جو سرداروں کی شکل میں ہی اُن کے سامنے موجود تھا۔ تاکہ تھانے کچہری کے معاملات کو ڈھنگ سے نمٹایا جاسکے

نذر محمد کو احساس تھا کہ ایک مرتبہ ریاست شاہ کی حمایت کا فیصلہ واپس لینے کے بعد انھیں کس طرح کی مشکلات کا سامنا ہوگا۔

ریاست شاہ سے کسی بھی کمینگی کی توقع کی جاسکتی تھی ——

نذر محمد کی طرح نتھو خاں بھی آج اپنے فیصلے پر پچھتا رہا تھا کہ وہ اس "کنجر خانے" میں آیا ہی کیوں —— اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ اسے سرحد پر ہی کسی مقابلے میں گولی لگ جاتی۔

اس وقت نتھو خاں میٹنگ سے فارغ ہو کر اپنی حویلی میں آکر لیٹ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نذر محمد کو ہی ان لوگوں کی چکر بازیوں کا زیادہ ادراک ہے اور وہ اس مرحلے پر جبکہ اُس کا اپنا دماغ تو شل ہو چکا تھا زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے نذر محمد کی طرف سے اس مجلس میں سردار مرید اور عالم داد کو بُلا کر اُن کا شکریہ ادا کرنے

پر اس نے خاموشی اختیار کیے رکھی تھی۔

ایک بات کا البتہ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ریاست شاہ نے اُسے نوٹوں کا جو بریف کیس دیا تھا وہ اُسے ضرور واپس کرے گا۔ وہ کم از کم اتنا نہیں گرنا چاہتا تھا کہ اُن لوگوں کی سطح ہی پر آجاتا۔

نتھو خاں رات دیر گئے تک کروٹیں بدلتا رہا۔

اُسے نیند شاید رات کے دوسرے پہر میں آئی تھی۔ ساری زندگی اس نے چوروں کی طرح گزاری تھی۔ وہ اپنی حفاظت خود کرنے کے اصول کا قائل رہا تھا۔ نہ اُس نے ساری زندگی کوئی باڈی گارڈ رکھا تھا نہ ہی اس بات کو کبھی پسند کیا تھا۔

اِس گاؤں میں شاید ہی کوئی ایسا گھرانہ تھا جو اس کا ممنونِ احسان نہ رہا ہو۔ اُس نے اپنے گاؤں کی درجنوں غریب بچیوں کو بیاہا اور اُن کے گھروں کو آباد کروایا تھا۔ وہ اس کے ایک اشارے پر اپنی جان دے سکتے تھے۔ اس کی اُن نیکیوں ہی کی وجہ سے آج تک پولیس کو اس گاؤں میں داخل ہونے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

جب بھی پولیس نے نتھو خاں کے گھر سے چوری کا کوئی جانور برآمد کرنے کی کوشش کی سارا گاؤں دیوار بن کر پولیس کے راستے میں کھڑا ہو جاتا تھا۔

لیکن ——

اُس نے کبھی ان لوگوں کو یہ اجازت نہیں دی تھی کہ اُس کی حفاظت کے لیے پہرہ دینا شروع کر دیں۔

اُسے اپنی قوتِ بازو پر کم از کم اتنا بھروسا ضرور تھا کہ وہ کسی بھی ممکنہ آفت سے خود کو بچا سکتا ہے۔

فضل شاہ کے پاس صرف پانچ چھ گھنٹے کا وقت تھا۔

وہ جو کچھ بھی کرنا چاہتا اسی درمیان کر سکتا تھا ——

یہاں سے نتھو خاں کے گاؤں کا فاصلہ تو آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں تھا لیکن اس

اپنا پلان اگلی رات کا رکھا تھا جبکہ اس خبر نے اُسے فوراً منصوبے پر عمل پیرا ہونے کا سگنل دیا تھا۔ اس وقت اُس کا وفادار ملازم عاشق اور بلّا اس کے سامنے موجود تھے۔

"ساری بات سمجھ گئے ناں"——

فضل شاہ نے عاشق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا

"بالکل سمجھ آگئی شاہ جی —— آپ بے فکر ہو کر سو جائیں۔ صبح خوشخبری آپ کو مل جائے گی ——"

عاشق نے گردن ہلائی۔

"ٹھیک ہے شاباش تم نکل جاؤ —— یہاں سے رام گڑھ تک پیدل جانا —— گھوڑی وہاں سے تمھیں مل جائے گی —— خیال رکھنا عاشقے! اصل کام تمھارا ہے —— قتل کے بعد ہی تم نے اصلی کھیل کھیلنا ہے —— اپنے پیروں پر پکّے رہنا ——"

فضل شاہ نے انھیں جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا

"آپ نے یوں ہی تکلف کیا شاہ جی —— اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مَیں اکیلا ہی کافی تھا"

بلّے بدمعاش نے اپنے نمبر بنانے چاہے۔

"بلّے تم دلیر آدمی ہو مجھے علم ہے تمھارے لیے نتھو خاں کو قتل کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا لیکن میری جان یہ شہر نہیں —— یہاں کام بڑے حساب کتاب سے کرنا پڑتا ہے —— مَیں نہیں چاہتا کہ معمولی سی غلطی ہو اور ہمیں ناقابلِ برداشت نقصان اُٹھانا پڑے —— تم نے اُسے قتل کرنا ہے —— باقی سارا کام عاشق کرے گا۔ بس جیسے یہ کہے تم ویسے ہی عمل کرنا" ——

فضل شاہ نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا

تھوڑی دیر بعد دونوں اُس گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے جہاں سے انھوں نے گھوڑی لینی تھی۔ اس گاؤں کا فاصلہ یہاں سے آدھ گھنٹے کی مسافت کا تھا۔ گھوڑی چوری کی تھی اور فضل شاہ کا ایک مقامی مجرم ساتھی گاؤں کے باہر موجود ٹیوب ویل پر گھوڑی

سمیت اُن کا منتظر تھا۔

دونوں ایک ہی گھوڑی پر سوار ہو گئے ——

اب عاشق کا کام شروع ہوا تھا جس کے لیے اسے فضل شاہ نے الگ خصوصی ہدایات دی تھیں ——

عاشق نے گھوڑی کو ایڑ لگائی ——

گھوڑی بڑی مضبوط کاٹھی کی مالک تھی ——

کیا مجال جو اُس نے دونوں کو اس بات کا احساس ہونے دیا ہو کہ اُس پر کتنے [illegible] موجود ہیں۔ عاشق نے وہ راستہ اپنایا تھا جو بلوال سے نتھو خاں کے گاؤں کی طرف آ[illegible] تھا۔ اس کے لیے اُسے کچھ زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی تھی۔ بس انھوں نے ایک چھوٹا چکر کاٹا تھا ——

نتھو خاں کا نزدیک ترین گاؤں بلوال ہی تھا ——

گھوڑی کو اب اُس نے ایسے راستے پر ڈالا تھا جہاں وہ اپنے قدموں کے نشانات چھوڑتی جا رہی تھی۔ اس طرح وہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ حملہ آور بلوال کی طرف سے آتے ہیں۔

پندرہ بیس منٹ کی مزید مسافت کے بعد وہ نتھو خاں کے گاؤں کے نزدیک پہنچ گئے —— یہاں سے عاشق نے گھوڑی کی چال بدل لی اب وہ آہستہ آہستہ گاؤں کی طرف آ رہے تھے۔

گاؤں کے باہر جہاں کھیتوں کا سلسلہ شروع ہونا تھا عاشق وہاں رُک گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اُسے یہاں کسی کا انتظار رہا ہو ——

چند منٹ بعد ہی کھیتوں میں سرسراہٹ ہوئی۔ بلّے کا ہاتھ فوراً اپنے پستول کی طرف گیا ——

لیکن ——

عاشق نے اُس کے کندھے پر ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈال کر اُسے احساس دلا دیا کہ آنے

والے اُن کے دوست ہیں اگلے ہی لمحے اس کے سامنے گاؤں کا چوکیدار اور جیجا تیلی موجود تھے!

"میدان صاف ہے۔ نتھو خاں باہر والی حویلی کے صحن میں سو رہا ہے" ——

چوکیدار نے جو فضل شاہ کا زر خرید ٹٹو بن چکا تھا انھیں کہا

"ٹھیک ہے۔ بلّے تم اس کے ساتھ جاؤ۔ جس کی یہ نشاندہی کرے گا۔ اُسے قتل کرنا ہے" ——

عاشق نے کہا

"چلو —— "

بلّے نے پستول ہاتھ میں تھام لیا اور چوکیدار کے ساتھ نتھو خاں کی حویلی کی طرف چل دیا۔ جو گاؤں کی آبادی کے ایک کونے پر واقع تھی۔ اُس کے لیے یہ امر بے حد باعث تسکین تھا کہ گاؤں کا چوکیدار بھی اُن کا ساتھی ہے۔ اب اُس کا کام خاصا آسان ہو گیا تھا۔

اُن کی روانگی کے تقریباً دو منٹ بعد ہی جیجے نے کوئی خاص اشارہ کیا تو کھیتوں سے تین آدمی اور باہر نکل آئے جنھوں نے ہاتھوں میں مقامی دیہاتیوں کی طرح برچھیاں اور کلہاڑیاں پکڑ رکھی تھیں ——

"انھیں سمجھا دیا ہے ناں" ——

عاشق نے جیجے سے دریافت کیا۔

"بالکل سمجھ گئے ہیں جناب"۔

اُن میں سے ایک نے جیجے کے بجائے جواب دیا۔

"شاباش بڑی ہوشیاری سے سارا کام ہونا چاہیئے۔ اور ابھی دو تین روز تک کسی نے تم میں سے شاہ پور کے نزدیک نہیں پھٹکنا —— میری بات سمجھ گئے ناں" ——

عاشق نے انھیں سرگوشی کے انداز میں کہا

تینوں نے بیوقوفوں کی طرح سرہلا دیئے۔

بلّا چوکیدار کی رہنمائی میں بڑے اطمینان سے چلتا نتھو خاں کی حویلی تک آیا تھا چوکیدار

نے حویلی کی چھوٹی سی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُسے بتایا کہ اندر صحن میں چارپائی پر نتھو خاں سو رہا ہے۔ اس کی عادت تھی وہ گرمیوں میں صحن میں اکیلا ہی سویا کرتا تھا۔ چھوٹی سی دیوار بلّے نے بندر کی سی پھرتی سے پھلانگی اور بلّی کی طرح پنجوں پر اندر کود گیا ——

اُس نے صحن میں سوتے نتھو خاں کو حرکت کرنے کا موقعہ دیئے بغیر اس کے جسم پر سارا پستول خالی کر دیا اور بجلی کی سی تیزی سے باہر کو لپکا ——

اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی چوکیدار وہاں سے غائب تھا۔ حالانکہ اُسے جو منصوبہ بتایا گیا تھا اُس کے مطابق چوکیدار کو وہیں ہونا چاہیئے تھا ——

فائرنگ کی آواز سے سارا گاؤں بیدار ہو گیا تھا۔ بلّے نے اندازے سے اسی سمت بھاگنا شروع کر دیا جہاں اُس کے خیال کے مطابق عاشق گھوڑی سمیت موجود تھا۔

ابھی وہ بمشکل پندرہ بیس گز ہی دوڑ پایا تھا جب اچانک اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی —— کسی نے شور مچاتے ہوئے اس کے سر پر کلہاڑی کا زوردار وار کیا تھا۔

بلا چکرا کر گر پڑا ——

یہ جیجا تیلی اور اُس کے ساتھی تھے —— جنھوں نے گاؤں کے باقی لوگوں کے وہاں تک پہنچنے سے پہلے بلّے کو موت کی نیند سُلا دیا۔

"ایک گھڑسوار بھی اس کے ساتھ ہے۔ اُس طرف بھاگا ہے"۔

جیجے نے چیختے ہوئے کہا اور کچھ لوگ اُدھر کو بھاگے لیکن اُن کے مطلوبہ جگہ پہنچنے تک گھڑسوار اُن کی دسترس سے باہر ہو چکا تھا۔

بہت سے لوگوں نے اُسے بلوال کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

"نتھو خاں قتل ہو گیا" ——

چند منٹ بعد ہی گاؤں کے لوگ ہتھیاروں سمیت باہر کھیتوں کی طرف بھاگے جوشِ غضب سے پاگل ہوتے جا رہے تھے۔ کئی ایک نے تو مُردہ بلّے کے جسم پر بھی نکالا تھا ——

سارے گاؤں میں یہ خبر بجلی کی طرح پھیل گئی تھی کہ دو حملہ آوروں نے نتھو خاں پر حملہ کیا تھا۔ ایک کو تو گاؤں کے لوگوں نے بھاگتے ہوئے مار ڈالا جس کے ہاتھ میں خالی پستول بھی پکڑا ہوا تھا جبکہ اُس کا دوسرا ساتھی گھوڑی پر بلوال کی طرف بھاگ گیا ہے۔

علی الصبح ہی وہاں نزدیک دُور کے گاؤں سے سینکڑوں لوگ جمع ہو گئے تھے —— ان سب کو جیجے تیلی کے ساتھی الگ الگ ٹولیوں میں ایک ہی بات باور کروا رہے تھے کہ حملہ آور بلوال کی طرف سے آئے تھے ——

نذر محمد کا بُرا حال تھا۔ اُس کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔

لیکن ——

گاؤں کے کھوجی نے اپنا فرض نہیں بُھلایا تھا۔ اُس نے گھوڑی کا کھرا نزدیکی کھیتوں سے اُٹھایا اور اُسے بلوال تک لے گیا ——

کھوجی نے نتھو خاں کی برادری کو بلوال کی طرف سے اُسی گھوڑی کے آنے کے نشانات بھی دکھا دیئے تھے۔

"سرداروں نے اچھا نہیں کیا نذر محمد" ——

جیجے نے اچانک ہی بارود پر تیلی پھینکی۔

اور ——

اُس کی توقع کے عین مطابق آگ بھڑک اُٹھی ——

نذر محمد کے دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی برادری کے لوگ بے قابو ہو گئے۔ انھوں نے فوراً یہ مفروضہ قائم کر لیا تھا کہ حملہ آور چونکہ بلوال کی طرف سے آئے تھے لہٰذا یہ قتل بھی سرداروں نے ہی کروایا ہے —— !

نذر محمد کی آواز یہاں کون سُنتا تھا۔

جوشِ غضب میں اندھے درجنوں نوجوان لاٹھیاں، برچھیاں اور رائفلیں اٹھا کر بلوال کی طرف لپکے۔

ابھی بلوال کے سردار جو اگلے روز کی کامیابی کے نشے میں رات گہری نیند سوتے تھے،

نیند سے بیدار ہی ہوئے تھے جب انھیں فائرنگ کی آوازیں سُنائی دیں —— اُن کے پہریدار شور مچا رہے تھے کہ گاؤں پر حملہ ہو گیا ہے۔

پہلے تو سردار رشید نے یہی سمجھا کہ شاید حملہ آور شاہ پور سے آئے ہیں لیکن جب اُسے علم ہوا کہ اُن کا تعلق نتھو خاں کے گاؤں سے ہے تو اس کی حیرانگی کی انتہا نہ رہی۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ لوگ کیا پاگل ہو گئے ہیں۔

سردار رشید نے چاہا تھا کہ حویلی سے باہر جا کر انھیں سمجھانے کی کوشش کرے۔

لیکن ——

سردار مرید اور عالم داد نے اُسے زبردستی روک لیا ——

"سردار صاحب یہ ریاست شاہ کی بھڑکائی آگ ہے۔ اس کی طرف ایک قدم بڑھانا بھی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے —— فی الوقت سوائے اپنے دفاع کے اور کوئی چارہ نہیں —— مجھے حملہ آوروں کے نعروں سے احساس ہوا ہے کہ وہ نتھو خاں کی موت کا بدلہ لینے آئے ہیں —— ہم نے کل ہی نتھو خاں سے ہاتھ ملایا تھا —— میرا اندازہ ہے کہ ریاست شاہ نے نتھو خاں کو قتل کروا دیا ہے اور اس قتل کا ذمہ دار ہمیں گردانے کا بھی بندوبست ساتھ ہی کر رکھا ہوگا —— یہ سازش ہے سردار صاحب ہمیں اس کا حصہ نہیں بننا —— آپ باہر مت جائیے —— جب تک میں دوسرے لوگوں کے ساتھ کوشش کرتا ہوں کہ اس ہنگامے کو ٹھنڈا کر سکوں ——"

عالم داد نے سردار رشید کو سمجھایا تو اُسے زبردست ذہنی جھٹکا لگا۔

"یہ لوگ اِتنے گر سکتے ہیں —— اُف میرے خُدایا۔"

بے ساختہ اس کے مُنہ سے نکلا اور وہ نزدیک رکھی آرام دہ کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔

عالم داد مکان کے بغلی دروازے سے باہر آ گیا تھا۔ اس نے فوراً علاقے کے معززین کو اکٹھا کر کے حملہ آوروں کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔

سازش

جیجے تیلی نے بلپوال کی مسجد کے امام اور دوسری مساجد کے مولوی صاحبان کو اس طرف آتے دیکھا تو اندازہ کر لیا کہ یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آ رہی —— عین ممکن تھا کہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جاتا کیونکہ بلپوال والی مسجد کے مولانا صاحب کی یہ سارا علاقہ بہت عزت کرتا تھا۔ کم از کم یہاں کوئی ایسا نہیں تھا جو اُن کی بات موڑ سکتا۔

"اور اس معاملے کو یہیں ختم نہیں ہونا چاہیئے۔"

اُس نے سوچا۔

فضل شاہ نے اُسے خطیر رقم دے کر یہ مشن سونپا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ نتھو خاں کی برادری کا سب سے عقل مند آدمی اس وقت نذر محمد ہے اور اُسے اب اس بات کا یقین نہیں آ سکا کہ نتھو خاں کو سرداروں نے قتل کر دیا ہے یقیناً اس کا ذہن دوسری طرف سوچ رہا ہو گا اور یہ بڑی خطرناک بات تھی۔ کم از کم اس مرحلے پر نذر محمد ضرور بلپوال والوں کی ہاں میں ہاں ملائے گا اور معاملہ دونوں دیہاتوں کی مشترکہ پنچایت پر چھوڑ کر وقت کو ٹال دیا جائے گا اور اگر ایسا ہوا تو فضل شاہ اُسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اُس نے جیجے کو پیسے آگ بھڑکانے کے لیے دیے تھے ٹھنڈی کرنے کے لیے نہیں ——

کیا کیا جائے ؟

اُس کے شیطانی ذہن نے جلد ہی اس سوال کا جواب تلاش کر لیا۔ دوسرے ہی لمحے اُس نے مجمع میں موجود اپنے تین چار ساتھیوں کو اپنے پاس بُلا لیا اور اب آٹھ دس آدمیوں کا ایک گروپ دو ریڑھوں میں سوار شاہ پور کی طرف اڑا چلا جا رہا تھا۔ انھوں نے

بظاہر یہی تاثر دیا تھا کہ وہ حنیف خاں کو اس کے باپ کے قتل کی خبر کرنے جا رہے ہیں۔

لیکن ——

اصل میں ان کے عزائم کیا تھے؟

نذر محمد کو اس کا گمان بھی نہ ہو سکا ورنہ وہ کبھی انھیں نہ جانے دیتا اور خود اپنے ہاتھ کو لے کر آتا۔ یوں بھی اب بے وقوفوں کے گروہ میں وہی ایسا تھا جو صورتحال کو قابو کر سکتا اُس نے اپنی یہاں موجودگی کو زیادہ ضروری خیال کیا۔ اگر وہ یہاں سے ہٹ جاتا تو کئی اور لاشیں بھی یہاں گر سکتی تھیں۔ اُس کا دل اور دماغ دونوں یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ یہ قتل سرداروں نے کروایا ہے کیونکہ اُسے نتھو خاں کے قتل میں سرداروں کا کوئی مفاد نظر نہیں دیتا تھا۔ ابھی کل ہی تو انھوں نے نتھو خاں کو اپنے ساتھ شامل کیا تھا۔ پھر انھیں...

جیجے تیلی کو علم تھا کہ اگر یہ سازش کامیاب نہ ہوتی تو فضل شاہ اس کی بوٹی بوٹی کروا دے گا۔ اِس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ فضل شاہ نے رقم دیتے ہوئے کبھی ہاتھ نہ کھینچا۔

لیکن ——

وہ جس طرح کسی کام کے لیے پیسے دیا کرتا تھا۔ اُسی طرح رزلٹ بھی اپنی مرضی کے مطابق چاہتا تھا۔

"حنیف! سرداروں نے نتھو کو مار ڈالا" ——

یہ تھی وہ پہلی آواز جو حنیف خاں کے کانوں میں صورِ اسرافیل کی طرح پھونکی گئی۔

وہ زہراں بائی کے ساتھ ساری رات رنگ رلیاں منانے کے بعد بڑی گہری نیند سو رہا تھا جب فضل شاہ کے خاص ملازم نے اُسے بادلِ نخواستہ اُٹھایا۔

"کیا قیامت آ گئی ہے؟"

حنیف خاں بڑے غصّے میں دکھائی دے رہا تھا۔

"حنیف خاں ہماری تو مجال نہیں کہ اس طرح قدم بھی رکھ سکیں لیکن بات ہی ایسی ہو گئی تھی۔ دونوں شاہ صاحب شہر گئے ہوئے ہیں اور تمہارے گاؤں سے دس بندے

آدمی آتے ہیں۔ وہ اس وقت ملنے پر بضد ہیں —— کوئی اچھی خبر نہیں" ——

منشی نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا

فضل شاہ نے اُسے پہلے سے سمجھا دیا تھا کہ اُس نے ڈرامے میں کون سا کردار ادا کرنا ہے۔ دونوں بھائی اپنی حویلی میں موجود تھے۔

لیکن ——

گاؤں والوں کے لیے دونوں کل شام ہی سے شہر گئے ہوئے تھے تاکہ حنیف خاں کو کسی سازش کا شک بھی نہ گزرے۔ یوں بھی اب اس گھناؤنے کھیل کا سب سے اہم ایکٹ شروع ہونے جا رہا تھا۔ جسے حنیف خاں کے ہاتھوں انجام پانا تھا۔ انھوں نے یہ سارا کھڑاگ حنیف خاں کو گمراہ کرنے کے لیے ہی تو پھیلایا تھا۔

جیسے ہی حنیف خاں کمرے سے نکل کر حویلی کی بیٹھک میں پہنچا۔ جیجا تیلی اُس سے لپٹ گیا —— اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"حنیف گاؤں کے لوگ پاگل ہو گئے ہیں۔ وہاں لڑائی ہو رہی ہے۔"

اُن شیطانوں میں سے دوسرے نے کہا

"کیا ہوا —— کیسے ہوا؟"

حنیف خاں کو زمین آسمان گرتے دکھائی دے رہے تھے۔ اُس کے لیے خود پر قابو رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ نتھو خاں کے قتل کی خبر سُنا کر جیسے جیجے تیلی نے پگھلا ہوا سیسہ اُس کے کانوں میں اُنڈیل دیا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کیا کرے، کدھر جائے؟

اِس علاقے میں کسی مائی کے لال میں اتنی ہمت ہو گی کہ وہ نتھو خاں کو، اُس کے باپ کو قتل کر ڈالے؟

اُس نے تو کبھی خواب میں بھی یہ نہیں سوچا تھا۔

"کس نے مارا میرے باپ کو ——"

اُس نے چیختے ہوئے پوچھا

"حنیف خاں ہم نے قاتل کو مار ڈالا ہے —— ہم اتنے بے غیرت نہیں کہ نتھو خاں کے

قاتل کو زندہ بچ کر جانے دیتے ـــــ اُس کا کُھرا اُٹھایا ہے کھوجی نے ـــــ قاتل کسی دور
علاقے کا رہنے والا ہے لیکن وہ بلپوال کی طرف سے آیا تھا۔ گھوڑی کا کُھرا اُدھر ہی
رہا ہے ـــــ"

تیلی نے زہر فشانی کی۔

"چلو ـــــ مَیں سالوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مَیں ان کی نسل ہی ختم کردوں گا۔"

اُس نے جنون اور غصّے کے عالم میں سرداروں کو مغلظات بکنی شروع کردیں۔

"حنیف خاں تمھارا اِس طرح اکیلے جانا ٹھیک نہیں شاہ صاحب . . ."

منشی نے بڑی مکّاری سے کہنا چاہا۔

"منشی ہٹ جا پرے ـــــ یہ میرا اور سرداروں کا معاملہ ہے۔ اس میں کوئی تیرا
نہ آئے ـــــ"

حنیف خاں نے قہرآلود نظروں سے اُسے گھُورتے ہوئے کہا

"اس طرح خالی ہاتھ نہ جاؤ حنیف خاں ـــــ تم نہیں سمجھتے۔ شاہ صاحب مجھے کُتّے کی
موت مروا دیں گے۔ اگر انھیں علم ہوا کہ مَیں نے تمھیں اِس طرح جانے دیا ہے ـــــ اگر
آدمیوں کی ضرورت ہو تو . . ."

منشی نے اگلا پانسہ پھینکا۔

"نہیں منشی ـــــ ہم کیا مر گئے ہیں"

اس مرتبہ اُس کی بات کا جواب حنیف خاں کے بجائے جیجے نے دیا۔

"اچھا یہ رکھ لو ـــــ کام آئے گا" ـــــ

یہ کہتے ہوئے منشی نے اپنے کمر سے بندھا ۳۸ بور کا ریوالور اور گولیوں کا پورا پٹہ اتار
کر حنیف خاں کو تھما دیا تھا۔

اس نے اپنی دانست میں حنیف خاں کے بچ نکلنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی تھی
اور بڑی مکّاری سے ایک ایک مہرہ بڑا سوچ سمجھ کر یہ ساری بازی کھیلی تھی۔ منشی کو علم تھا
کہ فضل شاہ کے خریدے ہوتے یہ لوگ جو اُسے ورغلانے کے لیے آتے ہیں حنیف خاں کو

یہاں سے سیدھے بلپوال لے جائیں گے ـــــ
ریوالور اُس کے پاس موجود ہے وہ یقیناً آتشِ انتقام سے اندھا ہو کر سرداروں
پر حملہ کرے اور مقابلے میں مارا جاتے گا۔

خس کم جہاں پاک جو ریوالور اُس سے برآمد ہوگا وہ غیر قانونی تھا اور اس کا کوئی
ریکارڈ کہیں موجود نہیں تھا۔ کسی کو علم نہیں ہوگا کہ اس نے اسلحہ کہاں سے حاصل کیا ہے۔

لیکن ـــــ

منشی کو علم نہیں تھا کہ مکافاتِ عمل بھی اپنا کردار ادا کرتا ہے ـــــ اس مرتبہ اُن کا مقابلہ
نذر محمد جیسے گھاگ آدمی سے تھا۔ جس نے ساری زندگی ریاست شاہ کے بزرگوں کے ساتھ
بسر کی تھی اور ان کی ایک ایک رمز سے آشنا تھا۔ نذر محمد جانتا تھا کہ ریاست شاہ نے دونوں
باپ بیٹا کا صفایا کرنے کے لیے بڑا خطرناک جال بچھا دیا ہے۔ وہ دونوں میں سے کسی ایک
کو زندہ رکھ کر اُن کی برادری کو نہیں ورغلا سکتا تھا۔

اُسے اپنے قبیلے کے اگلے سردار کو اس سازش سے بچانا تھا۔ ورنہ حنیف خاں کی نسل کا
نام و نشان ہی مٹ جاتا۔

اس وقت نذر محمد اُس کے تین چار ساتھی امام مسجد کے ساتھ سرداروں کی حویلی میں موجود
تھے۔ انھوں نے گاؤں کے نوجوانوں کو سمجھا بُجھا کر واپس بھیج دیا تھا۔ کیونکہ سرداروں کی شکلوں پر
ایک نظر ڈالنے سے نذر محمد کو یقین ہو چلا تھا کہ یہ قتل انھوں نے نہیں کروایا ـــــ

امام صاحب نے اپنی ضمانت دیتے ہوئے نذر محمد سے کہا تھا کہ اگر کبھی مستقبل میں یہ
الزام سچ ثابت ہوا تو وہ خود کو بطور مجرم نذر محمد کے سامنے پیش کرنے کے لیے تیار ہیں

"میاں جی ـــــ وہ تو مَیں بھی سمجھتا ہوں کہ یہ ساری سازش انہیں حرامیوں کی ہے لیکن
سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب ہم حنیف خاں کو اس کا شکار ہونے سے کیونکر بچا پائیں گے۔ کیونکہ
عزیز نیلی اور اس کے بندے اُسے اطلاع دینے چلے گئے ہیں۔ اگر یہ سازش ہی ہے تو یقیناً
اُن لڑکوں کا اس میں اہم کردار ہوگا اور اب وہ حنیف خاں کو مروانے کے لیے اس طرف

بھیج دیں گے ـــ"

نذر محمد نے تشویش ظاہر کی۔

"نذر محمد تم صرف ایک بات ذہن پر زور دے کر سوچو کہ قاتل کو تمہارے گاؤں پر کن لوگوں نے بھاگتے ہوئے قتل کیا ـــ میرے خیال سے وہی لوگ اس سازش میں شریک ہیں۔ کیونکہ قاتل کو اگر زندہ گرفتار کر لیا جاتا تو وہ کچھ بتا سکتا اور اس سازش کی سمجھ آ جاتی۔ اُسے شاید مارا ہی اسی لیے گیا ہے کہ سازش کرنے والے اس کھیل کو انجام تک پہنچا دیں"

عالم داد نے پوچھا۔

نذر محمد کو یاد آ گیا کہ قاتل کو اُس کے گاؤں کے تیلی احاطے کے باہر قتل کیا گیا تھا اور قتل کرنے والے بھی عزیز تیلی کے رشتہ دار ہی تھے۔

"یہی لوگ تھے جو اب شاہ پور گئے ہیں" ـــ

نذر محمد نے کہا

"چلو اُٹھو پھر دیر نہ کرو ـــ اب اس عذاب کو ٹالنے کی صرف ایک ہی ترکیب میری سمجھ میں آتی ہے"۔

عالم داد نے کہا ـــ

"کیا ؟"

نذر محمد اور اُس کے ساتھیوں نے بے چینی سے پُوچھا

"ہم پولیس کے ذریعے ہر ممکن کوشش کر کے کسی نہ کسی طرح حنیف خاں کو قابو کروا لیتے ہیں حوالات میں اس سے ملاقات کر کے اُسے ساری بات سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ اس وقت اس کا دماغ گرم ہے اور اُسے کچھ سمجھایا نہیں جا سکتا۔ اس مرحلے پر وہ سمجھانے والے کو بھی اپنا دشمن خیال کرے گا ـــ اس درمیان ہم عزیز تیلی کو قابو کر لیں گے پھر اس سے ساری حقیقت اُگلوا کر اُسے حنیف خاں کے سامنے پیش کر دیں گے ـــ"

عالم داد نے اپنا منصوبہ بتایا۔

سب نے اُس کی طرف تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔

دوسرے ہی لمحے سردار رشید فون پر ایس پی سے رابطہ کر رہا تھا۔

ایس پی صاحب اُن کے رشتے کے عزیز تھے۔ سردار رشید نے مختصراً بات سمجھا کر اُن سے مدد طلب کی تھی اور ایس پی صاحب نے پلوال کے گرد موجود دونوں تھانوں کو وائرلیس کے ذریعے احکامات جاری کر دیئے تھے۔ کسی ممکنہ بدمزگی سے بچنے کے لیے شہر سے ریزرو پولیس بھی اُس طرف روانہ کر دی تھی۔

حنیف خاں فضل شاہ کے ڈیرے پر بندھی ایک گھوڑی پر ہی آندھی اور طوفان کی رفتار سے پلوال کی طرف اُڑا چلا جا رہا تھا۔ عزیز تیلی اور اس کے ساتھی بڑی ہوشیاری سے آہستہ آہستہ اس سے پیچھے رہ گئے تھے۔

اس وقت دن قریباً طلوع ہو چکا تھا۔

جوشِ انتقام میں گمراہ حنیف خاں کے دماغ پر ایک ہی دُھن سمائی تھی کہ وہ اپنے باپ کی میت کو تب ہی کندھا دے گا جب اس کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچا دے ـــ

پلوال سے کچھ فاصلے پر اس نے راستہ بدل لیا تھا۔ اور اب کھیتوں کے سلسلے میں داخل ہو گیا تھا۔

لیکن ـــ

دوسری طرف بھی مکمل تیاری کی گئی تھی۔

جیسے ہی وہ اس کچے راستے پر چڑھا جو یہاں سے سیدھا سردار رشید کی حویلی کی طرف جاتا تھا اچانک ہی راستے کے دونوں اطراف چھپے پولیس کے جوانوں نے اسے للکارا!

حنیف خاں کے لیے اس طرح گھیرے میں آ جانا کوئی ایسی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی لیکن اس وقت دن چڑھا ہوا تھا اور اس نے ایک لمحے ہی میں اطراف کی صورتحال کا اندازہ کر کے دیکھ لیا تھا کہ اب فرار کی کوئی راہ باقی نہیں بچی ـــ

"شاید سرداروں کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنے باپ کا انتقام لینے آئے گا۔ اس لیے بزدلوں نے پولیس کو بلا لیا ہے" ـــ

اُس نے سوچا اور رُک گیا۔

پولیس کے جوانوں کو شاید اُس سے متعلق خصوصی ہدایات دی گئی تھیں انھوں نے ایک لمحے کی غفلت دکھائے بغیر بجلی کی سی پھُرتی سے اُسے قابو کر لیا۔ پولیس کے جوانوں نے اُسے اپنی جیپ میں بٹھا لیا تھا اور اب اُسے مقامی تھانے کی طرف لے جا رہے تھے
تھانے کی طرف جاتے ہوئے راستے میں دیوانہ وار چیختے ہوئے حنیف خاں سردار کو بزدلی کے طعنے دیتے ہوئے مغلظات بکتا رہا۔

غصّے اور غم سے اُس کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ اس کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا اور اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ان لوگوں کی گرفت سے کس طرح نکل کر بلوال تک پہنچے اور اپنے باپ کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائے۔

عین ان لمحات میں جب پولیس کے جوان حنیف خاں پر قابو پانے کے بعد اُسے تھانے کی طرف لے جاتے ہوئے وائرلیس پر ایس پی صاحب کو کامیابی کی خبر دے رہے تھے۔

اس "خصوصی آپریشن" کے دوسرے حصّے پر عمل شروع ہو چکا تھا۔

عزیز تیلی اپنی دانست میں بڑا معرکہ مارنے کے بعد مطمئن ہو کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ گاؤں کی طرف آ رہا تھا۔ انھوں نے فضل شاہ کے منصوبے کے مطابق حنیف خاں کو قربانی کا بکرا بنا کر بلوال کی طرف روانہ کر دیا تھا اور اب اُس کی موت کی خبر سننے کے لیے گاؤں جا رہے تھے تاکہ یہ خبر سُننے کے بعد فضل شاہ سے دوبارہ انعام حاصل کر جائیں۔

آنے والے حالات سے بے فکر عزیز تیلی اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ پیدل ہی گاؤں کی طرف آ رہا تھا۔ انھوں نے اپنے دونوں گھوڑوں کی باگیں تھام رکھی تھیں اور اب اپنی کامیابی پر قہقہے لگاتے آ رہے تھے۔ جب اچانک ہی یہ قیامت اُن پر ٹوٹ پڑی
اُن کی تعداد آٹھ تھی ———
آٹھ مسلح آدمیوں نے اُن کی طرف بندوقیں تانی ہوئی تھیں ——— اُن کے چہروں بندھے کپڑوں کی وجہ سے اُن میں سے کسی کو بھی ابھی تک عزیز تیلی اور اس کے ساتھیوں

نہیں پہچانا تھا۔
"کیا حال ہے جیجے ——— آ گئے شاہ پور سے اپنا کام کر آئے۔
اچانک ہی ایک آواز نے اُسے چونکا دیا۔
آواز اُن کی پُشت سے بلند ہوئی تھی۔ یہ سردار مرید تھا ——— جواب اُن کے سامنے آ گیا۔

عزیز تیلی کو اپنے وجود سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔ اُس نے حملہ آوروں کے حکم پر اپنے ہاتھ اوپر اُٹھائے ہوئے تھے اور اُن لوگوں نے اب تیلیوں کی تلاشی لے کر اس بات کی تصدیق کر لی تھی کہ اُن کے پاس آتشیں اسلحہ نہیں ہے۔

"سردار صاحب اس حرکت کا کیا مطلب ہے ———"
عزیز تیلی نے سنبھل کر کہا
"حرام خور میں نے تجھے رشتہ دار بنانے کے لیے تو یہاں نہیں گھیرا ——— مطلب بتانے کے لیے ہی تجھے ہم اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ تجھے ایسا مطلب سمجھائیں گے کہ تیری آنکھیں کھُل جائیں گی ——— تُو کیا سمجھتا تھا کہ فضل شاہ کے ٹکڑوں پر پلنے سے تو بہت زیادہ عقل مند ہو گیا ہے" ———
سردار مُرید نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا
"سردار صاحب ہم غریب آدمی ہیں۔ ہمیں سیاست سے کیا لینا دینا۔ ٹھیک ہے ہم نے اپنے گاؤں کے ووٹ نھتو خاں کے کہنے پر شاہ صاحب کو دینے کا فیصلہ کیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ ہمارے ساتھ . . . "
"اِسے ڈالو جیپ میں ذرا میں اسے مطلب تو سمجھا دوں" ———
سردار مرید نے اس کی بات کاٹتے ہوئے غصّے سے کہا
سردار مُرید کے ساتھیوں نے جیجے تیلی کو ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے اُٹھا کر کچھ فاصلے پر کھڑی جیپ میں پھینک دیا۔ اُس کے باقی ساتھیوں کو وہ ایک دوسری جیپ میں لے گئے تھے۔ اُن کی دونوں گھوڑیاں بھی انھوں نے اپنے قبضے میں کر لی تھیں۔

نیجے تیلی کو سردار مرید کے ڈیرے پر پہنچا دیا گیا تھا جہاں اس کی نظر سب سے پہلے حوالدار عالم داد کے چہرے پر پڑیں اور اُسے یوں لگا جیسے موت کے فرشتے نے اس کی رُوح قبض کر لی ہو۔

عالم داد کی موجودگی کا مطلب سوائے اس کی کمبختی کے اور کچھ نہیں تھا۔ عالم داد نے بھی اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی اس طرح اطمینان کا اظہار کیا تھا جیسے وہ اسی کے لیے یہاں موجود تھا اور اب اس کی محنت راس آگئی ہو۔

" اُلٹا لٹکا دو ـــــ میں اسے پہلے مطلب ہمارے سمجھا دوں پھر کوئی اور بات کرتے ہیں"

سردار مُرید نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا۔

جنھوں نے دوسرے ہی لمحے چیختے چلاتے عزیز تیلی کے دونوں پاؤں ایک مضبوط رسّی سے باندھے اور اُسے ایک مضبوط شہتیر کے ساتھ اُلٹا لٹکا دیا۔

"اب ذرا اِس کی مالش کرو پہلے اس کا دماغ ٹھکانے پر آجائے پھر اس سے بات کرتے ہیں"

اِس مرتبہ عالم داد نے کہا تھا۔

اس کے ساتھ ہی اُلٹے لٹکے نیجے تیلی پر جوتوں اور ڈنڈوں کی بارش شروع ہوگئی ان لوگوں نے چیختے چلاتے عزیز تیلی کی چند منٹ ہی میں اس طرح مالش کی تھی کہ اس کے ہوش و حواس ہی گُم ہو گئے تھے۔

بمشکل تین چار منٹ بعد ہی وہ چیختے چیختے خاموش ہو گیا۔

عزیز تیلی بے ہوش ہو چکا تھا۔

عالم داد کے اشارے پر سردار مُرید کے آدمیوں نے اُسے زمین پر لٹا کر اس کے مُنہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور اُسے ہوش میں لے آئے۔

ہوش میں آتے ہی عزیز تیلی نے دوبارہ چیخنا چاہا۔

لیکن ـــــ

اِس مرتبہ اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی تھی۔ اس کے جسم سے درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں اور اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اگر اس کے ساتھ اِن لوگوں نے ایک آدھ مرتبہ اور یہ سلوک دُہرا دیا تو شاید وہ مر ہی جائے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اُسے کیوں مارنا چاہتے ہیں ؟

کہیں اِن لوگوں کو شک تو نہیں ہو گیا کہ اس سازش . . . . ؟

اس سے آگے اُس کے ذہن نے کچھ سوچنے سے انکار کر دیا۔ اگر ان لوگوں کو عزیز تیلی کے کرتوت کا علم ہو گیا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ یہ لوگ اُسے چھوڑیں گے نہیں اور اُس سے سچائی اُگلوا کر ہی رہیں گے۔

" مم میرا کیا گناہ ہے ؟"

اُس نے کپکپاتے ہوئے دریافت کیا۔

"اچھا اب تمھیں تمھارا گناہ بھی ہم ہی بتائیں گے۔ گویا تمھیں ابھی تک جوتے کھانے کی وجہ بھی سمجھ نہیں آئی"

عالم داد نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا

" اسے ایک کورس اور کرواؤ" ـــــ ابھی اس کا دماغ ٹھکانے نہیں آیا"

سردار مُرید نے اپنے ساتھیوں سے کہا

" خدا کے لیے مجھے نہ مارو ـــــ میں سب کچھ بتا دوں گا" ـــــ

بالآخر عزیز تیلی کو عقل آ ہی گئی۔

"اب ہوئی ناں بات ـــــ اب سچ سچ بتاؤ کہ تمھارے باپ فضل شاہ نے کیا سکیم بنائی تھی" ـــــ

عالم داد نے اسے پیاز کھانے والے لہجے میں پوچھا

" میں بالکل بے قصور ہوں جناب۔ مجھے کچھ علم نہیں ہمیں تو صرف یہ کہا گیا تھا کہ ہم نے قاتل کو زندہ نہیں جانے دینا اور یہی کہنا ہے کہ قاتل بلوال کی طرف سے آیا تھا اور حنیف خان کو ورغلا کر آپ پر حملہ کروانا تھا"

عزیز تیلی نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا ——
تھوڑی دیر بعد ہی وہ لوگ نذر محمد کو وہاں لے آئے۔ نذر محمد کے ساتھ گاؤں کے
دس اور معززین بھی تھے جن کے سامنے عزیز تیلی نے بالتفصیل ساری واردات بیان کر دی۔
وہ قاتل کا اتا پتہ تو نہیں بتا سکا۔

لیکن ——

اس کا اندازہ تھا کہ قاتل کوئی مفرور بدمعاش ہوگا۔ ایسے لوگ اکثر فضل شاہ کے پاس پناہ
کے لیے قیام کیا کرتے تھے کیونکہ اس علاقے کا سب سے بڑا رسہ گیر وہی تھا جن سے بھروسہ
اپنی مرضی کے مطابق ایسے کام ہی لے لیا کرتا تھا۔

نذر محمد اور دیگر معززین کے سامنے عزیز تیلی اور اس کی برادری کے لوگوں نے سارا کچا چٹھا
بیان کر دیا تھا۔ نذر محمد کے ساتھی تو انھیں وہیں مار دینے پر تُلے ہوئے تھے۔

لیکن ——

انھوں نے سرداروں کی درخواست پر انھیں فی الوقت کچھ نہیں کہا اور اپنے ساتھ
گاؤں لے گئے۔ سردار رشید نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ اپنی کامیابی کی صورت میں وہ
اصلی مجرموں سمیت سب کو کیفر کردار تک پہنچا کر ہی دم لے گا۔ اُس نے فی الوقت عزیز تیلی کو
پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ فضل شاہ اُس کی گواہی پر اثر انداز نہ ہو سکے۔
حنیف خاں سے نذر محمد کی ملاقات تھانے کی حوالات میں ہوئی تھی۔ جہاں وہ گاؤں کے
بہت سے معزز بزرگوں کے ساتھ آیا تھا اور اُن لوگوں کی ضمانت پر ہی تھانیدار نے حنیف خاں
کو اپنے باپ کے جنازے میں شمولیت کی اجازت دی تھی۔
حنیف کا غم و غصے سے بُرا حال تھا۔
اس کی حالت سرکس کے لیے گرفتار کیے گئے جنگل کے اس خطرناک شیر کی سی ہو رہی
تھی جسے حال ہی میں "ہانکا" کرنے کے بعد قابو کیا گیا ہو اور جس کے اندر ابھی تک جنگل کی یاد
درندگی موجود تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ سرداروں کے گھروں سمیت نیست و نابود کر ڈالے

تھانے سے پوری گارد اس کے ساتھ آئی تھی۔
اپنے گھر پہنچنے تک وہ خاموش رہا۔
آج زندگی میں پہلی مرتبہ اُس کا ضمیر اتنی شدت سے جاگا تھا کہ وہ خود کو مجرم محسوس
کرنے لگا تھا۔ اُس نے اپنے ماموں نذر محمد کے سامنے بچوں کی طرح دھاڑیں مار مار کر روتے
ہوئے اس بات کی قسم کھائی کہ وہ اپنے باپ کے قاتلوں کی ساری نسل ختم کر دے گا۔ اس کے
نزدیک اپنے گناہوں کا کفارہ اُدا کرنے کی اب یہی ایک صورت باقی رہ گئی تھی۔
جب پہلی مرتبہ نذر محمد نے اُس کے باپ کی لاش کے سرہانے بیٹھے ہوئے اُسے بتایا کہ
جنھیں وہ اپنے باپ کے قاتل سمجھ رہا ہے وہ تو اس کے محسن ہیں تو حنیف خاں کا جی چاہا
کہ اپنے ماموں کا منہ نوچ لے ——

لیکن ——

وہ خاموش رہا ——

کیونکہ یہاں موجود اور لوگ بھی یہی کہانی سُنا رہے تھے۔ شام کو اپنے باپ کی میت
دفنانے تک اُس کو اُن لوگوں نے کم از کم اس بات کا یقین دلا دیا تھا کہ نتھو خاں کو سرداروں
نے قتل نہیں کروایا۔ شام کے بعد جب حنیف خاں اپنی روتی بین کرتی ماں کو اکیلے چھوڑ کر تھانے
کی طرف واپس جا رہا تھا تو نذر محمد اور گاؤں کے معززین کا جلوس بھی اُس کے ہمراہ تھا ——
یہاں تھانے کے صحن میں پہلی مرتبہ حبیب اور گرد کے دیہاتوں کے سرکردہ لوگوں کی پنچایت
اکٹھی ہوئی اور تھانیدار کی موجودگی میں جب اُن لوگوں نے عزیز تیلی کو پیش کیا تو حنیف خاں
کی آنکھیں کھلیں۔
عزیز تیلی نے اُسے ساری کہانی سُنا دی ——
اب حنیف خاں کو علم ہوا کہ آخر ریاست شاہ اور اُس کا بھائی اُسے خود سے الگ کیوں
کر رہے تھے اور اصل میں اُس کے دشمن کون تھے ؟
اُسے رہ رہ کر اس بات کا غم کھائے جا رہا تھا کہ اُس کے بہادر اور غیرت مند باپ کو
محض اس کے کرتوتوں کی وجہ سے موت کے مُنہ میں جانا پڑا۔ اگر وہ ہمیشہ کی طرح اپنے باپ

کی بات پر عمل پیرا ہوتا تو شاید اِس سانحے سے بچ جاتا۔

"فضل شاہ — تُو نے حنیف خاں اور اُس کے باپ کی دوستی ہی دیکھی تھی — اب تو میری دشمنی دیکھے گا فضل شاہ — مَیں تجھے تیرے ہی ہتھیاروں سے قتل کروں گا۔"

اس نے دل ہی دل میں دانت پیستے ہوئے کہا

اِس سارے قصّے میں اُسے زہراں بائی پھر بے قصور نظر آ رہی تھی۔ زہراں کے عشق نے اُس کی عقل پر صحیح معنوں میں پردہ ڈال دیا تھا۔

اگلے روز صبح تک سردار مُرید اور اس کے ساتھی خود تھانے پہنچ گئے تھے۔ انھوں نے قرآن پر حلف دے کر اِس بات کی شہادت دے دی تھی کہ اُن کا نتھوں خاں سے کبھی کوئی تنازعہ نہیں رہا تھا اور یہ تھی بھی حقیقت کہ نتھو خاں نے اُن کی حمایت کا اعلان کر دیا تھا اور فضل شاہ اور ریاست شاہ سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔

دوپہر تک انھوں نے حنیف خاں کو رہا کروا لیا —

حنیف خاں نے کوئی جرم بھی نہیں کیا تھا صرف تلاشی لینے پر اُس سے ایک ناجائز پستول برآمد ہوا تھا۔ جو سردار رشید کے ایک ملازم کے کھاتے میں ڈال دیا گیا جس کی ضمانت بھی ان لوگوں نے قبل از گرفتاری ہی کروا لی تھی اور اب وہ سردار مُرید کی جیپ میں اپنے گاؤں کی طرف جا رہا تھا۔

اُس کی آمد کی اطلاع ملتے ہی احاطہ تیلی کے تمام مکین اپنا گھر بار چھوڑ کر بھاگ گئے تھے

اُس سے اگلے روز ہونے والے نتھو خاں کے "قُل" کے اخراجات سرداروں نے زبردستی اپنے ذمہ لیے تھے۔ انھوں نے نتھو خاں کی باقاعدہ پختہ قبر تعمیر کروانے کے لیے شہر سے قابل … اور سنگِ مرمر کے پتھر منگواتے تھے اور اس کی قبر پر نتھو خاں شہید درج کروا کر اپنی دانست میں اُسے مزار کی شکل دینے کی کوشش کی تھی —

ایک ہفتے تک حنیف خاں بے سُدھ ہو کر گھر پڑا رہا۔

اس دوران روزانہ سرداروں کی طرف سے خیرات کی دیگیں نتھو خاں کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے تقسیم کی جاتی رہیں اور گرد و دیہاتوں کے ہزاروں غریبوں نے یہ نیاز کھائی

نتھو خاں کے لیے دُعائیں مانگیں۔ قرآن خوانی کا سلسلہ امام صاحب کی نگرانی میں الگ سے مسلسل جاری رہا اور اب حنیف خاں کو یقین ہو گیا تھا کہ سردار اُس کے ہمدرد اور فضل شاہ اُس کا دشمن تھا۔

وہ جانتا تھا پولیس کی اتنی ہمت بھی نہیں کہ عزیز تیلی کے بیان پر ریاست شاہ سے کچھ پوچھ گچھ ہی کر لے — وہ بے پناہ اثر و رسوخ کا مالک تھا اور کم از کم کسی کے بیان کو دلیل بنا کر کوئی پولیس آفیسر ریاست یا فضل شاہ کے وارنٹ گرفتاری حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

اس کا باپ ایک جوانمرد تھا —

وہ جانتا تھا کہ جب تک اپنے باپ کے خون کا قرض نہیں چکائے گا۔ کبھی چین کی نیند نہیں سو سکے گا۔ اُس کے ماموں نذر محمد کو اس کی پَل پَل بدلتی حالت کا اندازہ ہو رہا تھا۔

نذر محمد کی زمانہ ساز نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ حنیف خاں کے اندر کیا جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر حنیف خاں ایک مرتبہ ہاتھ سے نکل گیا تو زندہ واپس نہیں لوٹے گا اور اب اس خاندان کی اگر کوئی اُمید تھی تو یہی تھی۔

اُس کی خواہش تھی کہ جتنی جلد ممکن ہو نتھو خاں کی آخری خواہش پوری کرتے ہوئے اس کے بیٹے کی شادی حنیف کی پھوپھی زاد صغراں سے کروا دے جو بچپن ہی سے حنیف سے منسوب کر دی گئی تھی۔

لیکن —

حنیف کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

اُس روز رات دیر گئے جب اُس نے اپنی حویلی کی بیٹھک پر ایک مانوس سی دستک سُنی تو چونکے بغیر نہ رہا۔

یہ کون تھا جو اس طرح چوری چھپے حویلی کے اندر گھس آیا تھا اور اب بڑے رازدارانہ انداز میں دستک دے کر اُسے بیدار کر رہا تھا۔

اپنے سرہانے دھرے پستول کو ایک ہاتھ سے سنبھالتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے اچانک دروازہ کھول دیا۔ بیٹھک کے باہر جلنے والے بلب کی روشنی میں جب اس کی نظر

اپنے سامنے کھڑے نوجوانوں پر پڑی تو حیرت اور خوشی سے ایک لمحے کے لیے تو اس کی زبان ہی گنگ ہو کر رہ گئی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے پستول بستر پر پھینکا اور دونوں بانہیں پھیلا کر باری باری دونوں سے لپٹ گیا۔

"تم"

اس کے مُنہ سے بے اختیار نکلا

یہ دونوں مُکھتے سانسی کے بیٹے تھے۔ اس کے باپ کے دیرینہ دوست کے بیٹے جنھیں مُکھتے سانسی نے اپنے یار کی تعزیت کے لیے بھیجا تھا۔

"تم لوگ۔ جُگنی ___ تم کیسے، کب آئے؟"

حنیف خاں بیقراری سے اُن کے بازو ہلا ہلا کر اس بات کی تصدیق کر رہا تھا کہیں وہ خواب تو نہیں دیکھ لیا۔

" نیفے! نتھو خاں صرف تیرا باپ ہی نہیں تھا۔ ہمارا بھی کوئی رشتہ تھا اس سے۔ اُس نے ہماری دو بہنوں کو اپنے ہاتھوں بیاہا ہے ___ ہم چھ بھائی ہیں نیفے ___ میری ماں نے ہم دونوں کو اپنی دھاریں بخش کر یہاں بھیجا ہے ___ ہم پر کھانا پینا حرام ہے جب تک ہم اپنے باپ کا بدلہ نہ لے لیں ___ ہمیں پرسوں ہی خبر ملی تھی کہ چاچے کو کسی نے قتل کر دیا۔ اِدھر سے کچھ لوگ گئے تھے انھوں نے بتایا۔ تب سے اب تک ہماری ماں نے ایک نوالہ روٹی کا نہیں کھایا ___ میرے باپ کی آتما کو چَین نہیں آئے گا ___ جب تک ہم اپنے چاچے کا بدلہ نہ چکا دیں ___ نیفے ___ ہم مر نہیں گئے تھے۔ ساری زندگی اِس بات کا دکھ رہے گا کہ تُو نے ہمیں خبر نہ کی ___ ہم نتھو خاں کا جنازہ نہ اُٹھنے دیتے جب تک اس کے قاتلوں کا جنازہ بھی اس کے ساتھ نہ اُٹھتا ___ تُو نے ہمارے ساتھ ایک بھائی ہو کر ظلم کیا ___ ارے ہم دو مر گئے تو کیا ہوگا۔ ابھی چار باقی تھے ___ اور پھر ہم تھے ہی کتنی دُور ___ بس دو میل کی دُوری پر ___ تو نے کیا سمجھ لیا تھا کہ ہمارے باپ مُکھتے سانسی کی موت سے سارے رشتے ٹوٹ گئے ___ ارے! ابھی ہم زندہ تھے۔ ہم تو نہیں مر گئے تھے" ___

جُگنی اور ترلوک بچوں کی طرح سسکیاں لیتے اُس سے لپٹ گئے۔

حنیف خاں کو آج پہلی مرتبہ دل کھول کر رونے کا موقعہ ملا تھا۔ اُس نے دونوں کے ساتھ مل کر اپنے باپ کی جُدائی کا ماتم کیا اور خود پر لعنت ڈالی کہ اُس کے زندہ ہوتے ہوتے اُس کے باپ کے قاتل زندہ گھوم رہے تھے۔

لیکن ___

وہ بھی کیا کرتا؟

اس درمیان نذر محمد سائے کی طرح اس کے ساتھ چپکا رہا تھا۔ اُس کی ماں نے متعدد مرتبہ اُس کے سامنے ہاتھ باندھ کر التجا کی تھی کہ وہ اپنے خاندان کی واحد امید ہے اور اس کا کوئی بھی غلط قدم اس کے خاندان ہی کا نام و نشان مٹا دے گا۔

کیا یہ سب دلائل اس کے لیے کافی تھے؟

اُس نے سوچا۔

اور ___

زندگی میں پہلی مرتبہ شدت سے اُسے اپنی بُزدلی کا احساس ہوا۔ اس کا باپ سچ کہا کرتا تھا کہ عورت کی صحبت اور شراب کی رغبت مردوں کو بزدل بنا دیا کرتی ہے۔ اُس نے تو ایک ہی وقت میں دونوں بُرائیاں اپنا لی تھیں۔

"ترلوکی ایسی بات نہیں ہے۔ ابھی میرا خون اتنا بے غیرت بھی نہیں ہوا کہ باپ کے قاتلوں کا حساب کتاب سرکار دربار پر چھوڑ دوں۔ مَیں تو رسومات مکمل ہونے کا انتظار کر رہا تھا ___ اب مَیں خود یہ قرض چکاؤں گا۔"

اُس نے شیر کی طرح دھاڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں حنیف خاں ___ اکیلے نہیں۔ ہم نے اپنے بزرگوں کی زندگی میں تمام بڑے کام اکٹھے مل کر کیے ہیں۔ اب تُو اکیلا کیوں جائے گا۔ آخر ہمارا بھی کوئی حق ہے یا نہیں ___ تیرے اور ہمارے باپ کے درمیان کوئی خونی رشتہ نہ سہی آخر کو ایک رشتہ تو تھا۔ اور تُو جانتا ہے کتنا مضبوط" ___!

ترلوکی نے کہا۔

"شاید ماں آرہی ہے۔ اُس کے سامنے انتقام کی کوئی بات نہ کرنا۔ سمجھ گئے نا"

حنیف خاں نے دوسرے کمرے میں آہٹ محسوس کر کے دونوں سے کہا اور دونوں
ہو کر کھڑے ہو گئے۔

اصغری دوسرے کمرے میں گفتگو کی آواز سُن کر آئی تھی۔ اُسے باتوں کی سمجھ تو نہیں آرہی تھی
لیکن آوازیں جانی پہچانی دکھائی دے رہی تھیں۔ چند منٹ تک تو وہ دم سادھے لیٹی رہی
اس سے مزید ضبط نہ ہو سکا تو ہمت کر کے اُٹھ کھڑی ہوئی اب وہ اپنے بیٹے کے کمرے کی
طرف جا رہی تھی۔

کمرے کا دروازہ کھلتے پر اس کی نظر کھتے سانسی کے لڑکوں پر پڑی تو بے اختیار اس کی
آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ قبل از تقسیم سے اس خاندان سے آشنا تھی۔ دونوں "چاچی" کہہ کر
لگاتے اس سے لپٹ گئے۔

کافی دیر تک کمرے کی فضا سوگوار رہی۔

حنیف خاں نے کبھی زندگی میں اپنی ماں کو اتنی باتیں کرتے نہیں سُنا تھا۔ وہ ماضی کا
ایک حوالہ دُہرا کر خود بھی رو رہی تھی اور انھیں بھی رُلا رہی تھی۔

صبح تک وہ اُن سے باتیں کرتی رہی اور جب گاؤں کی مسجد سے اذان کی آواز
ہوئی تو نماز پڑھنے کے لیے اپنے کمرے میں واپس چلی گئی۔

روانگی سے پہلے اُس نے اپنے بیٹے کو سختی سے تاکید کی تھی کہ ان دونوں کو گاؤں
نہ جانے دے۔

"بیٹا! تمھارا باپ زندہ ہوتا اور بات تھی ـــ اگر خدانخواستہ ان کے ساتھ کچھ ہو گیا تو
روزِ قیامت میں اُسے اپنی شکل نہیں دکھا پاؤں گی ـــ اُس نے ساری زندگی ان میں اور
درمیان کوئی فرق نہیں سمجھا ـــ کھتے کی موت پر دس دن وہ سرحد پار رہا تھا ـــ پورے
دن ـــ"

اُس کی آواز بھرا گئی اور وہ تیزی سے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

اِنتقام

عزیز تیلی کی گرفتاری اور سرداروں کی طرف سے نتھو خاں کی موت کے بعد کی رسومات
میں بھرپور شرکت کی اطلاعات ملنے کے بعد سے ریاست شاہ کو خاص تشویش لاحق ہوتی تھی۔
اُسے اچانک ہی پانسہ پلٹنے کا احساس ہوا تھا۔ اگر یہ سب کچھ سچ تھا جن کی اطلاع اُسے ملی تھی
تو اس کا مطلب ریاست شاہ کے لیے بے پناہ مصائب کے اور کچھ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا
سردار رشید اب اس کے لیے لاینحل مسائل کھڑے کر دے گا۔

لیکن ـــ

نتھو خاں کی موت کے تیسرے ہی دن جب اُسے سردار رشید کی طرف سے ملاقات
کا خفیہ پیغام ملا تو وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا ـــ!

"کوئی چال نہ ہو" ـــ

فضل شاہ نے تبصرہ کیا تھا۔

"نہیں فضل شاہ ـــ ابھی وہ اس قابل نہیں ہوا کہ ڈھنگ سے کوئی چال چل سکے البتہ
اُس نے اپنے پتے کھیلنے کی کوشش کی ہے ـــ شاید سیاستدان بننا چاہتا ہے بے چارہ ـــ"
ریاست شاہ نے بڑی مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"بہرحال یہ بات تو ماننی ہوگی کہ فی الوقت اُس کا پلڑہ بھاری ہے۔ نتھو خاں والی
بازی بھی اُلٹ گئی اور . . . ."

اور ـــ

ریاست شاہ نے غصے سے فضل شاہ کی بات کاٹ کر طنزیہ لہجے میں دریافت کیا

"میرا مطلب تھا بھائی صاحب کہ . . . ."

"تمہارا جو بھی مطلب ہو۔ ایک بات دھیان سے سُن لینا کہ اگر خدانخواستہ ہمارے ہاتھ سے اسمبلی کی سیٹ نکل گئی تو ہم پر لامتناہی عذاب کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ اور تمہیں وہ تمام امکانات ختم کرنے ہونگے جو ہماری شکست کا سبب بن سکتے ہیں۔"

ریاست شاہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"ایسا ہی ہوگا شاہ جی —— ایسا ہی ہوگا۔"

فضل شاہ نے گردن جھکا دی۔

"کل دوپہر ہی کو ملاقات کا پروگرام رکھ لو —— اور وہ دوسرے پروگرام کا کیا بنا؟ حنیف خاں کو پیغام گیا یا نہیں؟"

ریاست شاہ کوئی گہری چال چلنے جا رہا تھا۔

"زہراں بائی کی طرف سے آج شام ہی حنیف خاں کو فوری ملاقات کا پیغام مل جائے گا شاہ جی —— اور ایک مرتبہ جب وہ زہراں بائی کے کوٹھے پر پہنچ گیا تو ہماری گرفت سے نہیں نکل سکے گا۔ عنایت بائی نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ اپنی بیٹی کی مدد سے حنیف خاں کو باور کروا دے گی کہ اس قتل سے شاہ پور والوں کا دُور دُور تک بھی کوئی تعلق نہیں اور عزیز تیلی دراصل سرداروں کا آدمی ہے جسے انھوں نے لمبی رقم دے کر اس طرح کا بیان دینے پر آمادہ کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ اس قتل میں شاہ پور والے سیّدوں کا ہاتھ ہے۔ دراصل یہ سارا کھڑاگ اُن کا اپنا پھیلایا ہوا ہے اور کھل جانے کی وجہ سے انھوں نے بوکھلا کر ہم پر الزام تراشی شروع کروا دی ہے تاکہ حنیف خاں کے انتقام سے بچ سکیں —— شاہ جی —— ایک مرتبہ جب شراب اور شباب کا نشہ اس کے دماغ کو چڑھا تو ساون کے اندھے کی طرح اسے ہر طرف ہرا ہی ہرا دکھائی دے گا اور زہراں بائی اُس کا خیال بھول کر بھی اِس طرف نہیں جانے دے گی —— مَیں نے اس بُرے وقت کے لیے تو یہ کارڈ سنبھال کر رکھا ہوا تھا ——"

فضل شاہ نے اُسے دوسرے منصوبے کی تفصیلات بتائیں۔

"ٹھیک ہے فضل شاہ —— بس ایک بات ذہن میں رکھنا اگر اس مرتبہ کوئی چال غلط پڑ گئی تو ہمارے سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا ——"

ریاست شاہ نے اپنی مونچھوں پر اُلٹا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا

"مَیں جانتا ہوں شاہ جی —— مَیں جانتا ہوں۔"

فضل شاہ نے اپنی بات دُہرائی۔

سردار رشید سے ملاقات کے لیے انھوں نے شہر کے ایک دور دراز علاقے میں رازداری کے مکمل اہتمام کے ساتھ ملاقات پر آمادگی ظاہر کی تھی چونکہ جگہ کا تعین ریاست شاہ نے خود کیا تھا اس لیے وہ خاصا مطمئن تھا اور اُسے یقین تھا کہ اس ملاقات کی بھنک بھی کسی کے کانوں تک نہیں پڑے گی۔

تھوڑی دیر بعد دونوں اپنے دو مسلح باڈی گارڈز کے ساتھ اپنی لینڈ اور جیپ میں شہر کی طرف اُڑے جا رہے تھے جہاں انھوں نے سردار رشید سے ملاقات کرنی تھی ——! ان کی توقعات کے عین مطابق سردار رشید اپنے بھائی سردار مُرید اور عالم داد کے ساتھ پہلے ہی سے اُن کے بتائے ہوئے ٹھکانے پر پہنچ چکا تھا۔ یہ اُن کے ایک مشترکہ دوست کی کوٹھی تھی جس کے تعلقات بیک وقت سیّدوں اور سرداروں سے تھے۔ دونوں کی میزبانی مقامی دوست نے کی اور تھوڑی دیر کی گپ شپ کے بعد اس نے دونوں پارٹیوں کو مذاکرات کے کمرے میں پہنچا دیا۔

دونوں کو ہی اِس بات کی گارنٹی پہلے سے دے دی گئی تھی کہ اُن کی بات چیت کامیاب ہو یا ناکام رہے بہرحال اس ملاقات کا راز کبھی افشا نہیں ہوگا اور دونوں پارٹیاں حلفاً اس کی پابند کر دی گئی تھیں۔

کمرے میں ایک طرف سردار رشید اور عالم داد اور دوسری طرف ریاست شاہ اور فضل شاہ بیٹھے تھے۔ سردار رشید نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"ریاست شاہ ہماری تمہاری کوئی ذاتی دشمنی یا دوستی نہیں ہے کیونکہ نہ ہم آج

تک تمھارے دھندے پر اثر انداز ہوئے اور نہ تم ہمارے پر —— یوں بھی ہم الگ الگ علاقوں میں کام کرتے ہیں —— میری یہ خواہش ہے کہ اب بھی ہم اسی طرح الگ الگ علاقوں میں کام کریں اور تعلقات کی نوعیت بھی برقرار رہے" ——

"لیکن اس معاہدے کی خلاف ورزی تم نے خود کی ہے"

ریاست شاہ نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا

"نہیں ریاست شاہ —— جسے تم خلاف ورزی کہہ رہے ہو۔ وہ ناگزیر ضرورت تھی تم سے زیادہ اس بات کو کون سمجھ سکتا ہے ریاست شاہ کہ اس ملک میں کسی بھی قسم کی بدمعاشی کرنے کے لیے سرکار دربار میں اثر ورسوخ ضروری ہے۔ ہمارے پاس صرف یہی ایک کمی تھی۔ تم گزشتہ پندرہ سال سے سرکار کی گود میں بیٹھ کر شطرنج کھیل رہے ہو۔ میرے خیال سے اب ہمیں بھی یہ موقعہ ملنا چاہیئے۔ آخر ہم کب تک تھانیداروں اور ریٹز انسپکٹروں کے پیٹ بھرتے رہیں —— کیوں نہ اب ہم ان سے اپنا حصہ وصول کریں۔

سردار رشید نے مسکراتے ہوئے کہا

"دیکھو سردار رشید سب کام سب لوگوں کے لیے نہیں ہوتے تم خوامخواہ ہمارے بیچ میں ٹانگ نہ اڑاؤ۔ جس طرح کی ضمانت تمھیں چاہیئے میں دینے کے لیے تیار ہوں تمھارے غیر قانونی دھندوں کی حفاظت میرا ذمہ ہوگی —— لیکن تم اس کھیل میں نہ آؤ"

ریاست شاہ نے اُسے سمجھانے کے انداز میں کہا

"شاہ جی —— کم از کم آپ کو یہ بات نہیں کہنی چاہیئے۔ اب تک آپ کو اندازہ ہو جانا چاہیئے کہ میں اس کھیل کے داؤ پیچ آپ سے زیادہ بہتر سیکھ گیا ہوں —— نتھو خاں کی مثال تمھارے سامنے ہے ریاست شاہ" ——

سردار رشید نے الفاظ چباتے ہوئے کہا

اور —— بس ایک ہی فتح پر دماغ خراب ہو گیا"

ریاست شاہ نے طنزیہ لہجے میں کہا

"دیکھو ریاست شاہ ہم یہاں ایک دوسرے کو اونچا نیچا دکھانے کے لیے نہیں

یوں بھی ہمارا اصول ہے کہ جو کام بھلے مانسی سے ہو جاتے اس کے لیے زیادہ دھوم دھڑکا اچھی بات نہیں —— ریاست شاہ محبت اور جنگ کی طرح سیاست میں بھی سب جائز ہے۔ اس بات کو کبھی نظر انداز نہ کرنا کہ حنیف خاں ہمارے قبضے سے نہیں نکل سکتا —— تم ایک طوائف کے ذریعے اُسے کب تک قابو میں رکھ سکو گے —— ہم ایسی درجنوں طوائفیں جمع کر سکتے ہیں لیکن میں کم از کم اس سطح پر اُترنا نہیں چاہتا —— الیکشن میں چار روز باقی ہیں —— اور تم ہار چکے ہو —— تم اگر احمقوں کی جنت میں نہیں رہتے تو تمھیں علم ہو چکا ہوگا کہ تم ہار چکے ہو۔ البتہ میرے پاس تمھارے لیے اب بھی ایک قابلِ عزت پیش کش موجود ہے —— اس بات کو ذہن میں رکھنا ریاست شاہ کہ فی الوقت پلڑہ میری طرف جھکا ہوا ہے۔ اس الیکشن کے نتیجے میں اگر میں ہار بھی جاؤں جو بظاہر ممکن نہیں تب بھی میرا کیا بگڑے گا —— جو سال بعد نئے الیکشن ہونے والے ہیں میں پھر میدان میں آ جاؤں گا لیکن تم ہار گئے تو —— تمھارے لیے سارے دروازے بند ہو جائیں گے ——"

سردار رشید نے اُسے سمجھایا۔

ایک لمحے کے لیے تو صورت حال کی سنگینی کا ادراک ہونے سے ریاست شاہ بھی لرز کر رہ گیا۔ واقعی شکست کے بعد اُس کے لیے کوئی چانس باقی نہیں رہتا تھا۔

"تم کہنا کیا چاہتے ہو ——"

بالآخر اُس نے قدرے کمزوری دکھا ہی دی۔

"میرے پاس ایک بہترین آفر موجود ہے جس سے تم بھی کامیاب رہو گے اور ہم بھی ——"

سردار رشید نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"کیا؟"

اُس کی بجائے فضل شاہ نے پوچھا

"تم ہمارے لیے یونین کونسل کی چیئرمینی چھوڑ دو —— اور اگلے انتخاب میں ایم این اے کی سیٹ بھی ہماری ہونی چاہیئے —— اس کے عوض موجودہ ایم پی اے کی سیٹ ہم تمھیں

دینے کے لیے تیار ہیں۔"

سردار رشید نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا اور فضل شاہ کو یوں لگا جیسے کسی نے بڑے زور سے گھونسا اُس کے دل پر مار دیا ہو۔ اگر یونین کونسل اُن کے ہاتھ میں نہ آئی تو اُس کی طرف سے سب کچھ بھاڑ میں جاتا ـــ اس طرح تو صرف ریاست شاہ ہی فائدے میں رہتا وہ تو مارا جاتا۔

"یہ کیسے ممکن ہے؟"

بے اختیار اس کے مُنہ سے نکلا۔

ریاست شاہ نے گھُور کر اُس کی طرف دیکھا کیونکہ اپنی موجودگی میں وہ فضل شاہ کو بات کرنے کا اختیار دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"مجھے کچھ سوچنے دو سردار رشید ـــ یہ فیصلہ وقت چاہتا ہے" ـــ

ریاست شاہ نے کہا

"نہیں ریاست شاہ ـــ اس وقت دراصل ہم دونوں کے پاس ایک دوسرے کو مارنے کے لیے وقت ہی سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ وہ تمھارے ہاتھ میں نہیں دے سکتا۔ تمھیں اس میز سے فیصلہ کرکے اُٹھنا ہو گا اور ہاں اپنی بات کا بندوبست ہم نے کر رکھا ہے کہ ایک دوسرے کو جو گارنٹی بھی دی جائے گی اُسے پورا کیا جائے ـــ"

سردار رشید اُسے سیٹ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"ہم آدھے گھنٹے بعد ملتے ہیں۔"

یہ کہہ کر ریاست شاہ نے فضل شاہ کو اُٹھ کر اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

"سردار صاحب اَب مَیں دیکھتا ہوں اس کی ہوشیاری اور سیاست بازی کو ـــ تو فضل شاہ کبھی اُسے یہ آفر قبول کرنے نہیں دے گا اگر اُس نے فضل شاہ کو راضی کر لیا تو فضل شاہ اُسے مار ڈالے گا ـــ اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اپنے کا تماشا اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتا رہے ـــ"

عالم داد نے سرگوشی کے لہجے میں کہا

"فضل شاہ بے وقوفوں کی طرح ضد نہیں کیا کرتے۔ ہم موجودہ الیکشن نہیں جیت سکتے۔ یہ تب ہی ممکن تھا اگر نقو خاں کی برادری ہمارے ساتھ رہتی۔ اُن کے آٹھ دس ہزار ووٹرز ہی کسی کی قسمت کا فیصلہ کر سکتے ہیں ـــ میرے خیال سے ہمیں یہ آزمائش لینی چاہیے۔"

ریاست شاہ نے فضل شاہ کو زچ ہو کر کہا جو کسی بھی طرح اس کے حق میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"شاہ جی وہ تو ٹھیک ہے ـــ اگر ہم وقتی طور پر مان بھی جائیں تو یونین کونسل ـــ اور آپ جانتے ہیں کہ یونین کونسل ہاتھ سے نکل گئی تو ہم الیکشن کا خرچ بھی پورا نہیں کر سکتے ـــ کیونکہ آپ کو ان حالات میں کوئی منسٹری نہیں مل سکے گی اور کوئی "مشاورت" کی سیٹ مل بھی گئی تو ہم کیا کما لیں گے ـــ بہرحال مجھے آپ کے ہر فیصلے کا احترام ہے" ـــ

فضل شاہ نے دل پر جبر کرتے ہوئے کہا۔ اس کے دل میں اپنے سوتیلے بھائی کے لیے پہلے سے موجود نفرت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا کیونکہ وہ اس مرحلے پر بھی فضل شاہ ہی کو قربانی کا بکرا بنانے پر تُلا ہوا تھا۔

"شاباش فضل شاہ ـــ مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔ تم بے فکر رہو۔ اتنا گدھا میں بھی نہیں کہ آسانی سے انھیں حلوہ کھانے دوں گا ـــ مَیں نے بھی دُنیا دیکھی ہے فضل شاہ۔ ان نکھٹوؤں کو سیاست کہاں سے آگئی ـــ ایک مرتبہ اسمبلی میں پہنچ جاؤں ـــ ابھی یونین کونسل کے الیکشن کو چھ ماہ باقی ہیں ـــ مَیں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر سردار رشید پر معاہدہ توڑنے کا الزام لگا دوں گا ـــ کوئی نہ کوئی جواز پیدا کر لوں گا ـــ تمھاری سیٹ پکی ہے فضل شاہ ـــ لیکن فی الوقت مجھے ایم پی اے بن جانے دو" ـــ

ریاست شاہ نے اسے بچوں کی طرح بہلانا چاہا ـــ

"ٹھیک ہے شاہ جی ـــ جو آپ کا حکم" ـــ

فضل شاہ نے دل پر پتھر رکھ کر خون کے گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔ اُس نے
دل ہی دل میں کچھ اور طے کر لیا ہے وہ اس طرح بندھے ہاتھوں سے بندر کے
ہاتھ میں گڑیا نہیں دے سکتا تھا۔

ریاست شاہ کے جواب نے کچھ دیر کے لیے عالم داد اور سردار رشید کو بھی چپ
کر دیا۔

لیکن ——

وہ جلد ہی سمجھ گئے کہ اب ریاست شاہ اس بُری طرح پھنسا ہوا ہے کہ اس کے
پاس فرار کا اور کوئی راستہ ہی باقی نہیں بچا۔

اس معاہدے کی ضمانت کا اہتمام یہاں پہلے سے موجود تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے
دونوں کی ملاقات کروائی تھی اس کی اعلیٰ سرکاری حیثیت کے پیشِ نظر فریقین کو اس بات
کا بخوبی علم تھا کہ اُن میں سے جس کسی نے معاہدے کی خلاف ورزی کی اُسے توقعات سے
بڑھ کر اس کی قیمت اَدا کرنی پڑے گی۔

دونوں یہ بات بخوبی سمجھتے تھے کہ جو معاہدہ یہاں ہوا ہے اس کی ایک ایک شق پر
انھیں بہرصورت عمل کرنا ہے یہی وجہ تھی کہ انھوں نے بادلِ نخواستہ ہی سہی اس منصوبے
کو قبول کر لیا تھا۔

لیکن ——

فضل شاہ نے نہیں۔ !

اس کے لیے یہ تصور ہی بڑا سوہانِ رُوح تھا کہ عالم داد تحصیل کونسل کا اگلا چیئرمین
بننے والا ہے۔ اس طرح تو اُسے اپنے بیشتر دھندے سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ اُس نے
جس جس طرح عالم داد کو نقصان پہنچانا تھا اور اپنی دانست میں جیسے اُس کا دو نمبر کا دھندہ
تباہ کرنے کی کوششیں کرتا رہا تھا اس کے بعد سے عالم داد سے خیر کی توقع دیوانے کے
خواب والی بات ہی ہوتی۔

الیکشن سر پر تھا ——

اگر دونوں کے درمیان ہوئے معاہدے کو اگلے روز سردار رشید یا ریاست شاہ
کی طرف سے ریکارڈ پر لایا جاتا تو فضل شاہ کے لیے کچھ باقی نہ بچتا۔

اُسے جو کچھ بھی کرنا تھا —— فوراً کرنا تھا۔

اور ——

اس کے شیطانی ذہن نے ایک خطرناک منصوبہ سوچ بھی لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ
حنیف خان اُن دونوں کی تاک میں ہے۔ وہ اپنے باپ کا انتقام لینے کے لیے باؤلا ہوا
پھرتا ہے اور اس معاہدے پر اگر عمل ہو جاتا تو سردار رشید کا گروپ حنیف خاں کو بھی قابو
کر لیتا جس کے بعد تو امید کی کوئی کرن فضل شاہ کے لیے باقی نہیں بچتی تھی۔

اسے آج کی رات ریاست شاہ کی زندگی کی آخری رات بنانی تھی۔ خواہ اس کی کچھ
بھی قیمت اَدا کرنی پڑتی۔

اُس کے پاس اب ایک آخری داؤ رہ گیا تھا اور وہ تھا نذیر موچی —— !

وہ ریاست شاہ کو راتوں رات قتل کر کے یہ قتل نذیر موچی کے سر مونڈھ سکتا تھا۔
نذیر موچی کے فرار ہونے کے بعد اُس کے کھاتے میں کوئی بھی جُرم ڈال سکتا تھا۔ دونوں
بھائیوں نے تو یہاں تک سوچ رکھا تھا کہ اگر پولیس نے انتہائی دباؤ پر اُن کی طرف رُخ
کر بھی لیا تو وہ نتھو خاں کا قتل بھی نذیر موچی کے کھاتے میں ڈلوا کر اپنی جان چھڑا لیں گے۔

فضل شاہ کے ماتھے پر حرام لکھا تھا۔

حرام کاری کے معاملات میں وہ قسمت کا دھنی کہلاتا تھا۔

اُسے کیا علم تھا کہ جب وہ ہوس میں اندھا ہو کر اپنے بھائی کی بلی دے کر اقتدار کے
ایوانوں میں داخلے کی راہیں تراش رہا تھا عین اُن لمحات میں جوشِ انتقام میں اندھا حنیف
خاں کھا سانسی کے لڑکوں کے ساتھ اُن کے راستے میں ناکہ لگائے بیٹھا تھا۔

شہر سے اب وہ لوگ اُس ویران سڑک کی طرف مُڑ گئے تھے جو نہر کے کنارے
بنائی گئی تھی۔ اس سڑک پر عام ٹریفک کو چلنے کی اجازت نہیں تھی۔ اِس لیے سڑک کے آغاز

یں محکمہ نہر والوں نے ایک لوہے کا گیٹ لگا رکھا تھا۔

لیکن

ریاست شاہ کی گاڑی کو روکنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔

نہر کے کنارے خودرو گھاس کا ایک جنگل سا اُگ آیا تھا اور اس جنگل کے
ایک محفوظ کنج میں حنیف خاں اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ سڑک پر نظریں جمائے بیٹھا
انھوں نے ایسی مناسب جگہ منتخب کی تھی جہاں سے اپنا کام کر کے تینوں آسا
سے نکل سکتے تھے۔

حنیف خاں کو صبح ہی اطلاع مل گئی تھی کہ دونوں شیطان شہر گئے ہوئے ہیں
اور اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ دوپہر کے بعد اس جگہ ناکہ لگایا تھا۔ ا
علم تھا کہ اُن کی گاڑی اسی طرف سے واپس آئے گی۔ شاہ پور کو آنے کے لیے د
اور راستے بھی تھے۔

لیکن

وہ عوام الناس کے لیے تھے۔

شاہ صاحبان کے لیے یہی سرکاری راستہ تھا جہاں حنیف خاں اور اس کے
ساتھی موت کے فرشتے بن کر اُن کے راستے میں جال بچھائے بیٹھے تھے۔

شام ڈھل رہی تھی جب انھوں نے ملگجے اندھیرے میں ریاست شاہ کی جیپ
اس طرف آتے دیکھی۔ اس پجیرو کو حنیف خاں آنکھیں بند کر کے پہچان سکتا تھا کیونکہ
اُسے متعدد مرتبہ اس میں سواری کا موقعہ ملا تھا۔

"تکڑا ہو جا چنی"۔

حنیف خاں نے کچھ فاصلے پر موجود چنی سے کہا جو اس کا اشارہ پاتے ہی پہلے
سے منتخب کردہ اپنے مورچے کی طرف چلا گیا تھا۔ اس نے اپنی "ریپیٹر" فائرنگ پوزیشن
میں کر لی تھی اور اب گاڑی پر نظریں جمائے ٹریگر پر اُنگلی رکھے بیٹھا تھا۔

چنی کا اشارہ پاتے ہی اُس کے بھائی ترلوک نے نہر کے ساتھ ساتھ جنگلی گھا

یں گاڑی کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں کلاشنکوف پکڑی ہوئی
تھی اور اس کی کمر سے گولیوں کا تھیلا بندھا تھا۔ تینوں کے درمیان اب کم از کم تیس تیس
چالیس چالیس گز کا فاصلہ ہو گیا تھا۔ اس طرح انھوں نے اپنی دانست میں جیپ
کو گھیرے میں لینے کا منصوبہ بنایا تھا تاکہ دونوں کے بچ نکلنے کا کوئی موقعہ باقی نہ رہے۔

ریاست شاہ اگلی سیٹ پر خراٹے بھر رہا تھا جبکہ فضل شاہ اپنے دو آدمیوں کے ساتھ
پچھلی سیٹوں پر بیٹھا تھا جب اچانک انھیں فائر کی آواز سنائی دی اس کے ساتھ ہی
پجیرو کا ٹائر برسٹ ہو گیا۔

ڈرائیور نے کسی برقی عمل کے تابع اچانک ہینڈ بریک کھینچی اور گاڑی زوردار جھٹکے
سے رُک گئی۔ یہی جھٹکا ریاست شاہ کی زندگی بچا گیا کیونکہ اس کی طرف آنے والی گولی
پیچھے بیٹھے ایک ملازم کے سر میں لگی جسے آواز نکالنے کی مہلت بھی نصیب نہ ہوئی۔

اچانک جھٹکا لگنے سے ریاست شاہ گاڑی سے باہر گر پڑا تھا۔

فضل شاہ اچانک بجلی کی طرح اپنی جگہ سے اُٹھا اور اس نے پچھلا دروازہ کھول کر
باہر چھلانگ لگا دی۔

"تم انھیں روکو ۔۔۔ ہم نہر کی طرف سے نکلتے ہیں"

اُس نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی اور زمین پر گرے ریاست شاہ کو بازو پکڑ کر
اپنی طرف کھینچا ۔۔۔

"بھائی صاحب ۔۔۔ اس طرف" ۔۔۔

فضل شاہ نے اپنے گلے میں لٹکتا ریوالور اس درمیان اپنے ہاتھ میں تھام لیا تھا۔
ریاست شاہ ہونقوں کی طرح اس کے ساتھ پیچھے کی طرف بھاگنے لگا۔

ڈرائیور اور اس کے دونوں ساتھیوں نے اس درمیان اپنی بندوقیں سنبھال لی تھیں،
وہ جرائم پیشہ لوگ تھے اور ایسی صورتحال کا مقابلہ کرنے ہی کے لیے ریاست شاہ نے
انھیں پالا ہوا تھا ۔۔۔

فضل شاہ اپنے بھائی ریاست شاہ کو اپنے پیچھے جنگلی گھاس میں لے آیا تھا۔ اُس

نے سوچا تھا یہاں سے وہ لوگ نہر میں چھلانگ لگا کر دوسری طرف نکل جائیں۔

اچانک ہی اس کے اندر شیطان جاگ اُٹھا۔

"فضل شاہ — عقل کے اندھے۔ اس سے بہتر موقعہ کب ملے گا"

شیطان نے سرگوشی کی اور فضل شاہ کے خون کی گردش تیز ہوگئی۔ داقعی اسے سنہ
موقعہ ملا تھا اپنے گھناؤنے منصوبے پر عمل پیرا ہونے کا —!

اچانک ہی اس نے اپنا ریوالور ریاست شاہ کی طرف سیدھا کر لیا۔

"ک ک کیا مطلب"؟

ریاست شاہ نے حیرانگی سے اُس کی طرف دیکھا۔

"شاہ جی۔ مجھے نہیں لگتا کہ ہم یہاں سے بچ کر نکل سکیں — لیکن میرے لیے
بھی ممکن نہیں کہ آپ کو اپنی آنکھوں کے سامنے دشمن کی گولی سے مرتا دیکھوں — یہ
حنیف خان نے کیا ہے شاہ جی۔ وہ ہمیں بچ کر نہیں جانے دے گا — کیوں نہ میں آپ
اپنے ہاتھ سے گولی مار دوں" —

فضل شاہ کی آواز خوف کی طرح ریاست شاہ کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی تھی

"فضل شاہ تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے — تم کیا بک رہے ہو" —

ریاست شاہ نے اچانک سنبھل کر جھلاتے ہوئے کہا

"میرا تو دماغ ہی شاہ جی خراب ہو رہا ہے۔ اگر حنیف خاں کے ہتھے چڑھ گئے تو آپ
کا مُردہ خراب کر دے گا — آپ نادِ علی پڑھیں تاکہ میں گولی چلاؤں" —

فضل شاہ کی شیطانیت نقطہ عروج کو چھو رہی تھی۔

"فضل شاہ، کُتّے کے پِلّے، تیری یہ مجال —"

گالیاں بکتے ہوتے ریاست شاہ نے اس کی طرف بڑھنا شروع کیا۔

لیکن —

بمشکل دو تین قدم ہی چلنے پایا تھا جب اچانک وہ تلملا کر گر پڑا۔ فضل شاہ نے گو
اُس کے سینے میں اُتار دی تھی۔

زمین پر گِرے اپنے سوتیلے بھائی کے سر میں ہوس کے اندھے فضل شاہ نے دو اور
گولیاں اُتار کر اطمینان کر لیا کہ اب شاہ صاحب کے زندہ بچنے کی کوئی اُمید باقی نہیں رہی۔

ریاست شاہ کے ساتھیوں کو کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان پر کسی فوج نے حملہ
کر دیا ہو۔ انھیں فائرنگ کے ساتھ ساتھ حنیف خاں کی ریاست شاہ اور فضل شاہ کو
گالیاں دینے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

لیکن —

حملہ آور دکھائی نہیں دے رہے تھے —

اُن کے ایک ساتھی کی لاش گاڑی میں پڑی تھی۔ جب اچانک انھوں نے اپنے دوسرے
ساتھی کی چیخ سنی اس کے ساتھ ہی وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

باقی دونوں حواس باختہ ہو کر پیچھے کی طرف کھسکنے لگے۔ اچانک ہی انھوں نے فضل شاہ
کو چلّاتے سُنا۔

"بڑے شاہ جی کو گولی لگ گئی ہے —"

دونوں نے یہ سُنتے ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ نہر میں چھلانگیں لگا دیں — وہ جرائم پیشہ لوگ
تھے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ریاست شاہ اُن کی ہر جائز ناجائز ضرورت پوری
کرتا تھا اور پولیس کو کبھی ان کے نزدیک بھی نہیں پھٹکنے دیا تھا۔

لیکن —

وہ ریاست شاہ یا فضل شاہ کے لیے جان دینے سے تو رہے۔ جب ریاست شاہ ہی مر
گیا تو وہ لڑتے کس کے لیے۔ اُن کی حنیف خاں سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔

فضل شاہ نے چند لمحوں کے لیے صورتحال کا جائزہ لیا۔ قدرے اندھیرے میں
اُس نے کچھ فاصلے سے حنیف خاں کو ایک جھنڈ سے نکلتے دیکھا تو دیوانہ وار پیچھے کی
طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ فرار ہونے کے لیے اس نے جنگلی گھاس کی پناہ لی تھی —
فضل شاہ کو احساس ہی نہ ہو سکا کہ وہ اس گھاس میں کتنا بھاگ چکا ہے۔ اُس

کی سانس ہی نہیں ٹانگیں بھی پھولنے لگی تھیں ۔ کپڑے پھٹ رہے تھے اور اس کا بُرا حال تھا۔ بھاگتے بھاگتے اس نے اپنا ریوالور اور گولیوں کا پٹہ نہر میں پھینک دیا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ نہر کا تیز پانی دونوں چیزیں بہا کر اب تک بہت دُور جا چکا ہوگا۔ یہ بغیر لائسنس کا اسلحہ تھا جس کا کوئی ریکارڈ بھی نہیں تھا۔ اگر کبھی برآمد بھی ہو جاتا تو پولیس کے لیے بیکار تھا۔

فضل شاہ کی اس دوڑ کا خاتمہ فاریسٹ کالونی پر ہوا۔ جس کے باہر ہی پولیس چوکی میں موجود کانسٹیبلوں نے اُسے یہاں پاکر حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"حنیف خاں نے ہم پر حملہ کر کے بڑے شاہ صاحب کو قتل کر دیا ہے ___ میرے دو اور ساتھی بھی مارے گئے ہیں۔

اس نے ہانپتے ہوئے اے ایس آئی سے کہا

جس نے شاہ صاحب کو حوصلہ دیا اور تھوڑی دیر بعد وہ پولیس کی جیپ میں موقع واردات کی طرف جا رہا تھا جہاں ریاست شاہ اور اُس کے دو ساتھیوں کی لاشیں موجود تھیں۔ حنیف خاں نے اپنا باقی غصہ اُن کی گاڑی پر نکالا تھا جس کو اُس نے گولیوں سے چھلنی کر کے رکھ دیا تھا۔ جاتے جاتے وہ ریاست شاہ کا مُردہ بھی خراب کر گیا تھا ___ اُس نے یہی سمجھا ہوگا کہ ریاست شاہ اُن کی فائرنگ سے مرا ہے اور جوشِ انتقام میں مردہ ریاست شاہ کے جسم پر اپنا پورا موزر خالی کر دیا تھا۔

رات کے اندھیرے میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح نزدیک دُور کے دیہاتوں میں پھیل گئی تھی کہ ریاست شاہ کو نتھو خاں کے بیٹے نے مار ڈالا ہے ___

فضل شاہ کے لیے یہ بڑی آئیڈیل سچویشن تھی۔

سب کچھ اس کی مرضی کے عین مطابق ہوا تھا۔ اُس نے ٹسوے بہاتے ہوئے پولیس کو خود پر ٹوٹنے والے ظلم کی کہانی سُنائی اور حملہ آوروں میں حنیف خاں، عالم داد اور سردار مرید اور نامعلوم لوگوں کے نام لکھوا دیئے۔ اُس نے پولیس کو بتایا کہ ان تینوں کو اس نے شناخت کر لیا تھا جبکہ باقی لوگوں کو وہ شناخت نہیں کر سکا۔

وجہ قتل اُس نے سیاسی دشمنی بتائی اور اپنی رپورٹ میں لکھایا اور سردار رشید نے سیاسی میدان میں اپنی ناکامی کا یقین ہونے پر مقتول نتھو خاں کے بیٹے حنیف خاں کو گمراہ کر کے اُن پر حملہ کروایا ہے۔ اس حملے کی کمان اس کا بھائی سردار مُرید کر رہا تھا۔ جس کے ساتھ عالم داد اور حنیف خاں موجود تھے۔

فضل شاہ نے اپنی دانست میں ایسی ایف آئی آر درج کروا دی تھی کہ اب سردار مرید اور عالم داد کی ضمانت کا کوئی چانس باقی نہیں بچا تھا۔

اُس نے ریاست شاہ کی بلی یوں ہی نہیں دی تھی۔

اس بلی کے عوض وہ بیک وقت کئی فوائد حاصل کرنے جا رہا تھا۔ اُسے نہ صرف اگلے الیکشن میں کامیابی حاصل کرنی تھی بلکہ یونین کونسل پر بھی قبضہ کرنا تھا۔ اس نے اپنی دانست میں ریاست شاہ کا جھٹکا کر کے سردار رشید کو چاروں شانے چت کر دیا تھا۔

"لے بچّہ تو بن جا چیئرمین یونین کونسل کا ___"

اس نے دانت پیستے ہوئے عالم داد کو دل ہی دل میں گالیاں دیں۔

راتوں رات وہاں شاہ پور اور گرد و نواح کے سینکڑوں لوگ جمع ہو چکے تھے۔ انھوں نے لاشیں اٹھائیں اور سرداروں اور حنیف خاں کو لعن طعن کرتے شاہ پور لے آئے۔ جہاں کسی ممکنہ تصادم کے پیش نظر پولیس نے ہنگامی چوکی بنا دی تھی۔

ریاست شاہ کی خصوصی حیثیت کے پیش نظر ایس پی خود فضل شاہ سے ملنے آیا تھا۔ اس نے فضل شاہ سے درخواست کی تھی کہ تینوں لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے پولیس کے حوالے کی جائیں تاکہ معمول کی کارروائی پوری ہو سکے۔

لیکن ___

غم و غصے سے نڈھال فضل شاہ نے اپنے بھائی کی لاش کی مزید چیر پھاڑ کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ بڑی منت سماجت کے بعد پولیس افسران نے تینوں لاشیں اس وعدے پر حاصل کی تھیں کہ وہ شام ہونے سے پہلے انھیں واپس لوٹا دیں گے تاکہ

لاشوں کو دفن کیا جاسکے۔

پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹروں نے فضل شاہ کے احکامات کے مطابق رپورٹ تیار کرکے پولیس کو دے دی تھی۔ شام ڈھلے ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں اُس نے لاشیں دفن کروادیں۔

ریاست شاہ کو شہیدِ جمہوریت کا خطاب ملا تھا۔ کیونکہ اس نے علاقے کے غریب عوام کی فلاح و بہبود کے لیے الیکشن لڑنا تھا اور علاقے کے سرداروں کو یہ قبول نہیں تھا کہ یہاں کے عوام کو پھولتے پھلتے دیکھ لیں۔

فضل شاہ نے اپنے بھائی کی میّت کے سرہانے کھڑے ہوکر اعلان کیا تھا کہ وہ اپنے "شہید بھائی" کی قربانی رائیگاں نہیں جانے دے گا اور اس کے عزائم پورے کیے جائیں گے اُس نے اپنے بھائی کی لاش کے سرہانے ہی اپنے بھائی کی جگہ الیکشن لڑنے کا اعلان کردیا تھا۔ اور سوگواروں سے کہا تھا کہ اب ریاست شاہ شہید کی رُوح کو تب ہی اطمینان حاصل ہوگا جب اس کا بھائی اسمبلی میں پہنچ کر اُس کے مشن کو مکمل کرے گا۔

فضل شاہ کی جذباتی تقریر نے ماحول کو خاصا گرما دیا تھا ——

مجمع نے فضل شاہ زندہ باد کے نعروں سے آسمان سر پر اُٹھا رکھا تھا۔

اِرد گرد کے دیہاتیوں نے قبرستان ہی میں فضل شاہ کو حلف دیا تھا کہ وہ اس کی کامیابی کے لیے دن رات ایک کردیں گے اور اپنی جان لڑا کر بھی اُسے کامیاب کروائیں گے۔

یہی فضل شاہ چاہتا تھا۔

اُس نے ایک تیر سے کئی شکار کھیل لیے تھے۔

وہ بڑا گھاگ شکاری تھا۔

اب سب کچھ اس کا تھا۔ اس نے سرداروں کے لیے کچھ باقی نہیں چھوڑا تھا۔ قدرت نے جیسے خود ہی اُس کے راستے کی ساری رکاوٹیں دُور کردی تھیں۔

جنازے سے واپسی پر اس نے اپنے گاؤں ہی میں پریس کانفرنس کا اہتمام کر رکھا تھا "بھرپور" بنانے کے لیے اس کے گرد کے شہر سے اخبار نویسوں کو گاڑیوں پر بٹھا کر اُن کی

جیبیں گرما کر لاتے تھے۔

ان اخبار نویسوں کے سامنے "صدمے سے نڈھال" فضل شاہ نے اپنے بھائی کے قاتلوں کے نام دُہراتے اور یہ شک بھی ظاہر کیا کہ موجودہ اعلیٰ پولیس حکام سے سرداروں کی رشتہ داری کے سبب اُسے خدشہ ہے کہ یہ لوگ انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہونے دیں گے ——

اُس نے فوری طور پر ڈی آئی جی کے تبادلے کا مطالبہ کیا تھا اور کسی غیر جانب دار پولیس آفیسر کے ذریعے تفتیش کرنے کی درخواست کی تھی۔

سوگواروں کا تانتا بندھا تھا۔

اور ——

ہر آنے والا لمحہ فضل شاہ کی پوزیشن مضبوط کر رہا تھا۔

سردار رشید نے اپنی دانست میں بڑا کامیاب داؤ کھیلا تھا۔ اس سارے کھیل کے پیچھے حوالدار عالم داد کا شیطانی ذہن کارفرما تھا۔ ابھی تک اس نے بڑی کامیابی سے اپنے مُہرے ایک ایک کرکے آگے بڑھائے تھے ——

اُس نے ایسے حالات پیدا کردیے تھے کہ ریاست شاہ کے لیے نقوخاں کا قتل ناگزیر ہوجاتا اور اب حنیف خاں کو اُن کے سروں پر لٹکتی تلوار بنا کر جہاں سردار رشید کے لیے ایم پی اے کی سیٹ حاصل کرلی تھی وہاں اپنے لیے یونین کونسل کی چیئرمینی بھی پکی کرلی تھی ——

اب بظاہر اس کے راستے کی کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہی تھی —— وہ جب چاہتا ریاست شاہ اور سردار رشید مل کر حنیف خاں کو بھی اس کے باپ کے پیچھے روانہ کردیتے جس کے بعد راوی اس کی قسمت میں چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

لیکن ——

یہاں جو کچھ ہوگیا تھا اُس کا تو کبھی عالم داد یا سردار رشید کو گمان بھی نہیں گزرا تھا۔

وہ لوگ تو ریاست شاہ اور فضل شاہ سے معاہدہ کرکے اپنی دانست میں اپنی سیٹیں پکی
کرکے آرہے تھے کہ اچانک یہ بلا اُن کے سروں پر آن پڑی۔

پولیس کے دو ٹرکوں نے اُن کی زندگیوں میں پہلی مرتبہ بلوال کو گھیرے میں لیا تھا۔
پولیس فورس کو جس کی کمان ایک ڈی ایس پی کر رہا تھا۔ آئی جی صاحب نے خصوصی احکامات
کے ساتھ بلوال کی طرف روانہ کیا تھا۔

پولیس کے جوانوں نے چند منٹ ہی میں سارے گاؤں کا محاصرہ کر لیا ــــ!

سردار رشید نے یہی سمجھا کہ شاید سرحدی علاقہ ہونے کے سبب یہاں دہشت گردوں
کی موجودگی کا خطرہ پیدا ہو گیا ہو۔ یہی سوچتے ہوئے وہ اپنے بھائی سردار مُرید کے ساتھ
اپنی حویلی سے نکل کر پولیس کی طرف جا رہا تھا۔

انھیں چند گز دور ہی سے ڈی ایس پی اپنی طرف آتا دکھائی دیا ــــ

"کیا بات ہے۔ خیریت ہے۔ تم لوگ . . ."

"آپ سردار رشید صاحب ہیں" ــــ

ڈی ایس پی نے جس کے ساتھ پولیس کے دس مسلح جوان موجود تھے، اس کی بات کاٹتے
ہوئے کہا

"ہاں ــــ مَیں ہی سردار رشید ہوں اور یہ میرے بھائی سردار مُرید اور گاؤں کے
معززین ہیں" ــــ

اُس نے بڑی اکڑ سے گردن پُھلاتے ہوئے اپنے بھائی اور اپنے ساتھیوں کا تعارف
کروایا۔

ڈی ایس پی نے اپنے جوانوں کو سردار مُرید کو ہتھکڑی لگانے کا حکم دیا تو سردار رشید
کا دماغ غصّے سے پھٹنے کو آ گیا۔

"تمھارا دماغ خراب ہے کیا ــــ جانتے ہو تم کہاں کھڑے ہو؟"

سردار رشید نے چیختے ہُوئے غصّے سے کہا

"سردار صاحب میری درخواست ہو گی کہ اپنی زبان کو لگام دیجیے۔ شاید میرے ساتھی

لہجے میں بات سُننے کے عادی نہ رہے ہوں۔ میرے پاس سردار مُرید کی گرفتاری کے
ٹ ہیں۔ مَیں انھیں ریاست شاہ کے قتل کے الزام میں گرفتار کر رہا ہوں۔ آپ سے
ون کی اُمید رکھتا ہوں۔ برائے مہربانی ہمارے کام میں مداخلت نہ کیجیے ــــ"

ڈی ایس پی کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اگر سردار رشید نے اس کے بعد اپنے مُنہ سے ایک
بھی نکالا تو وہ اُس کے مُنہ پر تھپڑ رسید کر دے گا۔

اس دوران اس کے ماتحتوں نے بکے بکے سردار مرید کو ہتھکڑی لگا لی تھی ــــ

"جناب عالم داد یہ ہے"

سرداروں کے ٹکڑوں پر پلنے والے مقامی تھانیدار نے جو اس خصوصی پولیس فورس کی
رنے کے لیے ان کے ساتھ آیا تھا۔ گاؤں کے معززین میں سے حوالدار عالم داد کو پہچانتے
ئے اس کی طرف اشارہ کیا۔

"گرفتار کر لو اسے بھی" ــــ

ڈی ایس پی نے اپنے جوانوں کو حکم دیا۔

دوسرے ہی لمحے انھوں نے عالم داد کو جس نے آج ہی سے خود کو یونین کونسل کا اگلا
ن سمجھنا شروع کر دیا تھا ہتھکڑی لگا دی۔

تھوڑی دیر کے بعد غصّے اور صدمے سے بے حال سردار رشید اور اس کے ساتھیوں
ڑاتا پولیس کا یہ قافلہ فضل شاہ کے نامزد دونوں ملزموں کو دھکّے دیتا اپنے ٹرکوں
رفتار کرکے پولیس لائن کی طرف جا رہا تھا ــــ

"فضل شاہ ــــ تُو نے اچھا نہیں کیا ــــ مَیں تجھے کُتّے کی موت مار ڈالوں گا ــــ
کی موت ــــ"

سردار رشید دانت پیستے ہُوئے بڑبڑایا۔

اس کے ساتھی بمشکل اُسے سہارا دے کر حویلی کی طرف لے جا رہے تھے۔

عشق اور طوائف کا...

دوسری طرف سے اچانک فائرنگ رُکنے کی آواز پر جنّی سب سے پہلے اپنی محفوظ پناہ گا
سے باہر نکلا تھا۔ اُس نے چیخ کر حنیف خاں سے کہا تھا کہ شکار بھاگ رہے ہیں کیونکہ وہی ا
پوزیشن میں تھا کہ انہیں بھاگتے ہوئے دیکھتا ــــــ

ترلوک اور حنیف خاں اُس کے متوجہ کرنے پر باہر نکلا تو شام کا ملگجا اندھیرا رات کی
میں تبدیل ہو چکا تھا لیکن ابھی بھی سامنے کا منظر قدرے صاف اور نمایاں دکھائی دیتا تھا۔ حن
خاں اور اُس کے ساتھی بڑے چوکنے ہو کر پھونک پھونک کر قدم رکھتے اُن کی جیپ کی طر
بڑھ رہے تھے۔ اس خدشے کے پیشِ نظر کہیں وہ لوگ نزدیکی جھاڑیوں میں تاک لگا کر
ہوں انہوں نے تین چار برسٹ اپنے دائیں بائیں جھاڑیوں پر بھی برسا دیئے تھے۔

جیپ کے نزدیک پہنچنے پر تینوں نے وقفے وقفے سے درختوں کی آڑ لے کر جیپ پر گو
کا چھڑ برسایا تھا۔ اِس یقین کے بعد کہ اگر کوئی وہاں چھپا ہے تو اب تک اُن کی گولیوں سے مارا
جا چکا ہو گا۔ تینوں اب پھونک پھونک کر قدم رکھتے جیپ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جیپ
نزدیک پہنچ کر جنّی نے انہیں وہیں رُکنے کا اشارہ کیا اور خود جیپ کا محتاط ہو کر جائزہ لینے ل
لیکن ــــــ

اُن کی توقعات کے برعکس اس میں صرف ایک لاش موجود تھی۔ یہ وہی شخص تھا جو ا
طرف سے فائرنگ کے آغاز ہی میں مارا گیا تھا ــــــ

تینوں نے اپنے پاس موجود ٹارچیں نکال لی تھیں اور بڑی احتیاط سے تربیت یافتہ ڈیو
کی طرح اس سمت بڑھ رہے تھے جس طرف سے فضل شاہ اور اُس کے ساتھی فرار ہوئے تھے

پانچ چھ منٹ کی تگ و دو کے بعد انہیں ریاست شاہ کی لاش نظر آ گئی ــــــ
اب تک انہوں نے تین لاشیں شمار کر لی تھیں ــــــ
اچانک ہی ترلوک چلتا چلتا رُک گیا۔ وہ ہوشیار چیتے کی طرح فضا میں کچھ سونگھ رہا تھا۔ یہ
سرحد کے کیڑے تھے ــــــ
خطرے کی بُو وہ دور سے سونگھنے پر قدرت رکھتے تھے۔

"حنیفے ــــــ نکل چل پولیس آ رہی ہے"
جنّی نے اُس کی طرف دیکھ کر کہا
"لیکن فضل شاہ!......"
"کہاں جائے گا وہ بچ کر ــــــ لیکن اگر ہم ہی مارے گئے تو وہ بچا رہے گا۔ ابھی
چل شاباش ــــــ"

ترلوک نے حنیف خاں کا بازو جھٹکا دے کر اپنی طرف کھینچا اور تینوں دوسرے ہی لمحے نہر
کے کنارے کنارے بھاگنے لگے۔ انہوں نے اپنے فرار کی راہ کا پہلے ہی سے تعین کر لیا تھا اور اب
اس سمت جا رہے تھے۔

تینوں نے اسی رات سرحد عبور کر لی اور صبح ہونے تک وہ مُکھے سانی کے ڈیرے پر پہنچ
محفوظ ہو چکے تھے۔ ریاست شاہ کی لاش اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد حنیف خاں کے
دل پر پڑا منوں بوجھ اُتر گیا تھا ــــــ
لیکن ــــــ
ایک خلش ابھی تک باقی تھی۔
کاش اُسے فضل شاہ کی لاش بھی نظر آ جاتی۔
فی الوقت اُسے یہیں چھپ کر وقت گزارنا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر فضل شاہ زندہ بچ گیا ہے
اس کی حالت زخم خوردہ سانپ جیسی ہو گی اور وہ حنیف خاں کو مارنے کے لئے کوئی کسر باقی
نہ چھوڑے گا۔ حنیف خاں کے پاس فضل شاہ کا مقابلہ کرنے کیلئے صرف زور بازو تھا۔
لیکن ــــــ

اُس کے دشمن کے پاس قانون اور غنڈہ گردی دونوں بڑے مضبوط ہتھیار موجود
یہ بات حنیف خاں سمجھتا تھا کہ اُس کی ماں یا کسی اور رشتہ دار کو تنگ کرنے کی ہمت نتھو
میں نہیں اِس صورت میں اس کی برادری کے لوگ فضل شاہ کا جینا دوبھر کر سکتے تھے۔

انسپکٹر سیتارام ایک سال کا کشٹ کاٹ کر اس علاقے میں واپس آیا تھا ـــــ
اُس کے لئے کسی اور تھانے میں تبدیلی کوئی سزا نہیں تھی وہ تو جس تھانے میں بھی
اُس کے وارے نیارے تھے۔ ہر جگہ وہ اپنی مرضی اور دھونس دھاندلی کر سکتا تھا۔
لیکن ـــــ
پگٹانے جیسی موج نہیں اور نہ ہی مل سکتی تھی۔
اس کی ایک وجہ اس تھانے کی حد میں آنے والے پندرہ بیس دیہات تھے جن میں سے
ہر ایک میں دو تین سمگلر رہتے تھے۔ سرحدی علاقہ ہونے کے سبب ان لوگوں کا آنا جانا
کے پار لگا رہتا تھا اور انسپکٹر سیتارام کی موج رہتی تھی۔ وہ شہر کے کسی تھانے میں ہو کر
ہفتے میں ایک زائد مرتبہ تلاش کر پاتا تھا۔ یہاں آئے روز ایسی آسامیاں ہاتھ لگتی تھیں۔
دو تین دیہاتوں ـــــ میں اُسے اتنا ماہانہ مل جاتا تھا جتنے پیسے وہ ایک سال میں بھی کسی
دوسرے تھانے میں نہیں کما سکتا تھا۔
اس کی چھ بیٹیاں اور چار بیٹے تھے اور ان سب کو دیکھ کر کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ یہ
پرومان نستری (صدر) کی اولاد ہیں یا ایک پولیس انسپکٹر کے سپوت اور سپوتیاں ہیں۔ اُن کے
لچھن ایسے بگڑے ہوئے تھے کہ اگر سیتارام کے پاس یہ حرام کی کمائی نہ ہوتی تو اُن میں سے آدھے
اب تک خودکشی کر چکے ہوتے۔
اُس نے کمال ہوشیاری سے پنجاب کے دو تین شہروں میں اپنی اچھی خاصی جائیداد بنالی تھی
اور اپنی تین بیٹیاں اب تک بڑے اچھے طریقے سے بیاہ چکا تھا۔
اُسے زندگی میں ایک ہی قلق تھا کہ نتھو خاں کبھی اُس کے ہاتھ نہ لگا۔ یہی غصہ اُسے
سانپ پر تھا ایک سال پہلے بھی دو مرتبہ نتھو خاں اُس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور اسی کی

بڑی یادداشت میں اُس کو لائن حاضر ہونا پڑا تھا۔
جس طرح چھ ماہ اُس نے لائن حاضری پر بس گزارے تھے وہ اُس کا "پرماتما" (خدا)
ہی بہتر جانتا تھا۔ وہ اپنی صبح کا آغاز نتھو خاں کو گالیوں سے کرتا اور دن کا اختتام مکھے سانی
کو گالیاں دے کر ہوتا۔
یہ چھ ماہ اُس نے بیروزگاری کی حالت میں کاٹے تھے۔ صرف جیل کے قیدیوں کو تاریخ
پیشی بھگتانے کیلئے لانے اور لے جانے کی ڈیوٹی سے اُس کا کیا بنتا تھا۔ اُس کی خوش قسمتی تھی
کہ اُس کا پرانا ساتھی ڈی ایس پی ہیکٹر سے کا تبادلہ یہاں ہوا جس نے ایڑی چوٹی کا زور لگا
کر اُسے شہر کا ایک تھانہ لے دیا جس کے بعد اُس نے بھاگ دوڑ کر کے اپنا تبادلہ دوبارہ "پگٹانے"
میں کروالیا۔
یہاں آکر اُسے علم ہوا کہ مکھا سانسی مر چکا ہے تو اُس کے غصے کی انتہا نہ رہی کیونکہ وہ اُسے
اپنے ہاتھ سے گولی مارنا چاہتا تھا۔
لیکن ـــــ
مکھے کے دونوں بیٹے چھنّی اور ترلوک ابھی تک باپ کے کام کو آگے چلا رہے تھے۔ یہ
خبر اُس کے لئے بڑی خوش آئند تھی۔ اُس نے دل میں تہیہ کر رکھا تھا کہ جب بھی ان میں سے کوئی
اُس کی داڑھ کے نیچے آگیا۔ سیتارام اُسے ضرور پیس کر رکھ دے گا۔
سیتارام کے تھانے میں واپس لوٹنے سے جہاں سمگلروں اور مقامی چھوٹے موٹے بدمعاشوں
کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ وہاں کالیا کو بہت خوشی ہوئی تھی۔ گو کہ وہ گزشتہ دس سال سے
پولیس کا ٹاؤٹ تھا۔
لیکن ـــــ
جو مزہ اُسے سیتارام کے ساتھ کام کر کے آیا تھا وہ کسی اور تھانیدار کے ساتھ نہیں آسکتا تھا۔
کالیا سیتارام کو سلام کرنے آیا تو یہ خوشخبری بھی ساتھ ہی لایا کہ ترلوک اور چھنّی کے ہاں آج کل حنیف
خاں چھپا ہوا ہے۔ کالیا نے جب سیتارام کو یہ اطلاع دی تو زندگی میں پہلی مرتبہ بے اختیار اُس
نے چاہا کہ "کالیا" کا منہ چوم لے ـــــ

"تیرے منہ میں گھی شکر ——"

بے اختیار سیتارام کے منہ سے نکلا۔

"میں سمجھا نہیں مہاراج ——"

کالیا نے بھی سمجھا کہ سیتارام نے شاید زیادہ چڑھا رکھی ہے اور وہ نشے کی حالت میں بات کہہ گیا۔

"کچھ نہیں —— کچھ نہیں —— بس تم اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا۔ اگر اس مرتبہ بچ گیا تو یاد رکھنا......"

"مہاراج میرا کام تو آپ تک اطلاع پہنچانا ہے۔ باقی سب کچھ تو آپ نے ہی کرنا۔ اگر میری خبر غلط نکلے تو زبان کاٹ دیجئے گا۔"

کالیا نے بڑی سسکاری سے دانت نکالے۔

"ٹھیک ہے۔ بس تم اُس کے گھر کے گرد ہی منڈلاتے رہو۔ خیال رکھنا کہیں شکار نکل جائے۔ میں آج ہی چھاپہ مارتا ہوں۔"

سیتارام کو ڈھنگ کی بات ہی نہیں سوجھ رہی تھی۔

"مہاراج میں صرف یہی بنتی (درخواست) کروں گا کہ اُن پر کچّا ہاتھ نہ ڈالے بڑے پکّے ہاتھ ڈال کر ہی آپ انہیں قابو کر سکتے ہیں۔"

کالیا نے ڈرتے ڈرتے کہا

"زیادہ بک بک نہ کیا کر ——"

اُس نے کالیا کو ڈانٹ کر بھگا دیا۔

لیکن ——

کالیا کے جانے کے بعد سیتارام کے دماغ میں اُس کی کہی باتیں گونج پیدا کرتی رہیں۔ واقعی مکھے سانسی کے گھر سے کسی کو گرفتار کرنا بچوں کا کھیل نہیں تھا۔

سانسیوں کی آبادی کے عین درمیان اُس کا گھر قلعے کی صورت ایستادہ تھا۔ یہ تمام جرائم پیشہ تھے... کوئی گھر میں شراب نکال کر فروخت کرتا تھا اور کوئی سمگلنگ اور چوری۔

لڑکوں کی تو عورتیں پولیس کے قابو نہیں آتی تھیں جو اپنے گھر والوں کے جرائم میں ہمیشہ ہمدرد رہی تھیں مردوں کی تو دور کی بات تھی۔

یہاں کوئی گھر ایسا نہیں تھا جس کے پاس جائز اور ناجائز اسلحہ نہ موجود ہو۔ مکھے سانسی کو اُن کے سردار کی سی حیثیت حاصل تھی۔

ان لوگوں میں اتنا اتفاق تھا کہ ایک کے آواز دینے پر سارا گاؤں اُس کی مدد کو آجاتا تھا۔ پولیس کو یہاں سے کوئی مجرم پکڑنے کے لئے بڑی تگ و دو کرنی پڑتی تھی۔

پہلے تو سیتارام نے بھی سوچا تھا کہ وہ دوسری ایجنسیوں خصوصاً بی ایس ایف (بارڈر سیکورٹی فورس) کی مدد بھی ضرور حاصل کرلے کیونکہ حنیفا یہاں خالی ہاتھ تو بیٹھنے سے رہا۔

لیکن ——

اُس کا مقصد حنیف خاں یا مکھے کے لڑکوں کو گرفتار کر کے سرکار دربار سے شاباش لینا نہیں بلکہ اُن کے مال پر قبضہ کر کے لاکھوں روپے ہڑپ کرنا تھا اور اس کارِ خیر میں وہ کسی کی شرکت کیسے برداشت کرتا؟

بی ایس ایف والے کوئی سادھو سنت نہیں تھے کہ منہ باندھے رکھتے۔ وہ بس اُس سے اپنا حصّہ طلب کرتے یوں بھی اپنے شکار پر کسی بھی طرح کی بندر بانٹ سیتارام کو پسند نہیں تھی اُس نے اپنی پولیس فورس کے ذریعے ہی یہ معرکہ سر کرنے کی ٹھان لی تھی وہ جانتا تھا ایک مرتبہ اگر ہمت کر کے مکھے کے کسی لڑکے پر بھی قابو پالیا تو میدان مار لیا۔

اس سے پہلے کہ یہ "خبر" کسی دوسری ایجنسی کو ملے اُس نے خود ہی میدان میں نکلنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور اپنے تھانے کے کارخاص کے چار کانسٹیبلوں کو اپنے کمرے میں طلب کر کے پہلے خصوصی ہدایات کے ساتھ اُس نے "پگٹانے" کی طرف روانہ کر دیا۔

سیتارام شام ڈھلے تک تھانے میں موجود رہا۔

سرحدی علاقے کا تھانہ ہونے کے سبب یہاں مختلف ایجنسیوں کے لوگوں کی آمدورفت کی رہتی تھی اور سیتارام کو ہر دم یہی فکر لاحق رہی کہ کہیں اس "آپریشن" کی خبر اُس کی کسی پیشہ ورانہ مخالف ایجنسی کو نہ ہو جائے۔

اُس نے مکھے سانسی کی حویلی کی طرف جو ٹیم روانہ کی تھی اُس کی کمان اپنے انتہائی راز دار اور قابلِ اعتماد ساتھی حوالدار جگن ناتھ کو سونپی تھی اور تھانے میں بظاہر کہی سُنی جا رہی تھی کہ وہ کسی دوسرے گاؤں کی طرف کوئی چھاپہ مارنے گئے ہیں۔

اس خصوصی مہم پر روانگی کا اندراج اُس نے شام ڈھلنے کے بعد سرکاری رجسٹر پر کیا اور اپنے ڈرائیور کو جیپ نکال کر پگھٹانے کی طرف چلنے کا حکم دیا ———

گاؤں کے باہر ہی اُسے جگن ناتھ دکھائی دیا۔ جس نے دُور ہی سے ہاتھ ہلا کر اچھا کی رپورٹ کر دی تھی۔ سیتارام کے اشارے پر جیپ میں موجود چاروں سپاہی رائفلیں پکڑے باہر آ گئے اور وہ سب جگن ناتھ کے تعاقب میں مکھے سانسی کی حویلی کی طرف چل دیئے۔

شام ڈھل رہی تھی جب سادہ کپڑوں میں ملبوس حوالدار جگن ناتھ نے حویلی کے دروازے پر دستک دی۔

کون ہے"؟ ۔

کسی نے بارعب آواز میں دریافت کیا۔

دروازہ کھولو ———"

جگن ناتھ نے غصے سے کہا

"کون ہو تم ——— کس سے ملنا ہے"

دوسری نسوانی آواز سنائی دی۔

"ہم پولیس والے ہیں۔ دروازہ کھولو ——— ورنہ ہم دروازہ توڑ دیں گے"

اس مرتبہ سیتارام نے ذرا گرجدار آواز میں کہا تھا۔

اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ دوسری طرف ہر بنس کور بول رہی ہے۔ مکھے سانسی کی بیٹی جو کسی بھی طرح اپنے بھائیوں سے کم نہیں تھی۔

ہر بنس کور نے پولیس کا شک پڑتے ہی ترلوک کو اشارہ کر دیا تھا۔ جس نے بجلی کی سی پھرتی سے حنیف خاں کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور حویلی کی چھت کی طرف بھاگ گیا۔ اُن لوگوں کے لئے یہ کوئی نئی صورتحال نہیں تھی اسے علم تھا کہ ہر بنس کور کم از کم اس وقت

تک پولیس کو روکے رکھے گی جب تک وہ یہاں سے نکل نہ جائیں۔

حنیف خاں کے ہاتھ میں صرف ایک پستول تھا اور وہ ترلوک کی مدد سے اب دوسرے کی چھت پھلانگ چکا تھا مکان کی چھت پر موجود سانسیوں نے صورت حال کی سنگینی کا اندازہ کر لیا تھا اور وہ اپنے معمول کی مشق کے مطابق ایک دوسرے کا نام لے لے کر اُسے پکارتے ہوئے مکھے سانسی کے گھر کی طرف بھاگ رہے تھے ———

اگر تم نے دروازہ نہ کھولا تو میں گولی چلا دوں گا۔

سیتارام کا پارہ آسمان کو چھونے لگا۔ اُس نے اندازہ کر لیا کہ ہر بنس کور انہیں روک کر ملزموں کو بھاگنے کا موقعہ دے رہی ہے اور اس کے پاس اتنی پولیس فورس نہیں تھی کہ سارے گاؤں کو گھیرے میں لے سکتا۔ اُس نے تو اپنے تھانے ہی کے دس جوان تیار کیے تھے۔

"تم گولی چلاؤ یا توپ چلاؤ جب تک نمبردار نہیں آئے گا میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔ پہلے نمبردار کو تلاشی کا وارنٹ دکھاؤ اُس کے بعد ہی دروازہ کھلے گا ———

ہر بنس کور بھی اپنے بیروں کی بڑی پکّی تھی۔

"توڑ دو دروازہ ———"

اس نے غصے سے گھورتے ہوئے اپنے جوانوں کو حکم دیا۔ جنہوں نے لکڑی کے مضبوط دروازہ پر رائفلوں کے بٹ بیوقوفوں کی طرح مارنے شروع کر دیئے حالانکہ وہ بھی جانتے تھے کہ یہ دروازہ اس طرح ٹوٹنے والا نہیں ہے ———

ابھی انہیں طبع آزمائی کرتے بمشکل دو منٹ ہی گزرے تھے جب انہوں نے سانسیوں کو اپنی طرف آتے دیکھا "کیا بات ہے تھانیدار صاحب ——— کیا ہوا ——— یہ آپ کیا ظلم کر رہے ہیں"

نمبردار مکھیا نے سیتارام سے بظاہر بڑے ملتجی لہجے میں پوچھا۔

"دروازہ کھلواؤ اندر سمگلر موجود ہیں"

سیتارام نے مکھیا کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا

"لیکن یہ کیا طریقہ ہے دروازہ کھلوانے کا ——— آپ کو چاہیئے تھا ہمیں بلائے
اندر صرف عورتیں موجود ہیں۔"
مکھیا کے ساتھ آنے والے سانسی بولے۔
جواب میں سیتارام نے انہیں ڈانٹنا شروع کر دیا۔
"دیکھو تھانیدار صاحب قانون کو اس طرح ناجائز استعمال نہ کرو۔
مکھیا جانتا تھا کہ انہیں صرف وقت ٹالنا ہے۔
سیتارام اور سانسیوں کے درمیان بحث شروع ہو گئی۔ وہ جان بوجھ کر بال کی کھال اتار
رہے تھے۔ مزید دس منٹ اس تو تکار کی نذر ہو گئے۔ جب سانسیوں کو اطمینان ہو گیا کہ اب
"سب اچھا" ہے تو مکھیا نے خود ہربنس کور کا نام لے کر آواز دی۔
"کھولئے ——— دروازہ کھول دے۔ تھانیدار صاحب اپنی تسلی کر لیں۔ پتہ نہیں
لوگ غریبوں سے کیوں زیادتی کرتے ہیں۔ کوئی انہیں پوچھنے والا نہیں۔"
وہ بڑبڑانے لگا۔
ہربنس کور نے دروازہ کھولا تو میدان صاف ہو چکا تھا۔
سامنے دو پل کے برآمدے میں ایک چارپائی پر مکھے سانسی کی بیمار بیوہ پڑی تھی یا پھر
گھر کا ایک نوکر موجود تھا۔ پولیس والوں کے ساتھ پندرہ بیس سانسی بھی اندر آ گئے۔
"تم لوگ باہر نکلو۔"
حوالدار جگن ناتھ نے انہیں ڈانٹا۔
نہیں حوالدار صاحب ——— یہ کیسے ممکن ہے۔ آپ لوگوں کے پاس تو تلاشی کا وارنٹ
بھی موجود نہیں۔ اور آپ دھونس سے مکان کی تلاشی لے رہے ہیں ——— ہم تو قانون کی
کرنے کے لئے آپ کو اس زیادتی کی اجازت دے رہے ہیں۔ ورنہ آپ ایسا نہیں کر سکتے
آپ کا کیا اعتبار اپنی طرف سے یہاں کچھ رکھ کر مقدمہ بنا لیں۔ ہمارے سامنے تلاشی لیں۔"
مکھیا نے سیتارام کو چڑاتے ہوئے کہا
سیتارام کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس کی زبان کاٹ دیتا۔

ان لوگوں کے یہاں جمع ہونے سے ہی اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اب اس کے لئے
اندر کچھ نہیں بچا ———
یہ بڑے سکار بدمعاش تھے ———
اب سیتارام کو رہ رہ کر یہ پچھتاوا لگا رہا تھا کہ اس نے بی ایس ایف کی مدد کیوں نہ
حاصل کی۔ اس طرح کم از کم وہ حنیف خاں کو اپنے ہاتھ سے گولی مار کر کم از کم اپنے دل کی
بھڑاس تو نکال لیتا اب تو دونوں طرف سے وہ مارا گیا۔
ملزم بھی نکل گئے اور مال بھی نہ ملا۔ اپنا منہ اس نے الگ سے کالا کر دایا۔ کیونکہ اس
ناکام چھاپے کا ضرور نوٹس لیا جائے گا۔
اس کے جوانوں نے بڑی بددلی سے دو تین کمروں میں تانک جھانک کی۔
لیکن ———
یہاں ان کے لئے تھا ہی کیا جو انہیں ملتا۔
مایوس ہو کر گردن جھکائے وہ سیتارام کے ساتھ تھانے کی طرف واپس لوٹ رہے تھے۔
سیتارام نے واپس لوٹتے ہوئے دل ہی دل میں قسم کھائی تھی کہ وہ ان سانسیوں کی زندگی ضرور
جہنم بنا دے گا خواہ اس کی کچھ ہی قیمت ادا کرنی پڑے۔
آج ان لوگوں نے واقعی اس کے ساتھ بڑی زیادتی کی تھی۔
مکھیا سانسی تو نے اچھا نہیں کیا ——— میرے ساتھ دشمنی تجھے مہنگی پڑے گی۔
بالآخر وہ پھٹ پڑا۔
کمال ہے مہاراج ایک تو ہم آپ سے تعاون کریں۔ الٹے آپ ہمیں کو کوس رہے ہیں۔ اس
میں میرا کیا قصور ہے۔ اگر میں نہ ہوتا تو آپ مکان کے اندر نہیں گھس سکتے تھے ——— کمال ہے جی
ایک تو زیادتی کی ہے کہ بغیر وارنٹ کے گھر کی تلاشی لی الٹا دھمکیاں دے رہے ہو ——— کہنا تو
ہمیں چاہیئے لیکن یہ تو الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے والی بات ہو گئی ناں ———
مکھیا سانسی کہاں قابو آنے والا تھا۔
"یہ جو تم بہت ٹر ٹر کر رہے ہو ناں ——— کل ہی اس کا مزہ چکھا دوں گا۔"

اس مرتبہ حوالدار جگن ناتھ نے غیرت دکھائی۔

"دیکھو سیتارام جی ـــــ ہم بھی عزت دار لوگ ہیں ـــــ اس طرح اگر تمہارے ملازموں نے مجھے گالیاں اور دھمکیاں دینا بند نہ کیا تو میرے لوگوں کو بھی غصہ آ سکتا ہے ـــــ اور کوئی غلط صورتحال پیدا ہوئی تو اس کے ذمہ دار تم ہو گے ـــــ"

مکھیا کے منہ سے یہ نکلنے کی دیر تھی کہ باقی سب نے ہی بولنا شروع کر دیا۔

"چلو چلو ـــــ دیکھ لوں گا ان سب کو۔"

سیتارام نے گاؤں کے باہر ایک محفوظ مقام پر کھڑی اپنی جیپ میں بیٹھ کر اپنے جوانوں کو واپس جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا

ڈرائیور نے اُس کے اشارے پر جیپ بھگا دی تھی۔ بڑی دُور تک اسے اپنے تعاقب میں سانسیوں کے زور زور سے ہنسنے کی آوازیں آتی رہیں۔

اُس کا خون کھولتا رہا۔

لیکن ـــــ

اب وہ ٹھنڈے دماغ سے کچھ کرنے کا قائل ہو گیا تھا۔ اس غصے کے ہاتھوں اُسے متعدد مرتبہ شرمندگی اُٹھانی پڑی تھی۔ اب وہ کوئی نیا تماشا کھڑا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اُس نے اگلے ہی روز اپنا بدلہ چکا لیا جب نزدیکی گاؤں کے ایک "چور" سے اپنے "بیان" میں کہا کہ ہاں اُس نے چوری کی دو بھینسیں مکھیا سانسی اور اُس کے بیٹے کے ہاتھ فروخت کی تھیں۔

اس مرتبہ خصوصی پولیس فورس کی مدد سے وہ مکھیا اور اُس کے بیٹوں کو تھانے میں لے آیا تھا۔ ساری رات وہ اُن پر تشدد کے پہاڑ توڑتا رہا۔

لیکن ـــــ

بے سُود ـــــ

اس طرح وہ بھی جانتا تھا کہ کل والی بے عزتی کا بدلہ تو نہیں لے سکتا۔ بس ایک ذرا دل کو قرار سا آ گیا تھا۔ تیسرے روز سانسیوں نے باپ بیٹوں کو اُس کی حراست سے چھڑا لیا۔

یوں تو حنیف خاں کو ایک روز یہاں سے واپس جانا ہی تھا۔

لیکن ـــــ

اس طرح اچانک آ پڑنے والی بپتا سے متعلق کبھی مکھے سانسی کے لڑکوں نے بھی نہیں چاہا تھا۔ ترلوک اُسے اپنے ساتھ بھگاتا بھگاتا گاؤں کے اُس محفوظ ٹھکانے کی طرف آ نکلا تھا جہاں پہنچ کر وہ خود کو قدرے محفوظ سمجھتے تھے۔

"حنیفے شہر چل ـــــ میرے خیال سے اب یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ سیتارام واپس آ گیا ہے۔ وہ کوئی نہ کوئی تماشا لگائے رکھے گا"

ترلوک نے چلتے چلتے کہا

"نہیں یار ترلوکی ـــــ بس تیرا بڑا شکریہ۔ اب مجھے سرحد پار کر ہی لینی چاہیئے ـــــ"

حنیف خاں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا

"حنیفے کیا بات ہے یار ـــــ تو ایسے ......"

"کوئی بات نہیں ترلوک ـــــ اُدھر ماں بھی رہتی ہے ـــــ اب الیکشن کچھ دنوں بعد تو ہوں گے ہی ـــــ اگر فضل شاہ جیت گیا تو پولیس کی مدد سے ہمیں بہت تنگ کروائے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ والدہ کو کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچا دوں ـــــ کم از کم میں اپنے باپ کی روح کے سامنے شرمسار نہیں ہونا چاہتا۔"

اُس نے ترلوک کی بات کاٹتے ہوئے کہا

ترلوک نے اُسے سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ ابھی حالات سازگار نہیں ہیں۔

لیکن ـــــ

حنیف کی ضد کے سامنے اُسے ہتھیار پھینکنے پڑے۔

حنیف خاں نے البتہ اُس کی یہ بات ضرور مان لی تھی کہ وہ سرحد آج ہی عبور نہیں کرے گا کیونکہ سیتارام کے ناکام چھاپے کے بعد اُن لوگوں نے سرحد پر بڑے ناکے لگا دیئے ہوں گے۔

وہ ترلوک کے ساتھ اسی رات شہر میں اُن کے ایک ٹھکانے پر آ گیا یہاں تین دن اُس نے گمنامی سے گزار دیئے۔

چوتھے دن مکھے سانسی کی بیوہ، بیٹیاں اور بیٹے خود اُسے رُخصت کرنے آئے
حنیف خاں کے "ناں ناں" کہنے کے باوجود انہوں نے ایک خطیر رقم اُس کے پلے باندھ دی
تھی۔

"بیٹا تو یہ سمجھ کر رکھ لے کہ یہ تیرے باپ کے حساب کے پیسے نکلتے ہیں ___ ہم تجھے
رخصت تو کر رہے ہیں لیکن ہمارے دل نہیں مانتے ___ تجھے تیرے اللہ رسولؐ کی قسم ہے
جب کوئی مشکل پڑے تو اس طرف آتے ہوئے بالکل نہ ہچکچانا ___"

مکھے سانسی کی بیوہ نے بوجھل دل سے کہا

"ماسی ___ تو مطمئن ہو جا ___ وہاں کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ___"

حنیف خاں نے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔

چنی اُسے سرحد تک خود چھوڑنے آیا تھا ___

وہ تو دوسری طرف جانے پر بھی بضد تھا۔

لیکن ___

حنیف خاں نے ایک طرح اُسے زبردستی ہی واپس لوٹایا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا
کہ اب وہ ایک مفرور اشتہاری کی حیثیت سے اپنے گھر جا رہا ہے۔ اُسے تو خود اپنی حفاظت
کا بندوبست کرنا تھا۔ اگر خدانخواستہ چنی کو کچھ ہو جاتا تو وہ ساری زندگی اُس کے گھر والوں
منہ دکھانے کے لائق نہ رہتا۔

چنی آنسو بہاتے ہوئے واپس لوٹا تھا ___

سرحد کے آر پار آنا جانا حنیف خاں کے لئے کوئی نئی بات نہیں۔

لیکن ___

آج وہ اپنے ہی ملک کی سرحد میں داخل ہوتے ہوئے کچھ گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا۔
علم تھا کہ فضل شاہ سے زیادہ اس بات کو کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ حنیف خاں کا زندہ رہنا
کی موت ہے۔ وہ حنیف خاں کو مروانے کے لئے ہر ممکن کوشش کر ڈالے گا۔

اس کے ہاتھ کتنے لمبے تھے؟

قانون اور جرائم دونوں کی دنیا میں اُس کی ساکھ کیسی تھی؟

اس بات کا اندازہ حنیف خاں سے زیادہ بہتر کوئی نہیں لگا سکتا تھا۔

اس نے رات کے پہلے پہر ہی سرحد عبور کر لی تھی اور چوروں کی طرح دبے پاؤں
اپنے گھر کی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوا تھا۔

گھر کے اندرونی حصے میں اُس کی مخصوص دستک پر جس شخصیت نے دروازہ کھولا
اُسے دیکھ کر حنیف خاں ایک لمحے کے لئے تو ڈگمگا ہی گیا تھا۔

یہ صغراں تھی ___

اُس کی منگیتر ___

اُس کے باپ کی آخری خواہش یہ تھی کہ وہ اُس کی زندگی میں صغراں کو بیاہ کر لے آئے۔
شاید اُس کی ماں کو اکیلے دیکھ کر اُس کے ماموں نے اپنی بیٹی کو ابھی سے اپنی بہن کے گھر بھیج
دیا تھا۔

"تم ___"

بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا۔

"ہاں میں ___ میں تمہارے جانے کے دوسرے ہی روز آ گئی تھی۔ چاچا چھوڑ گیا تھا۔
بے جی نہیں ہے ناں ___"

صغراں نے اپنی دانست میں شاید اپنی صفائی پیش کی تھی۔

"ہم ___ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ اچھا جاؤ ماسی کو اطلاع کرو ___ اور ہاں کسی کو میرے
آنے کی خبر نہیں ہونی چاہیئے سمجھ گئی ناں۔"

حنیف خاں نے کہا

صغراں چلی گئی ___

تھوڑی دیر بعد اُس کی ماں اور نذر محمد آ گئے۔ کافی دیر تک اُس کی ماں حنیف
کو سینے سے لگائے آنسو بہاتی رہی۔

"بس کر جا ماں ___ تو کیوں روتی ہے۔ ابھی میں زندہ ہوں ___ مر نہیں گیا۔"

حنیف خاں نے اُسی تسلّی دی۔

حنیفے ـــــ میرے بچے۔ اب حالات پہلے والے نہیں رہے۔ نتھو کی زندگی میں اور بات تھی۔ اس علاقے کی ساری پولیس بدل گئی ہے ـــــ فضل شاہ نے سردار... کر تمہارا مقدمے وار بنا دیا ہے ـــــ پولیس کسی بھی وقت یہاں آسکتی ہے ـــــ خدا بھلا کرے برادری والوں کا جو ہمارے ساتھ کھڑے ہیں لیکن میں کوشش کر رہا ہوں کہ جتنی جلدی ممکن ہے یہاں سے ہم نکل ہی جائیں ـــــ"

نذر محمد نے کہا۔

میں نذر محمد ـــــ میں نے تمہیں پہلے بھی کہا تھا جس زمین پر میرے خاوند نے جان دی ہے میں اُسے چھوڑ کر جیتے جی نہیں جا سکتی ـــــ میری قبر نتھو کے ساتھ ہی بنے گی ـــــ"

نتھو کی بیوی نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔

حنیف خاں نے اپنی ماں کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی ماں کبھی اپنے خاوند کی قبر چھوڑ کر نہیں جائے گی۔

"بیٹا ـــــ مجھے تجھ پر مان ہے۔ تو نے اپنے باپ کا بدلہ لے کر میرا کلیجہ ٹھنڈا کر دیا۔ بس اب میری آخری خواہش پوری کر دے۔ اپنی اس امانت کو بھی لے جا اور کسی دوسرے شہر میں گھر بسا لے ـــــ پولیس کو گرفتاری نہ دینا بیٹا ـــــ فضل شاہ تمہیں زندہ باہر نہیں آنے دے گا۔ سردار رشید اپنے بھائی کو پرچے سے نکلوانے کے لئے اس سے صلح کر لے گا اور دونوں مل کر تمہیں ......"

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

"میں جانتا ہوں ماں ـــــ تو فکر نہ کر۔ برادری والے ابھی اتنے بے غیرت نہیں ہوگئے کہ تجھے تنہا چھوڑ دیں گے۔

مجھے ابھی فضل شاہ کا کھاتہ بھی مکمل کرنا ہے ـــــ پھر لے جاؤں گا صغراں کو بھی

حنیف خاں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

تینوں صبح تک باتیں کرتے رہے ـــــ!!

انہوں نے گاؤں میں کسی کو کانوں کان اُس کی آمد کی خبر نہیں ہونے دی تھی۔ رروز دہ دیر گئے تک سوتا رہا اور شام کے بعد دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے اپنے گاؤں سے باہر آگیا۔ اُس نے فی الوقت اپنے لئے ایک محفوظ پناہ گاہ سوچ لی تھی۔

اُس نے پکتانے میں دوران قیام داڑھی رکھ کر اپنی شکل خاصی تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی اور اب بھی عام دیہاتیوں کے سے انداز میں اپنے علاقے سے باہر آرہا تھا۔

شہر کی طرف جاتے ہوئے اچانک ہی اُسے زہراں بائی کا خیال آگیا ـــــ

زہراں نے اس کے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں اور ابھی تک حنیف خاں کے دماغ پر اس کے عشق کا بھوت بھی بُری طرح سوار تھا۔

اس نے عنایت بائی اور اس کی بیٹی پر لاکھوں روپے لٹائے تھے ـــــ اُسے اُمید تھی کہ اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی وہ خوشی سے پاگل ہو جائے گی۔ کم از کم یہاں رہ کر وہ اگلے دو تین روز میں فضل شاہ کے حالات اور اپنے بعد پیش آنے والے واقعات سے تو آگاہ ہو سکتا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ عنایت بائی کا فضل شاہ سے مستقل رابطہ رہتا تھا۔ اِس طرح وہ زہراں کو ہاتھ میں لے کر فضل شاہ سے اپنا بدلہ بھی چکا سکتا ہے۔

یہی کچھ سوچتے ہوئے اُس نے رنڈی بازار کا رُخ کیا تھا۔

اُس کے پاس ایک خطیر رقم موجود تھی جس سے وہ اگلے دو تین ماہ بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے بسر کر سکتا تھا اس درمیان اُسے اُمید تھی کہ کسی دوسرے شہر میں وہ کوئی ٹھکانہ بنانے میں کامیاب ہو جائے گا ـــــ رات اس نے شہر کے ایک معمولی سے ہوٹل میں ایک مزار کے نزدیک گزاری۔ صبح اس نے ناشتے کے بعد ہوٹل چھوڑ دیا۔ دربار پر سلام کرنے کے بعد اُس نے پہلا ہی رنڈی بازار کی طرف جانے کا پروگرام بنایا تھا۔

رات ہی اُس نے شہر سے نیا شلوار قمیض لے کر پہن رکھا تھا اور اپنی رقم قمیض کے نیچے کپڑے کی واسکٹ میں چھپا رکھی تھی۔ اپنا حلیہ اُس نے خاصا تبدیل کر لیا تھا اور اُس

کا کوئی بہت نزدیکی شخص ہی اُسے پہچان سکتا تھا ——

اُس نے جان بوجھ کر عنایت بائی کے کوٹھے پر دن کے اوقات میں جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شام کے بعد بازار کی رونق بڑھ جاتی تھی اور کوٹھوں پر تماش بینوں کی آمد و رفت میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

زہراں بائی کا کوٹھا اس کے لئے کوئی نیا نہیں تھا۔

یہ سیڑھیاں وہ درجنوں مرتبہ چڑھا اور اُتر چکا تھا۔

اُس نے رکشہ بازار کے باہر ہی چھوڑ دیا اور اب پیدل ہی سر جھکائے کوٹھے کی طرف آنے لگا۔ بغیر دستک دیئے وہ چپ چاپ کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔

پہلے ہی کمرے میں زہراں صوفے پر کروٹ کے بل لیٹی۔ کچھ گنگنا رہی تھی۔ آہٹ ہوئی پر اُس نے مڑ کر دیکھا تو ایک لمحے کیلئے وہ دنگ ہی رہ گئی۔ اُسے ہرگز اُمید نہیں تھی کہ حنیف اس طرح کبھی چپ چاپ آ سکتا ہے۔ وہ اب ایک مفرور اشتہاری تھا۔ ریاست شاہ کا قاتل ——"

لیکن ——

دوسرے ہی لمحے اُس نے خود کو سنبھال لیا۔

تربیت یافتہ طوائف زادیوں کی طرح اُس نے اس طرح بانہیں پھیلا کر حنیف خاں کا استقبال کیا جیسے اس کے لئے باؤلی ہوئی جا رہی ہو۔

حنیف خاں نے دل ہی دل میں خود کو شاباش دی اور فوراً ہی قمیص کی ایک جیب میں رکھے ہزار ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر اُسے تھما دیئے۔

"اس کی کیا ضرورت تھی۔ ایک تو اتنے دنوں بعد آئے ہو اور ——"

زہراں بائی نے پیشہ ور طوائفوں کی طرح ہاتھ بڑھا کر نوٹوں پر جھپٹتے ہوئے کہا۔

"کچھ لا نہیں سکا۔ کوئی تحفہ تو تمہارے لئے لانا ہی چاہیئے تھا —— میری طرف سے تحفہ ہی سمجھ کر رکھ لو ——"

حنیف خاں نے بے شرمی سے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"تم خود جو آ گئے۔ اس سے بڑا تحفہ میرے لئے کیا ہو گا" ——

اس نے حنیف خاں سے لپٹتے ہوئے کہا۔

زہراں کو اپنی ماں کا انتظار تھا۔ فضل شاہ نے اُن سے وعدہ کیا تھا کہ اگر انہوں نے حنیف خاں کی گرفتاری میں مدد دی تو اُن کا منہ موتیوں سے بھر دے گا اور اگر اُسے شک بھی ہو گیا کہ انہوں نے حنیف خاں کو اپنے پاس پناہ دی تھی تو انہیں برباد کر کے رکھ دے گا۔

دونوں ماں بیٹی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ فضل شاہ جو کہتا ہے وہ کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہے۔ یوں بھی حنیف خاں نے اُس کے بھائی ریاست شاہ کو قتل کیا تھا جو کوئی معمولی بات نہیں تھا۔

عنایت بائی تھوڑی دیر بعد ہی آ گئی۔

حنیف خاں کو وہاں دیکھ کر پہلے تو وہ چونکی پھر فوراً ہی اُس نے بھی اپنے چہرے کے تاثرات نارمل کر لیے —— اُسے علم تھا کہ حنیف خاں بہرحال ایک اشتہاری ہے۔ ان حالات میں حکمت سے ہی اُس پر قابو پایا جا سکتا تھا۔

عنایت بائی نے بھی پیشہ ور نائکہ کی طرح اُس کی بلائیں لینی شروع کر دیں۔

اُس نے نوکر سے وہیں حنیف خاں کی خاطر تواضع کے لئے کچھ منگوا لیا تھا اور اب دونوں کو اکیلا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں آ گئی تھی۔ آنے سے پہلے اُس نے اپنی بیٹی کو آنکھ کے مخصوص اشارے سے اُس کے فرائض سے آگاہ کر دیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی نوکر کھانے پینے کے لیے کچھ لے آیا۔

عنایت بائی کے ہاتھ پاؤں کپکپا رہے تھے۔ اُس کی دھڑکنیں بے قابو ہو رہی تھیں۔ اُسے کسی بھی طرح پولیس کو حنیف خاں کی آمد سے مطلع کرنا تھا۔ بصورت دیگر عین ممکن تھا کہ اگر فضل شاہ کو اس بات کا شک ہی گزر جاتا کہ وہ یہاں سے ہو کر گیا ہے تو اُن کی زندگی جہنم بن جاتی۔ یوں بھی ایک مفرور اشتہاری کا اُس کے کوٹھے پر کیا کام؟

قریباً دس منٹ بعد اُس نے نوکر کو دوسرے کمرے میں لے جا کر صورتحال سے آگاہ کرنا چاہا اور اُسے حنیف خاں کا تعارف کروا دیا۔

"یا مولا خیر ـــــ بی بی یہ کیا غضب ہو گیا ـــ"

نوکر کے تو پاؤں ہی پھول گئے تھے۔

"ہوش کر ـــــ خبردار اگر ایک لفظ بھی منہ سے نکالا۔ اُسے بھنک بھی پڑ گئی تو ہماری جان کو آ جائے گا۔ موئے دفع ہو جا اور انسپکٹر اللہ دتہ کے پاس جا کر میری طرف سے ایسے ہی بتانا جیسے میں نے تمہیں سمجھایا ہے ـــ"

اُس نے سرگوشی میں نوکر سے کہا جو لرزتے قدموں سے سڑھیوں کی طرف چل دیا۔

عین اُن لمحات میں کسی ضرورت کے تحت ہی حنیف خاں کمرے سے باہر نکل کر باتھ روم کی طرف آ رہا تھا۔ جب اُس نے نوکر کو عنایت بائی کے کمرے سے نکلتے دیکھا۔

"کیا حال ہے بابا شریف ـــ"

اُس نے نوکر کو پہچان کر یونہی پوچھ لیا۔

جواب میں اُس کی طرف سے جس ردِ عمل کا اظہار ہوا اُس نے حنیف خاں کی چھٹی حس کو بیدار کر دیا۔ اُس نے اندازہ لگا لیا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔

اس نوکر سے وہ پہلی مرتبہ نہیں ملا تھا۔

لیکن ـــــ

اُس نے گھبراہٹ میں نہ صرف اُسے پہچاننے سے انکار کیا تھا بلکہ بڑی گھبراہٹ میں تیزی سے سیڑھیاں اُتر گیا تھا۔

حنیف خاں بھی نتھو خاں کا بیٹا تھا ـــــ کوئی شہری بابو نہیں تھا نہ ہی یہاں تک جیبیں کاٹتا آ گیا تھا اُس نے شعور کی آنکھ کھولی تو بین الاقوامی سرحد کے آر پار جانا شروع کر دیا تھا۔ وہ ملکوں کی سیکورٹی کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اُس نے اپنے باپ کے ساتھ ساری زندگی چوری کی۔ وہ لوگ تو فضا میں خطرے کی بُو سونگھ لیا کرتے تھے۔

اچانک ہی اُس کی چھٹی حس بیدار ہو گئی۔

جان کے لالے پڑے تو زہراں بائی کے عشق کا بھوت ایک لمحے میں اُس کے سر سے اُتر گیا۔ اُسے اپنے باپ کی بات یاد آ گئی جس نے کہا تھا کہ مرد کو ہمیشہ عورت کا یار لٹا دیتا ہے ساری زندگی قانون چور کو نہیں پکڑ سکتا۔

لیکن ـــــ

عورت اور مرد کی چوری فوراً پکڑی جاتی ہے۔

"کیا بات ہے بی بی ـــــ شریف کچھ گھبرایا ہوا ہے"؟

اُس نے عنایت بائی کے کمرے میں داخل ہو کر اس انداز سے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے یہ سوال کیا کہ عنایت بائی کے ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔

چور کی ڈاڑھی میں تنکا کے مصداق اُسے بھی شک گزرا کہ حنیف خاں نے شاید اُس کی سازش کو بھانپ لیا ہے۔

کچھ نہیں کچھ نہیں۔ تم کیوں فکر کرتے ہو۔ افیم کی زیادہ مقدار چڑھائی ہو گی ـــ آج کل کچھ زیادہ ہی نشہ کرنے لگا ہے۔

عنایت بائی نے جسکے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں نے کھسیانی بلی کھمبا نوچے کی طرح اپنی صفائی پیش کر کے بظاہر حنیف سے زیادہ خود کو مطمئن کرنا چاہا تھا۔

"میں فکر نہیں کیا کرتا عنایت بائی ـــــ اگر فکر مند ہوتا تو یہاں کیوں آتا لیکن ایک بات یاد رکھنا میرے ساتھ دغا کرنے والا کبھی بچ کر نہیں جا سکتا۔ میں نے تمہاری بیٹی پر لاکھوں روپے اس لئے نہیں لٹائے تھے کہ تم وقت آنے پر مجھے پولیس کے حوالے کر دو ـــ"

اُس نے غصے سے کھولتے ہوئے اپنی شلوار میں چھپا پستول ہاتھ میں پکڑ کر لہراتے ہوئے کہا۔

"سچ سچ بتاؤ۔ اپنے خصم کو کہاں بھیجا ہے"؟

"م م میں .... میں مجبور ہوں حنیفے ـــــ فضل شاہ سے ...."

اُس نے لڑکھڑاتی آواز میں سنایا۔

لیکن ـــــ

مکمل بات نہ کر پائی۔

حنیف خاں کا پارہ آسمان کو چھونے لگا تھا اُسے علم تھا کہ یہاں سے تھانہ بمشکل اسّی گز کی مسافت پر ہے اور یہ کوئی جنگلی علاقہ نہیں۔ نہ ہی رات کا اندھیرا یہاں پھیلا ہوا

ہے ——

اُس نے اپنی دانست میں عنایت بائی کے نزدیک سے گزر کر آگے نکلنا چاہا تھا تا کہ سیڑھیوں کے راستے باہر بھاگ سکے جبکہ عنایت بائی نے یہ سمجھا کہ وہ اس پر حملہ کرنے والا ہے اُس کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکلی۔

لیکن ——

مکمل نہیں ——

حنیف خاں نے بجلی کی سی پھرتی سے اُس کے منہ پر ہاتھ جمایا اور دوسرے ہاتھ میں پکڑے پستول کا دستہ اُس کے سر میں مارا۔

عنایت بائی کٹے ہوئے درخت کی طرح ڈھیر ہو گئی۔

زہراں بائی دوسرے کمرے میں سے اچانک ہی باہر نکلی تھی۔ اُس کے کانوں تک اپنی ماں کی چیخ کی آواز پہنچ گئی تھی۔ یہاں پہنچ کر اُس نے جو منظر دیکھا وہ اُس کیلئے قابلِ برداشت نہیں تھا۔ اُس نے بھی واپس بھاگنا چاہا۔

لیکن ——

بمشکل دو قدم ہی بھاگ پائی جب حنیف خاں نے اُسے بھی آ لیا۔

اپنی ماں کے برعکس وہ حنیف خاں کا ایک تھپڑ ہی منہ پر لگا کر چکرا گئی اور کمرے کے اندر جا گری دوبارہ اُسے اُٹھنا نصیب نہ ہوا۔

حنیف خاں یہاں سے خالی ہاتھ جانا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کا دماغ غصے سے گھوم رہا تھا۔ اُس کے باپ کی باتیں سند نہیں۔ طوائف آخر طوائف ہوتی ہے۔ حنیف خاں کو سب سے زیادہ غصہ خود پر آ رہا تھا کہ اُس نے اپنے دل و دماغ پر اس رنڈی کے عشق کا بھوت کیا سوار کر لیا ——"

اُس نے زمین پر گری زہراں کے گریبان سے جھٹکا دے کر بٹوہ نکالا اور اپنی جیب میں ٹھونس لیا۔ عنایت بائی کا پرس اُس کے سنگھار میز پر پڑا تھا حنیف خاں نے اُلٹ دیا اور اس میں موجود ساری کرنسی اور سونے کی انگوٹھیاں اور دو چوڑیاں اپنی جیب میں ڈالیں اور چپ چاپ سیڑھیاں اُتر گیا۔

اُس کے چہرے پر ایک نظر ڈالنے سے کسی کو شک نہیں گزر سکتا تھا کہ وہ ادھر کیا کارنامہ انجام دے آیا ہے۔

لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ کچھ فاصلے پر کھڑی ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ اور اُسے سٹیشن کی طرف چلنے کو کہا ——"

عین اُن لمحات میں جب سب انسپکٹر اللہ دتّا بابا شریف کی اطلاع پر اپنے جوانوں کو زور زور سے ڈانٹتا فوراً تیار ہونے کا حکم دے رہا تھا۔ اس کا شکار بڑے اطمینان سے بس کی پچھلی نشست پر ٹیک لگائے نئی منزلوں کی طرف محوِ پرواز تھا۔

اُس نے سٹیشن کے نزدیک ٹیکسی چھوڑ دی۔

یہاں سے ایک رکشہ کے ذریعے وہ لاری اڈے پر پہنچا۔ پھر لاری اڈے سے ایک ٹیکسی کے ذریعے اپنے ہوٹل تک اور وہاں سے ایک اور ٹیکسی کے ذریعے دوسرے ہوٹل تک وہاں سے اُسے کوچ میں بیٹھ کر دوسرے شہر اپنے ایک دُور کے عزیز رشتہ دار کے پاس جانا تھا۔

ان حالات میں سردار رشید کی طرف سے صلح کا پیغام فضل شاہ کے لئے نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھا اُس نے دل ہی دل میں خود کو متعدد مرتبہ شاباش دے لی تھی۔ اس پیغام کا مطلب یہ تھا کہ سرداروں نے شکست تسلیم کر لی ہے کیونکہ فضل شاہ نے اپنی چکر بازیوں سے اس معاملے کو بڑا سیاسی ایشو بنا دیا تھا۔ اس نے اپنے بھائی کی موت پر اسمبلی کی طرف سے باقاعدہ قراردادِ مذمت پاس کروائی تھی اور اخبارات کی طرف سے پولیس پر لعن طعن کا سلسلہ ہنوز جاری تھا۔ سردار رشید بڑا کائیاں آدمی تھا۔

سرکار دربار میں اُس کا جانا آنا بھی فضل شاہ کی طرح لگا رہتا تھا اور اُس کے "مہربانوں" نے اُسے فی الوقت جھک جانے کا مشورہ دیا تھا کیونکہ یہی ایک طریقہ تھا جس سے اُس کے بھائی کی جان بچ سکتی تھی۔

ایک مرتبہ پھر فضل شاہ اور سردار رشید مذاکرات کی میز پر ایک مشترکہ دوست کے ہاں بیٹھے تھے۔

"فضل شاہ تم جانتے ہو کہ میرا بھائی اس حملے میں شامل نہیں تھا۔"

سردار رشید نے اچانک ہی پوچھ لیا۔

"ہاں مجھے علم ہے ——"

فضل شاہ نے مسکراتے ہوئے دو ٹوک بات کہی۔

"پھر بھی تم نے —— حالانکہ میرے اور ریاست شاہ کے درمیان معاہدہ تمہاری موجودگی
میں ہو چکا تھا ——"

سردار رشید نے کہا۔

"سردار صاحب —— مرنے والے کی زندگی کے ساتھ ہی معاہدے ختم ہو گئے۔
آپ سے ایک اور معاہدہ کرنا چاہتا ہوں آپ بھی اس بات کو بھی سمجھتے ہیں اور میں بھی کہ
غنیمت میں جتنے کم حصے دار ہوں گے اتنا ہی ہم دونوں کو فائدہ ہو گا —— ریاست شاہ
مر گیا ہے —— اب شاہ پور کا حاکم میں ہوں فضل شاہ —— اور میں اپنا کوئی جانشین
ابھی پیدا نہیں کروں گا —— تمہارے میدان میں آنے کا مجھے کوئی قلق نہیں تھا ——
غصہ تھا تو اس بات کا کہ ایک کمی کمین کو تم لیڈر بنانے جا رہے تھے۔ ارے اس عالم داد
حوالدار کی اوقات ہی کیا ہے —— تم اُسے یونین کونسل کا —— خیر چھوڑو اس
کو —— سردار رشید میرے پاس ان حالات میں محض تمہارے ساتھ مستقبل کی دوستی قائم رکھنے
کے لئے ایک آفر ابھی بھی موجود ہے —— یہ سیٹ تو تم میرے لئے چھوڑ دو ——
ایم این اے کی سیٹ تمہاری ہو گی —— اور ہاں رہا معاملہ یونین کونسل کا تو میں تجویز
دے سکتا ہوں کہ اپنے "مشترکہ دوست" کو اس کا چیئرمین بنا دیں گے ——"

اُس نے "مشترکہ دوست" غنی خاں کی طرف اشارہ کیا ——

"لیکن عالم داد ...."

"پہلے میری بات مکمل ہو لینے دو سردار صاحب ——"

فضل شاہ نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"عالم داد پر لعنت بھیجو —— ایسے کئی کرائے کے ٹٹو تمہیں مل جائیں گے۔ میری

بات غور سے سُن لو —— غنی خاں جتنا تمہارا دوست ہے اتنا ہی ہمارا ہے —— کونسل
کے تمام ٹھیکے یہ ایمانداری سے تمہارے اور میرے درمیان تقسیم کر دے گا اور اس کا حصہ
ہم دونوں ایمانداری سے ادا کرتے رہیں گے —— رہا معاملہ عالم داد کا —— اس نے بہت
کچھ کما لیا ہے —— پولیس کا دو ٹکے کا حوالدار اگر ہمارے جیسے خاندانی لوگوں کی برابری
کرنے بیٹھ گیا ہم تو پھر جھک ہی ماریں گے ناں —— اُسے کھانے دو جیل کی ہوا —— یہ بات
اپنے ذہن میں بٹھا لو سردار صاحب کہ سردار مرید یا عالم داد میں سے تمہیں ایک کا انتخاب کرنا
ہے —— بہر حال اُن میں سے کسی ایک کو جیل میں رہنا ہو گا —— مجھے کوئی اعتراض نہیں
اگر تم اپنے نوکر کے لئے اپنے بھائی کی قربانی دے سکو ——"

فضل شاہ نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ہاں سردار صاحب۔ آپ حالات کی نزاکت کو سمجھیں۔ معاملہ بہت گرم ہے۔ دونوں
کو جیل سے نکالنے کا مطلب ہے فضل شاہ صاحب کی سیاسی موت —— بہر حال ان کی بھی
کوئی عزت تو ہے —— کسی ایک کو تو جیل میں رکھنا ہو گا۔ حنیف خاں تو مفرور ہے ——
لعنت بھیجو تم عالم داد پر —— ان چھوٹے چھوٹے لوگوں کو زیادہ منہ لگانے سے بدمزگی
بھی ہو جایا کرتی ہے سردار صاحب ——"

غنی خاں نے فضل شاہ کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"لیکن حنیف خاں —— وہ تو ...."

سردار رشید نے کچھ کہنا چاہا۔

"اُس کی بات ابھی چھوڑ دو —— میں اُس کے گرد گھیرا تنگ کر رہا ہوں —— سردار صاحب
اُسے زندہ پولیس تک نہیں پہنچنا چاہیئے —— اس میں ہم دونوں کی بقا ہے —— ہم
دونوں کو مل کر اُس کا خاتمہ کرنا ہے۔ اگر ہم اس علاقے میں اپنی سیاست چمکانا چاہتے ہیں
تو اُس کی موت ہمارے لئے ناگزیر ہے ——"

فضل شاہ نے اُس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا۔

سردار رشید سوچ میں پڑ گیا ——

اُس کے پاس فی الوقت اس آفر کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا ____

فضل شاہ کا کیس بڑا مضبوط تھا۔

سرکار دربار میں اُس کی رسائی بھی سردار رشید سے کچھ کم نہیں تھی۔

سیاسی دباؤ الگ تھا ____

اور ____

سب سے بڑھ کر حنیف خاں کا خطرہ ____ وہ بھرا ہوا زخم خوردہ چیتا سب کو چیر پھاڑ کر رکھ سکتا تھا۔

"ڈن" ____

اس کے منہ سے ایک ہی لفظ نکلا۔

غنی خاں نے فوراً فریج سے شیمپئن کی بوتل نکال کر کھولی اور تینوں شیطانوں کے درمیان خفیہ معاہدہ طے پا گیا۔

اگلے ہفتے جب نئے انتخابات کے لئے کاغذات نامزدگی داخل کروانے کی باری آئی تو اس حلقے سے فضل شاہ کے مقابلے میں کسی نے کاغذات داخل نہ کروائے ____

سردار مرید چند روز بعد ضمانت پر باہر آگیا۔ مقدمے کا سارا بوجھ عالم داد پر ڈال دیا گیا تھا ____

اک نئے موڑ پر!

شیر خان سے اُس کی ملاقات باپ کی زندگی کے آخری ایام میں ہوئی تھی جب وہ اُن کے پاس ایک بیوپاری کی حیثیت میں آیا کرتا تھا۔ پھر اچانک وہ غائب ہو گیا تھا شیر خان علاقہ غیر کا رہنے والا تھا۔ اُس نے نذیرے موچی سے بھی شیر خان کا بھرپور تعارف کروایا تھا شیر خان کے متعلق جیفے کو اس بات کا علم تو تھا کہ وہ آئے گئے کو سنبھالتا ہے۔

لیکن ____

ابھی تک اُس سے کوئی کام لینے کی نوبت نہیں آئی تھی۔

اِس نے اندازہ کر لیا تھا کہ فضل شاہ اُس کے جرائم کی فہرست طویل کرواتا جا رہا ہے اور جب پولیس اُن طوائفوں تک پہنچے گی تو اُس کے خلاف ڈکیتی اور ارادہ قتل کے تین چار اور مقدمے درج ہو جائیں گے۔

اُسے موت یا گرفتاری سے کبھی کوئی خوف لاحق نہیں رہا تھا۔

لیکن ____

وہ اس طرح فضل شاہ کو زندہ چھوڑ کر مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اُس کی خواہش تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو فضل شاہ والا بوجھ بھی اپنے ذہن سے اُتار دے۔ اس کے بعد ہی وہ اپنے باپ کی قبر پر جا سکتا تھا۔

شیر خان کے ڈیرے تک اُسے دوسرے دن رسائی میسر آگئی۔ علاقہ غیر میں وہ اس سے پہلے بھی دو مرتبہ آچکا تھا لیکن تب وہ یہاں مفرور کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک بزنس مین کی حیثیت سے آیا تھا۔

شیر خان نے اُس کا استقبال اِس طرح کیا تھا جیسے تھوخاں شیر خان کا استقبال کیا کرتا تھا ــــ

"حنیفے ــــ خدا کا شکر ہے تم آ گئے ــــ میں پرسوں ہی تمہارے علاقے سے واپس لوٹا ہوں ۔ میں نے تمہارے دوست کو بھی تمہاری خبر کے لئے بھیجا تھا ۔ اُسے بھی تمہارا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔"

شیر خان نے اُسے اپنی تشویش سے آگاہ کیا۔

"کون سا دوست"؟

حنیف نے حیرانگی سے پوچھا۔

"وہ نذیر ــــ نذیرا ــــ اور کون"؟

شیر خان نے کہا ــــ

"وہ یہاں ہے"؟

حنیف نے حیرانگی سے پوچھا۔

شیر خان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا اور نذیر موچی کی شکل حنیف خاں کو دکھائی دی ۔

"حنیف خاں ــــ"

کا نعرہ لگاتا ہوا نذیرا اُس سے یوں لپٹا جیسے ایک مدت سے اُسی کے انتظار میں سوکھ رہا ہو۔ اُس نے کمال اداکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے تھوخاں کی موت پر ٹسوے بہانے شروع کیے اور خود پر ہونے والے ظلم کی ایک شاندار کہانی گھڑ کر حنیف خاں کو سنا دی۔ اُس نے ثابت کیا کہ حنیف خاں کے ساتھ وفاداری اور محبت کے جرم کی اُسے فضل شاہ نے یہ سزا دی ہے کہ اُسے جان بچانے کے لئے بھاگنا پڑا اور اب فضل شاہ نے جھوٹے الزامات کے تحت اُس پر اتنے مقدمات درج کروا دیئے ہیں کہ اگر وہ واپس گیا تو ساری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہی کٹ جائے گی۔

نذیر موچی گاؤں کے حالات سے مکمل باخبر رہا تھا۔

وہ یہاں پناہ لینے آیا تھا کوئی مستقل قیام کرنے نہیں ۔ اُسے علم تھا کہ تھوخاں کو فضل شاہ نے کسی طرح قتل کروایا ہوگا ۔ اُس نے ساری زندگی فضل شاہ کے ساتھ گزاری تھی اور اُس کی رگ رگ سے واقف تھا۔ اِس وقت حنیف خاں کی ہر ممکن ہمدردی حاصل کرنا تھا۔ یہی ایک طریقہ تھا جو اُس کی آنے والی زندگی میں آسانیاں پیدا کرتا۔

حنیف خاں نے اُس کی توقعات کے عین مطابق نذیر موچی کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور دو تین روز ہی میں دونوں ایک مرتبہ پھر پرانے دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے منسلک ہو گئے۔

نذیرے کو اپنی اگلی زندگی کے لئے حنیف خاں کا مضبوط سہارا درکار تھا۔

یہ بات وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ رزق حلال اُس کی قسمت میں نہیں لکھا ــــ وہ پہلے بھی حرام کھاتا آیا ہے ۔ اور اب بھی حرام ہی کھائے گا ۔ اپنی محنت سے کما کر کھانا اُس نے کبھی سیکھا ہی نہیں تھا۔ اگر اُسے حنیف خاں جیسے بہادر شخص کا سہارا مل جاتا تو اپنی صلاحیتیں بروئے کار لا کر وہ اُس کے ذریعے اتنی دولت حاصل کر سکتا تھا جس سے آئندہ ساری زندگی گزار سکے ــــ

لیکن ــــ

حنیف خاں کے دماغ پر تو ایک ہی بھوت سوار تھا ۔

وہ کسی بھی طرح فضل شاہ کو قتل کرنا چاہتا تھا ۔

"حنیفے ! میں تم سے زیادہ اس کا ڈسا ہوا ہوں ۔ میں نے ساری زندگی اس حرامی کی خدمت میں گزار دی اور اُس کا صلہ مجھے اُس نے کیا دیا ؟ تم اندازہ نہیں کر سکتے حنیف خاں کہ میں نے فضل شاہ کے لئے کیا کیا نہیں کیا ــــ میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ جس قدر جلد ممکن ہے اُس سے انتقام لوں ــــ لیکن ابھی ہمیں صبر کرنا ہوگا ــــ

ابھی اُس کا وقت نہیں آیا ۔ تمہیں گاؤں کے حالات کا علم نہیں ہے ــــ میں پرسوں ہی واپس لوٹا ہوں ــــ فضل شاہ بڑا مکار آدمی ہے حنیف خاں ــــ سردار احمد ضمانت پر رہا ہو چکا ہے جس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ سرداروں اور فضل شاہ

کے درمیان صُلح ہو چکی ہے۔ اس سے بڑا اس بات کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ فضل شاہ
اکیلا ہی ایم پی اے کا اُمیدوار ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سردار رشید نے اپنے بھائی کی
رہائی کے عوض یہ کڑوا گھونٹ پی لیا ہے ـــ لیکن میں فضل شاہ کی رگ رگ کو سمجھتا ہوں۔
میں جانتا ہوں کہ اُس نے سرداروں کے لئے بھی کچھ نہ کچھ ضرور چھوڑا ہو گا ـــ وہ ان
حالات میں سرداروں کی دشمنی مول نہیں لے سکتا ـــ دونوں بدمعاشوں نے اس بات
سے اتفاق کیا ہو گا کہ تمہیں مل کر ختم کر دیں۔ حنیف خاں ابھی تم اُن کے سائے سے بھی
دُور رہو ـــ اور میری ایک اور بات دھیان سے سن لینا۔ فضل شاہ اب ایسی حرکت
کرے گا کہ تم اگر چھپے ہوئے ہو تو تمہیں طیش دلا کر سامنے لائے اور گھیر کر مار ڈالے لیکن
میرے جیتے جی تم اُس کی سازش کے شکار نہیں ہو سکتے ـــ بہت ہوشیار رہنا۔ میرے خیال
سے تو ہمارا یہاں زیادہ دیر تک رہنا بھی خطرے سے خالی نہیں کیونکہ میں نے یہاں ایک
دو ایسے چہرے بھی دیکھے ہیں جو لوگ کبھی ریاست شاہ کے پاس پناہ لینے آیا کرتے تھے
ایک روز نذیرے نے اُسے سمجھانے کے انداز میں حقائق کا تلخ احساس دلاتے
ہوئے کہا۔

"لیکن، ہم جائیں گے کہاں"؟

حنیف خاں نے پوچھا۔

"یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دو ـــ میرے پاس کئی ٹھکانے ہیں"

نذیرے نے اتنے پُر اعتماد لہجے میں کہا کہ حنیف خاں کو واقعی اُس کی بات پر یقین
کرنا پڑا۔

شیر خان کے پاس چند روز قیام کرنے کے بعد ایک روز دونوں وہاں سے آگئے
شیر خان نے گو کہ ابھی تک انہیں یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ اُس کے لئے کوئی
بوجھ ہیں ـــ

لیکن ـــ

یہ بات حنیف خاں بھی جانتا تھا کہ شیر خان کا بزنس بھی اُن کے علاقے میں ہے اور

ن کا رابطہ بھی فضل شاہ سے ہو سکتا ہے۔

اُسے فضل شاہ سے ہر صورت بچ کر رہنا تھا۔

نذیرا اُسے ملک کے ایک بڑے شہر میں لے آیا تھا جہاں انہوں نے ایک مکان کرائے
پے لیا۔

لیکن ـــ

چند روز کے بعد ہی نذیرے کے مشورے پر اُس نے اس شہر کی ایک غریب سی بستی
ں دو کمروں کا ایک مکان خرید لیا۔ نذیرے نے اُسے بتایا تھا کہ اس طرح کسی کا دھیان
ن کی طرف نہیں جائے گا اور مستقبل میں حنیف خاں اپنی ماں اور بہن کو بھی یہاں لا کر آرام
ے رہ سکے گا۔ حنیف خاں نے چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھ کر اپنی شکل ایسی بنا لی تھی کہ وہ پہلے
ے بہت مختلف نظر آنے لگا۔

انہیں یہاں رہتے دس پندرہ دن گزر گئے تھے جب ایک روز نذیرا اُسے دو تین
ن بعد آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ اُس نے حنیف خاں کو بتایا تھا کہ وہ فضل شاہ کے حالات
کا پتہ کرنے جا رہا ہے اور اُسے مکمل رپورٹ لا کر دیگا۔

اس نے حنیف خاں کو سمجھایا تھا کہ وہ یہاں لوگوں سے زیادہ تعلقات نہ بنائے اور کسی
کو بھی اپنی اصلیت کی ہوا نہ لگنے دے اس میں دونوں کی بقا تھی ـــ

حنیف خاں ابھی تک اس کی باتوں پر آنکھیں اور دماغ کے دریچے بند کر کے عمل کرتا
آ رہا تھا۔ کیونکہ ان شہروں کے متعلق اُس کی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اُسے اپنے علاقے
کی ہر حد کے دونوں اطراف سینکڑوں راستے ازبر تھے سینکڑوں دیہاتوں کے نام یاد تھے۔

لیکن ـــ

یہاں وہ اجنبی تھا۔

شاید اُس کی بقا کا راز بھی یہی تھی کہ اُس نے اپنے باپ کی زندگی میں اپنے ملک کی
زیر زمین دنیا سے زیادہ رابطہ نہیں رکھا تھا۔

تیسرے روز رات گئے دروازے پر ایک آہٹ نے حنیف خاں کو چوکنا کر دیا۔ اُس نے پھرتی سے اپنے پاس موجود پستول اُٹھایا اور دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ پستول اُس نے کبھی خود سے جدا نہیں کیا تھا۔

"کون" ؟ —

اُس نے دروازے کے نزدیک جا کر پوچھا۔

یار میں ہوں — دروازہ کھولو۔ اور یہاں کون آ سکتا ہے" —

نذیرے کی آواز سن کر اُس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

دروازہ کھلنے پر ایک اور حیرت اُس کی منتظر تھی۔

اس مرتبہ نذیرے کی آمد ایک نوجوان دوشیزہ کے ساتھ ہوئی تھی۔ جو بڑی بے تکلفی سے اُس کے ساتھ اندر آ گئی تھی۔

"سلام کر — اپنا یار ہے یوسف "

نذیرے نے حنیف خاں کا تعارف اُس کے جعلی نام سے اپنے ساتھ آنے والی عورت سے کرواتے ہوئے کہا۔

انہوں نے یہاں اپنے نام تبدیل کر کے رہائش اختیار کی تھی۔ حنیف خاں کا نام یوسف ہو چکا تھا اور نذیرے کا امین —

حنیف خاں حیرانگی سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ ابھی تک اس نے لڑکی کا تعارف نہیں کروایا تھا۔ لڑکی نذیرے سے کچھ زیادہ ہی بے تکلفی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ حنیف دوسرے کمرے میں جا کر لیٹ گیا جبکہ نذیرا لڑکی کے ساتھ اُس کمرے میں سو رہا۔

صبح اُٹھ کر وہ خود حنیفے کے کمرے میں گیا تھا جس کو ساری رات نیند نہیں آئی تھی۔

"کون ہے یہ" ؟ —

حنیف خاں نے چھٹتے ہی کہا۔

"گھر والی ہے میری اور کون ہو گی" ؟

نذیرے نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

"نذیرے — میرے ساتھ جھوٹ نہیں چلے گا۔ سچ سچ بتا کون ہے یہ — کہاں سے لایا ہے تو اسے اپنے ساتھ" ؟

حنیف خاں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"چھوڑ یار کیا کرے گا جان کر — تیرا کیا لیتی ہے۔ اچھا ہے ہمارے ساتھ کوئی عورت بھی ہو گی تو کسی کو معمولی سا شک بھی نہیں گزرے گا — اِسی طرح دو آدمیوں کا بھی اکیلے رہنا ٹھیک نہیں ناں —"

نذیرے نے اُسے بہلانے کے انداز میں کہا۔

"نذیرے — تو جانتا ہے کہ مجھے جھوٹ سے کتنی نفرت ہے"

حنیف خاں کو خواہ مخواہ غصہ آنے لگا۔

" دیکھ حنیف خاں۔ میں نے تیرے ساتھ اچھا وقت گزارا ہے — ہماری بھلائی اس میں ہے کہ ہم اب بھی ایک دوسرے کا سہارا بنے رہیں۔ میں تیری طرح بہادر آدمی نہیں ہوں لیکن میرے سر میں دماغ ضرور موجود ہے۔ ہم مفروروں کی زندگی گزار رہے ہیں ہمیں قدم قدم پر پیسے کی ضرورت پیش آئے گی۔ تیرے میرے پاس کوئی قارون کا خزانہ نہیں ہے — نہ ہی ہم دونوں میں سے کوئی بزنس مین ہے اور نہ ہم دونوں محنت مزدوری کر سکتے ہیں۔ کم از کم میں تو نہیں کر سکتا — یہ ہمارا گاؤں نہیں۔ نہ کوئی سرحدی علاقہ ہے جہاں بارڈر کراس کر کے تم کسی کی گائے بھینس کھول کر لے آؤ گے — شہر کی زندگی کو تم اب تک سمجھ چکے ہو گے۔ یہاں ہماری کوئی ماں نہیں بیٹھی جو ہمیں گھی کے نوالے کھلا دیا کرے گی۔ ہمیں ہاتھ پاؤں مارنے ہی پڑیں گے۔ میں تو یہی فن جانتا ہوں — دو تین مہینے میں اگر ایک آدھ شکار ایسا ہاتھ لگ جائے تو ہمارے دو تین مہینے آسانی سے گزر جایا کریں گے — میں نے اس شہر کے رنڈی بازار میں بڑی مشکل سے واقفیت نکالی ہے — ابھی اسے یہاں اپنی بیوی بنا کر رکھوں گا تاکہ اردگرد کے لوگوں کو ہم پر پوری طرح یقین آ جائے جب "کڑکی" آئے گی تو اسے آگے سپلائی کر دیں گے —"

عام حالات میں اول تو نذیرا کبھی اس نوعیت کی گفتگو ہی حنیف خاں سے کرنے کی جرأت

نہ کرتا۔ اگر کبھی وہ یہ بات کہہ بھی دیتا تو حنیف خاں اُس کی زبان کاٹ کر پھینک دیتا۔ اُس کے لئے یہ تصور بھی کرنا بہت اذیتناک تھا کہ وہ نتھو خاں جیسے نامی گرامی بدمعاش کا بیٹا ہو کر اب رنڈیوں جیسے کام کرے گا۔

کسی عورت کو ورغلا کر اغوا کرنا اور اُسے بازارِ حسن میں فروخت کر دینا نذیرے کا پیشہ رہا ہو گا۔

لیکن ——

اُس نے کبھی اشارۃً بھی اس بات کا ذکر حنیف خاں سے نہیں کیا تھا۔

آج وہ کھل کر اس طرح بات کر رہا تھا جیسے حنیف خاں اس ذلیل دھندے میں اُس کا پارٹنر رہا ہو ——

اُس کا خون کھول اُٹھا

"نذیرے —— تو مجھے آج سے نہیں جانتا —— تو نے یہ جرأت کیسے کر لی —— مجھے تو نے سمجھا کیا ہے"؟

اُس کا دماغ غصے سے پھٹنے لگا تھا۔

"آواز آہستہ کر لے حنیفے —— دماغ ٹھنڈا رکھ۔ یہ بات کبھی پاگل پن کی حالت میں بھی دماغ سے نہ نکالنا کہ ہم دونوں مفرور ہیں۔ ممکن ہے گرفتاری کی صورت میں مجھے فضل شاہ پانچ سات سال کی قید کروا دے لیکن تیرے کھاتے میں اس نے کون کون سا قتل ڈال رکھا ہے اس کا تو اندازہ بھی نہیں کر سکتا —— اگر تو سمجھتا ہے کہ مجھ سے الگ ہو کر اپنا وقت گزارے گا تو تیری مرضی —— میں بھوکوں نہیں مرنا چاہتا —— جب کوئی متبادل روزگار مل جائے گا تو میں یہ دھندہ چھوڑ دوں گا۔ فی الوقت میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ مجھے اور کوئی کام نہیں آتا نہ میں تیری طرح کوئی بہادر انسان ہوں —— آگے تیری مرضی ——"

زندگی کے کسی کمزور ترین لمحے میں بھی وہ اتنی بزدلی کا مظاہرہ کرے گا؟

حنیف خاں نے جیتے جی کبھی اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔

لیکن ——

آج اُسے یوں لگا جیسے اُس کی جنس بھی تبدیل ہو گئی ہو۔ اُسے خود پر حیرت ہوئی کہ ے کی ایک ہی دھمکی نے اُسے ٹھنڈا کر دیا تھا۔

اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کرے؟ کدھر جائے؟

دل تو اُس کا بھی چاہتا تھا کہ ابھی دونوں ہاتھوں سے اُس کا گلہ گھونٹ کر قصہ ہی پاک دے۔

لیکن ——

وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اُسے بھی زندہ رہنا تھا۔ ابھی اُس کی ماں اور ہونے والی ں زندہ تھیں۔

صغراں اُس کی عزت تھی ——

اگر وہ مر جاتا تو فضل شاہ اُس کی عزت کا سر بازار نیلام کر دیتا۔

وہ جانتا تھا کہ اُس کی برادری کے لوگ لاکھ بہادر اور غیرت مند سہی لیکن یہ حقیقت نی جگہ قائم تھی کہ اُس کا باپ مر چکا ہے ——

نتھو خاں کی زندگی میں یہ لوگ کسی بھی گرفت کے سامنے سینہ سپر ہو سکتے تھے لیکن وہ آخر کب تک فضل شاہ اور سرداروں کی بدمعاشیوں کا سامنا کریں گے۔ یہ لوگ اُن بُری طرح ناطقہ بند کر دیتے کہ ساری برادری کو جان کے لالے پڑ جاتے ——

یوں بھی جب سائیں ہی زندہ نہ رہے تو اُن کی شرم کون رکھتا پھرے گا؟

وہ جلد از جلد اپنی ماں اور منگیتر کو اس جہنم سے نکال لینا چاہتا تھا۔

اُسے اور تو کچھ نہ سوجھا۔ غصے سے ہونٹ کاٹتا وہ گھر سے باہر نکل گیا۔

"کہاں جا رہے ہو"؟

نذیرے نے لاپرواہی سے دریافت کیا تھا۔

"لسی پینے" ——

حنیفے نے اُس کی طرف دیکھے بغیر کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

شاباش حنیف خاں ـــــ اپنا دماغ اگر ٹھنڈا رکھو گے تو کامیاب رہو گے ـ
بیٹیا! تم تو کیا اگر تمہارا باپ نتھو خاں بھی یہاں ہوتا تو میرے سامنے دَم نہیں مار سکتا
بھی نذیرا ہوں ۔ نذیرا سانپ ـــــ اگر تیرے ہاتھوں سے ہی یہ کارنامے انجام نہ پا
تو کسی موچی کی اولاد نہ کہنا ـــــ"

اُس نے دل ہی دل میں حنیف خاں کی بے بسی کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا۔

"اُٹھ جا شیر کی بچی ۔ صبح ہو گئی ہے ـــــ کچھ کھا پی لے" ـــــ

اپنی داشتہ کی کمر سہلاتے ہوئے اُس نے ہوسناک نظروں سے اُس کی طرف دیکھ کر

"ہائے اللہ ـــــ ساری رات سونے نہیں دیا ۔ اب تو ذرا آرام کر لینے دو ـــــ"

شریفاں بی بی نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

دونوں شیطان ایک دوسرے سے لپٹ کر دوبارہ لمبی تان کر سو گئے۔

الیکشن ہوا اور فضل شاہ بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گیا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اُس کے بیشتر جلسوں کی صدارت سردار رشید نے کی۔ سردا
کی جیپیں اور کاریں فضل شاہ کی معاونت کرتی رہیں ـــــ سردار رشید نے فضل شاہ کی کا
کو اپنی کامیابی بنایا اور کہا تھا کہ فضل شاہ سے زیادہ اس سیٹ کا کوئی حقدار نہیں ہے
اُس کے بھائی ریاست شاہ کی قربانی رنگ لا کر رہے گی اور اس علاقے کی قسمت ضرور بد
جائے گی۔

سردار رشید اور دیگر معززین کی طرف سے صوبائی حکومت سے اپیل کی گئی تھی کہ شاہ
کی طویل خدمات خصوصاً ریاست شاہ کی قربانی اور پارٹی خدمات کے عوض اُس کی سی
کامیاب ہونے والے فضل شاہ کو صوبائی حکومت میں نمائندگی دی جائے تاکہ اس علاقے
عوام کی محرومیوں کا ازالہ بھی کسی حد تک ہو سکے ـــــ

اور ـــــ

صوبائی حکومت نے اس اہم مطالبے پر فوراً کان دھرے تھے ـــــ

وزیر اعلیٰ صاحب نے تین چار روز بعد ایک اہم تقریب میں فضل شاہ کو صوبائی وزیر بنانے
اعلان کر دیا تھا۔ اُسے بطور خاص سماجی بہبود کی وزارت دی گئی تھی تاکہ وہ "سماج" کی جی
کر "بہبود" کر سکے۔

آج شاہ پور میں جشن کا سا سماں تھا ـــــ

ریاست شاہ کے مزار پر خصوصی چراغاں کیا گیا تھا۔ جہاں باقاعدہ محفل سماع منعقد ہوئی
س میں اُس کا بھائی وزیر سماجی بہبود سید فضل شاہ مہمان خصوصی تھا جبکہ اس محفل کی صدارت
ل شاہ کی درخواست پر سردار رشید نے کی تھی۔

ساری رات محفل سماع ہوتی رہی ـــــ

لیکن ـــــ

ایک محفل اور بھی اس کے ساتھ جاری رہی۔

اس محفل طرب کا خصوصی اہتمام فضل شاہ کی حویلی میں کیا گیا تھا۔ جہاں عنایت بائی کی
زہراں نے حاضرین کے دلوں پر اپنی دلربا اور بیباکانہ نمائش سے بجلیاں گرا رہی تھی۔
ایت بائی نے اس محفل کی افادیت کے پیش نظر بازار سے پورا سکواڈ داشتاؤں کا منگوا رکھا
جو فضل شاہ کے خاص مہمانوں کو سامان عشرت فراہم کر رہی تھیں۔

حویلی کے قریباً تمام کمرے ان خصوصی مہمانوں اور میزبانوں سے اٹے پڑے تھے ـــــ!

ساری رات یہ رقص بہیمیت جاری رہا۔

صبح دیر گئے تک وہ لوگ بھی تان کر سوتے رہے۔

اس روز دوپہر کے بعد جب فضل شاہ اور سردار رشید ایک کمرے میں سر جوڑ کر بیٹھے مستقبل
اپنے علاقے کے غریب اور عوام کی خشک رگوں سے بچے کھچے ہوئے چند قطرے بھی
نے کے منصوبے بنا رہے تھے تو دروازے پر بڑی مودبانہ آہٹ ہوئی اور شاہ صاحب
اجازت پر عنایت بائی اپنی بیٹی زہراں کے ساتھ "کورنش" بجا لاتی اندر آ گئی۔

"کہو عنایت بائی کوئی کمی تو نہیں رہ گئی تمہاری خدمت میں" ـــــ

فضل شاہ نے اُس کی طرف دیکھ کر بے ہودہ سا اشارہ کیا۔

"مولا زندگیاں رکھے شاہ جی آپ کی ـــــ ہمارے تو آپ مائی باپ ہیں ہم تو غلام ہیں
آپ کے ہیں ـــ نے بچی کو مستقل آپ کے نام لگا دیا ہے پیر بادشاہ ـــــ بس ایک دھڑکا سا دل کو
لگا رہتا ہے "ـــــ

عنایت بائی نے نائکہ کے سے انداز میں بدن لچکاتے ہوئے کہا۔

"کیا عنایت بائی ـــ ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں کیا دھڑکا لگ گیا"

فضل شاہ نے لاپرواہی سے ہنس کر کہا۔

" مائی باپ وہ موّا حنیفا ابھی تک گرفتار نہیں ہوا۔ ڈرتے ہیں کہ خطرناک آدمی ہے۔ اس
روز تو مولا نے جان بچالی ـــــ معلوم نہیں کب یہ بلا دوبارہ ہم پر "آن پڑے"

عنایت بائی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

" ہاں شاہ جی ـــ کچھ کیجئے ناں اُس کا ـــ"

زہراں بائی نے اپنی ماں کی معاونت کرتے ہوئے اٹھلا کر کہا۔

کیا بات کرتی ہو عنایت بائی ـــ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے ناں ـــ ارے اپنے
شاہ صاحب کے ہوتے کسی کی کیا مجال ہے جو تمہاری طرف آنکھ بھر کر بھی دیکھے ـــ جاؤ عیش کرو
دیکھ لیں گے اُس حرامی کو بھی "ـــــ

سردار رشید نے فضل شاہ کے بجائے جواب دیا۔

" بس حضور ـــ باندیوں کا خیال بھی رکھئے ـــ ہم مسکین لوگ ہیں۔ اور تھانے والوں
کو کہہ دیجئے۔ مولا آپ کو آباد رکھے"

عنایت بائی نے سماجت سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہارے گھر پر مستقل گارڈ لگوا دوں گا"

فضل شاہ نے اُسے واپس لوٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

عنایت بائی اور اُس کی بیٹی جس طرح کورنش بجاتی آئی تھیں اُس طرح اُلٹے قدموں
واپس لوٹ گئیں۔

سردار صاحب یار واقعی بات تو خطرناک ہے ـــــ میں تو سیاست میں ہی اُلجھا رہا۔ تم

تو قوم کو جانتے ہو ـــــ وہ سالا جانے کب کوئی مصیبت کھڑی کر دے"

فضل شاہ نے اُن کے جانے کے بعد تشویش ظاہر کی۔

" فضل شاہ ٹھیک ہے تم جو سوچ رہے ہو لیکن ہم نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں۔
جب کبھی آئے گا۔ دیکھ لیں گے"

سردار رشید نے لاپروائی سے کہا۔

"نہیں سردار یار ـــ اُسے نظر انداز کرنا غلط ہے ـــ پھر وہ ہمارے بلانے پر تو نہیں
آئے گا۔ وہ تو موقع کی تاک میں ہے۔ اِس کے لئے کسی کی جان لینا یا مرجانا کچھ مشکل کام نہیں۔
میرے خیال سے اُسے سب سے پہلے اُس کے بِل سے نکالنا ہوگا ـــ جب تک وہ چھُپا ہوا
ہے محفوظ ہے ـــ سامنے آنے پر ہم اُسے گھیر کر مار سکتے ہیں ـــ ورنہ یہ تلوار جو خطرے
کی طرح ہمارے سروں پر لٹک رہی ہے کسی کی بھی جان لے سکتی ہے"

فضل شاہ خاصا سنجیدہ دکھائی دے رہا تھا۔

"لیکن اُسے باہر کیسے نکالیں "ـــ

سردار رشید کو بھی تشویش لاحق ہونے لگی تھی۔

"ایک ترکیب ہے میرے پاس ـــ"

فضل شاہ نے کہا۔

"کیا" ؟

سردار رشید نے حیرانگی سے دریافت کیا۔

" سردار صاحب اگر تم......"

فضل شاہ نے اسے اپنے خطرناک شیطانی منصوبے کی تفصیلات بتانی شروع کیں۔

سردار رشید ہمہ تن گوش تھا۔

کسی کار کی پچھلی ونڈ سکرین پر رکھے جاپانی گڈے کی طرح وہ اُس کی ہر بات پر سر ہلا ہلا
کر اُس کو داد دے رہا تھا۔ منصوبے کے آخر میں اُس نے بے شرموں کی طرح فضل شاہ کے
ہاتھ پر ہاتھ مارا ـــــ

"فضل شاہ یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ کل ہی لو ___ ذرا ایس پی کو فون کر دینا۔ بلکہ اس کا
کل میں تبادلہ ہی کروا دو ___ کچھ زیادہ ہی ایماندار اور فرض شناس بننے کا شوق نظر آ
ہے اسے ___"

سردار رشید نے کہا۔

"تم اُس کی فکر نہ کرو ___ میں اب چھ سات دن کے لئے شہر والی کوٹھی پر رہوں گا
اس درمیان یہ کام ہو جانا چاہیئے ___ میرے بھی اور تمہارے بھی آدمی چوکس ہو جائیں
تو ہم باہر نکلنے پر اُسے گھیر کر مار ڈالیں گے ___ سردار رشید ایک بات یاد رکھنا اُس
زندہ پولیس کے ہاتھ لگنا ہم دونوں کے لئے کوئی نیا عذاب کھڑا کر دے گا ___"

فضل شاہ نے اُسے اپنی تشویش سے آگاہ کیا۔

"تم مطمئن رہو فضل شاہ ___ زندہ بچے گا تو بات کرتا"

سردار رشید نے بڑے ہنکار سے کہا۔

دونوں شیطان دیر گئے تک اپنے خطرناک منصوبے کی جزئیات پر بحث کرتے رہے۔

نذر محمد نے ساری زندگی تجربات کی نذر کر دی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ سرداروں اور فضل شاہ کا اتحاد دراصل کس کے خلاف ہے۔ دونوں
شیطان اپنے بڑے مقاصد پر اکٹھے ہو گئے تھے۔

اپنے بھانجے کی طاقت کا علم اُسے بھی تھا اور فضل شاہ کو بھی۔ نذر محمد جانتا تھا
فضل شاہ اور سردار دونوں نے اس خطرے کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا ہوگا۔ فضل شاہ کے
صوبائی اسمبلی منتخب ہونے کے دوسرے ہی روز گاؤں کی طرف آنے والے راستے پر پولیس
پوسٹ کا قیام اُس کے خدشات کی تصدیق کے لئے کافی تھا۔

اس کا سامنا بڑے گھٹیا اور کمینے دشمنوں سے تھا۔ اگر نتھو خاں زندہ ہوتا یا حالات
نے حنیف خاں کو بھی گاؤں میں رہنے کی اجازت دی ہوتی تو کوئی اور بات تھی۔ اُس صورت
میں کچھ بھی کرنے سے پہلے ہزار مرتبہ سردار اور فضل شاہ سوچتے۔

لیکن ___

اب ایسا نہیں تھا۔

جہاں تک برادری کا تعلق تھا اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ لوگ اُن کے
پسینے کی جگہ خون بہا سکتے تھے۔

لیکن ___

وہ غریب اور بے آسرا لوگ تھے۔ اُن کا کوئی والی وارث نہیں تھا۔ مالی طور پر وہ بے
چارے کی اعانت کے قابل ہی نہیں تھے۔

ان حالات میں کوئی بھی انہیں ڈرا دھمکا اور دبا سکتا تھا۔

پولیس پوسٹ کے قیام کا مقصد یہی تھا کہ اگر حنیفا اس طرف آئے تو بچ کر نہ جانے پائے۔
اس روز جب گاؤں کے نمبردار نے لوگوں کو بتایا کہ آج پولیس پوسٹ خالی ہے اور وہاں
کوئی پہرے دار بھی موجود نہیں تو گاؤں کے لوگوں نے حیرانگی کے ساتھ سکھ کا سانس بھی لیا کیونکہ
انہیں اس پوسٹ کے ملازمین کیلئے کھانے پینے کا بندوبست کرنا پڑتا تھا اور یہ کوئی معمولی کھانا
بھی نہیں ہوتا تھا۔

لیکن ___

اس گاؤں میں ایک شخص ایسا ضرور تھا جس کو اس خبر نے پہلے حیران اور اب پریشان
کر دیا تھا اور وہ تھا نذر محمد۔ اُس کی جہاندیدہ نظروں نے پچھلے کچھ دنوں سے گاؤں کے
لوگوں کے بدلتے رویّے کو نوٹ کرنا شروع کر دیا تھا۔ حنیف خاں کے اشتہاری ہونے کے بعد
سے ان لوگوں کے ساتھ جو کچھ بیت رہی تھی اس نے نتھو خاں کے خاندان سے اُن کی ہمدردیاں
کم کر دی تھیں۔ یوں بھی نتھو خاں کے بعد تھانے کچہری کے معاملات انہیں خود ہی نمٹانا
پڑتے تھے۔

فضل شاہ وزیراعلیٰ کا مشیر بن چکا تھا۔

سردار مرید یونین کونسل کا چیئرمین بن چکا تھا۔

دو دشمنوں نے اپنے مشترکہ مفادات پر حنیف خاں کے خلاف اتحاد کر لیا تھا۔

پولیس پوسٹ پر موجود ملازمین کے وقتی طور پر وہاں سے ہٹ جانے کا مطلب برا
اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ اب ان دونوں دشمنوں کی طرف سے نتھو خاں کے خاندان پر کو
عذاب آنے والا تھا۔ یہ اُس کی چھٹی حس تھی جس نے نذر محمد کو یہ سوچنے پر مجبور کیا۔

لیکن ——

وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے ان خدشات کا اظہار اپنی بہن کے سامنے بھی کرے۔ پھ
بھی اس کی یہ خواہش ضرور تھی کہ وہ جلد از جلد یہاں سے اپنی بہو صغراں سمیت جو حنیف خا
کے فرار ہونے کے بعد سے اصغری کے ہاں چلی آئی تھی کسی اور طرف نکل جائے۔ اُس نے نتھو خا
کی اس علاقے میں موجود زمین کو اونے پونے داموں فروخت کرنے کا بندوبست کر لیا تھا اور
اب وہ بھی یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔

نذر محمد نے اُس شام اصغری سے کہا بھی کہ اُسے دال میں کچھ کالا دکھائی دیتا ہے اور انہیں
یہاں نہیں رہنا چاہیئے۔

"اصغری! تم فضل شاہ کو نہیں جانتی اور ان سرداروں سے متعلق بھی تمہیں کوئی غلط فہمی
نہیں ہے۔ تمہیں اِن کے متعلق کیا نہیں معلوم —— اصغری! نتھو خاں کی زندگی میں بات کچ
اور تھی۔ پھر حنیف ہی یہاں ہو تو برادری میں سے کسی کی ہمت نہیں تھی کہ ہماری طرف میلی آنکھ
سے بھی دیکھتا۔ ان لوگوں کو علم ہو گیا ہے کہ اب نہ ہم ان کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں اور نہ ہی کچھ ک
سکتے ہیں —— پھر یہ ہماری اور اِن جنگلی درندوں کی لڑائی کے درمیان کیوں آئیں گے؟ مجھے
نتھو خاں کے پرانے ساتھی جو آج بھی ہمارے وفادار ہیں کچھ دنوں سے یہی مشورہ دے رہے
ہیں کہ تمہیں اور صغراں کو یہاں سے نکال دوں۔ میں نے نتھو خاں کی زمین بھی فروخت کرنے کا
بندوبست کر لیا ہے۔ ہم فی الحال یہ زمین کسی کو ٹھیکے پر دے کر یہاں سے نکل جاتے ہیں بعد میں
حالات بہتر ہونے پر حنیف خاں سے رابطہ ہوا تو فروخت بھی کر دیں گے"——

"نذر محمد —— تیری تمام باتیں سچ ہوں گی —— لیکن یاد رکھنا میرے جیتے جی کبھی ایسا
نہ دکھنا کہ میں اپنے خاوند کی قبر چھوڑ کر یہاں سے چلی جاؤں گی"——

اصغری نے اُس کی ساری باتیں سننے کے بعد فیصلہ کن انداز میں کہا۔

یوں تو نذر محمد کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اصغری جو کچھ کہہ رہی ہے اُس سے سرمو انحراف نہیں
ے گی پھر بھی اُس نے بہت مغز ماری کی۔

لیکن ——

ڈھاک کے تین پات کیا مجال جو اصغری کے کان پر جوں بھی رینگی ہو۔

"اور یہاں —— اگر فضل شاہ یا سردار یہ سمجھتے ہیں کہ وہ نتھو خاں کی عزت کی طرف میلی نظر
بھی دیکھ لیں گے تو وقت آنے پر اُن کی یہ غلط فہمی بھی دور کر دوں گی —— میری لاش سے
ر کر ہی کوئی صغراں تک پہنچے گا؟ ——"

اُس کے لہجے کا اعتماد بتا رہا تھا کہ صغراں جو کہہ رہی ہے وہ کر گزرنے کی ہمت بھی رکھتی

نذر محمد نے بھی اُس روز نتھو خاں کی حویلی ہی میں سونے کا ارادہ ظاہر کیا تھا لیکن اصغری
اُس کی ایک نہ چلنے دی۔

"کوئی بات نہیں نذر محمد —— تو کیوں گھبرا رہا ہے۔ ابھی تیری بہن نہیں مرگئی۔ نتھو خاں
ر گیا ہے لیکن مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے —— تو بھابی اور بچوں کے پاس
۔ انہیں اکیلا چھوڑنا ٹھیک نہیں ——

فضل شاہ اور سرداروں کو علم ہے کہ حنیف خاں کس کا بیٹا ہے —— اگر انہوں نے
رکت کی تو وہ اُن کی نسلوں کو برباد کر کے رکھ دے گا"——

اصغری نے اُسے اپنے گھر بھیجتے ہوئے کہا۔

اس روز نذر محمد بڑے بوجھل قدموں سے اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ اُس نے بطور
اط نتھو خاں کے ٹیوب ویل پر ملازم دونوں لڑکوں کو بھی آج حویلی کے مردانہ حصے ہی
ہوشیار ہو کر سونے کی ہدایت کی تھی۔

رات ایک پہر بیت چلی تھی۔

گرمیوں کی اس بوجھل رات کو سرِ شام میں پچھم سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھانکوں

نے بڑا خوشگوار کر دیا تھا۔ سارا گاؤں اِن ٹھنڈی ہواؤں کے دوش پر لمبی تان کر سو رہا تھا

لیکن ——

آج اصغری کو ایک پل کے لئے بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔ حالانکہ اس کا معمول تھا کہ عشا کی نماز پڑھنے کے کچھ دیر بعد ہی سو جاتی اور پھر تہجد کی نماز کے لیے اُٹھا کرتی تھی۔

نذر محمد کو اُس نے بظاہر تو مطمئن کر کے بھیج دیا تھا۔ لیکن اُس کا اپنا دل مطمئن نہیں تھا۔ رہ رہ کر خدشات اُس کے دماغ میں سر اُٹھا رہے تھے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں تھا کہ اُس کا واسطہ واقعی بڑے کمینے دشمنوں سے تھا جن سے کسی بھی حرام کاری کی اُمید کی جا سکتی تھی۔

کمرے کے ایک کونے میں ہلکی روشنی کا بلب جل رہا تھا اور اُس کی بہو صغراں اس کے سامنے دوسرے کونے پر گہری نیند سو رہی تھی جب اچانک ہی اصغری کا دل گھبرانے لگا۔

اُسے یوں لگا جیسے کسی نے حویلی کی دیوار پھلانگی ہو۔

پہلے تو اصغری نے اسے اپنا وہم جانا کیونکہ شام ہی سے اُس کے دماغ میں ہی فلم رہی تھی، لیکن ایک کے بعد دوسری آواز نے اُسے یقین دلا دیا کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔

حویلی کے دوسرے مردانہ حصے میں نتھو خاں کے چار ملازم سو رہے تھے۔ اصغری نے انہیں بطور خاص آج ہدایت کی تھی کہ اُن میں سے ایک جاگ کر پہرہ دیا کرے اور باقی سویا کریں۔

لیکن ——

انہوں نے شاید اس نصیحت پر عمل کرنے کی زحمت گوارہ نہیں کی تھی —— !!

یہ صورتحال اصغری کے لئے اِس لئے نئی نہیں تھی کہ ساری زندگی نتھو خاں اور اُس کا بیٹا اس طرح دبے پاؤں رات کو دیر گئے سرحد پار سے اپنے گھر میں بھی چوروں کی طرح واپس آیا کرتے تھے۔

لیکن ——

آج حالات مختلف تھے۔

وہ بھی نتھو خاں کی بیوی تھی بغیر کسی گھبراہٹ کے اُس نے سرہانے دھری کلہاڑی کو ہاتھ

مضبوطی سے تھاما اور اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں اُس کی بہو کی آنکھ نہ کھل جائے اور ڈر جائے۔ کمرے سے باہر برآمدے میں آ کر صورتحال کا جائزہ لینے کا ارادہ کیا۔

دروازے کی کنڈی اُس نے بڑی آہستگی سے کھولی اور بڑی بہادری سے باہر نکل آئی۔

پشت پر موجود دروازے کو اُس نے باہر سے کنڈی لگا دی تھی اور اب ہاتھوں میں کلہاڑی ے برآمدے کے سامنے والے اُس دروازے کی طرف جا رہی تھی جو دوسری طرف مردانہ حصے میں کھلتا تھا۔

اچانک ہی اُسے دو تین سائے اپنی طرف بڑھتے دکھائی دیئے۔

کون ہے ؟

اُس نے کرخت آواز میں للکارا۔

لیکن ——

اُس کی آواز کا جواب دو مزید سایوں کی صورت میں ملا —— اب وہاں پانچ چھ نقاب پوش اُسے گھیرے میں لئے کھڑے تھے۔

اُن میں سے ایک نے چاہا کہ آگے بڑھ کر اُس کے ہاتھ سے کلہاڑی چھین لے لیکن حملہ آور کی توقعات کے بالکل برعکس اصغری نے "چور چور" کا شور مچاتے ہوئے کلہاڑی سر سے اُوپر اُٹھائی اور پوری قوت سے حملہ آور پر چلا دی۔

حملہ آور کو شاید اتنی شدید مزاحمت کی اُمید نہیں تھی ——

کلہاڑی کا پھل اُس کے شانے کی ہڈی میں اُتر گیا جسے اصغری نے جھٹکا دے کر باہر کھینچا۔ حملہ آور ایک ہی وار میں ڈھیر ہو گیا۔

بھری ہوئی شیرنی کی طرح اُس نے چاہا کہ اپنے پہلو کی طرف سے حملہ کرنے والے دوسرے کی بھی خبر لے۔

لیکن ——

اب حملہ آور اُسے مہلت دینے کے لیے تیار نہیں تھے —— !

تین چار اکٹھے اُس پر پل پڑے جبکہ اُن میں سے ایک نے جھک کر اپنے مضروب ساتھی

کی خبر لینا چاہی۔

یہ تو مر رہا ہے۔

اُس نے اچانک ہی کھڑے ہو کر کہا۔

اصغری ــــ سے چاروں حملہ آور اِس طرح اِس سے الگ ہو گئے جیسے انہیں
بجلی کا شاک لگا ہو ــــ

"لڑکی کہاں ہے؟"

اچانک ہی اُن میں سے ایک نے اصغری کی طرف پستول سیدھا کرتے ہوئے کہا
اصغری اپنے آپ میں کہاں تھی۔ اُس نے چاہا کہ آگے بڑھ کر پوچھنے والے کا
نوچ لے۔

لیکن ــــ

اچانک ہی اُس کے پستول سے یکے بعد دیگرے تین شعلے برآمد ہوئے اور
خاں کی غیرت مند بیوی تلملا کر گر پڑی۔

اس ہنگامے سے کمرے میں موجود صغراں کی آنکھ کھل گئی تھی جس نے دیوانہ وار
پیٹتے ہوئے چیخنا چلانا اور گاؤں والوں کو مدد کے لئے پکارنا شروع کر دیا تھا۔

فائرنگ اور صغراں کے چیخنے کی آوازیں سن کر گاؤں کی زندگی نے اچانک ہی کرو
لینی شروع کر دی تھی۔

سب سے پہلے اُن کے پچھواڑے کے تیسرے گھر سے نمبردار غلام احمد اور اُس
دونوں لڑکے حویلی کی دیوار پھلانگ کر للکارتے مارتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ جن
تعاقب میں نذر محمد بھاگتا چلا آرہا تھا۔

لیکن ــــ

حملہ آور اپنے ایک ساتھی کی لاش چھوڑ کر فرار ہو چکے تھے۔

حویلی کے مردانہ حصے میں موجود چاروں نوکر غائب تھے۔ دو ہی صورتیں ممکن تھ
یا تو وہ گاؤں والوں کے خوف سے فرار ہوئے تھے یا پھر اس سازش میں برابر کے حصے

تھے ــــ!!

نذر محمد نے سب سے پہلے اپنی بہن کی خبر لی جس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر
گئی تھی۔

اس نے نذر محمد کو آج شام ہی کہا تھا کہ کوئی مائی کا لال جیتے جی اُسے اپنے خاوند کی
قبر سے الگ نہیں کر سکتا ــــ

اُس نے جو کہا سچ کر دکھایا تھا ــــ

وہ اپنی غیرت پر قربان ہو گئی تھی۔

یہاں موجود ایک حملہ آور کی لاش اِس بات کی نشاندہی کے لئے کافی تھی کہ نتھو خاں
کی بیوی نے کسی مرحلے پر بزدلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ گو کہ حالات نے اُسے تہی دست کر دیا
تھا۔ اُس کا سائیں مر چکا تھا اور بیٹا زندہ ہو کر بھی اس کی مدد سے قاصر تھا۔ اِس کے باوجود
اُس نے حملہ آوروں کے لئے میدان خالی نہیں چھوڑا تھا۔

"ارے ــــ یہ تو مسکین علی ہے ــــ سردار مرید کا ملازم ــــ"

وہاں جمع ہونے والے گاؤں کے لوگوں میں سے ایک نے اُسے پہچان کر اچانک
ہی کہا۔ نذر محمد کو یوں لگا جیسے اچانک ہی اُس کے اندر کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا ہو۔
اُس نے پہلے تو زمین پر دو زانو ہو کر اپنی شہید بہن کے ماتھے کو چوما اور اُس پر چادر ڈال
دی پھر وہ اچانک تن کر کھڑا ہو گیا۔

"بے غیرتو ــــ بزدلو! تم جانتے ہو کس کے گھر میں کھڑے ہو۔ یہ اُس گاؤں کا قلعہ
ہے ــــ تمہاری نسلوں کو یہاں پناہ ملتی رہی ہے۔ آج تمہارے جیتے جی اِس گھر کی غیرت پر حملہ
ہوا ہے ــــ حملہ آور نتھو خاں کی بہو کو اُٹھانے آئے تھے ــــ لیکن تم نے کچھ نہ کیا ــــ کسی نے
نتھو خاں کے گھر کی خبر نہ لی ــــ جس نے تمہاری درجنوں بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کئے آج اُس کی
عزت کو پلوال کے سردار لوٹنے آ گئے تھے ــــ لیکن کوئی بات نہیں۔ ابھی نتھو خاں کا بیٹا زندہ
ہے ــــ وہ ایک ایک کو چن کر مارے گا ــــ یاد رکھنا یہاں بڑی تباہی آئے گی ــــ
حنیف خاں تم سب کو غارت کر کے رکھ دے گا ــــ تم نے......"

اُسے چکر آ گیا۔

لیکن ——

اچانک ہی نمبردار غلام احمد نے اُسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا ——

نذر محمد —— ہوش کر۔ خدا کی قسم ہمیں علم نہیں تھا کہ سردار اتنا گر سکتے ہیں ——"

"پرے ہٹ جا نمبردارا —— میں جاؤں گی —— میرے بیٹے جائیں گے۔ آج ہی ابھی، میں یہ قرض اُتار دوں گی" ——

یہ سکینہ بی بی تھی ——

گاؤں کی بھیٹارن جس کی دو بیٹیوں کو نتھو خاں نے اپنے ہاتھوں ڈولی میں بٹھایا تھا۔

"یار محمد —— غلام نبی تم کہاں ہو" ——

سکینہ بی بی نے مجمعے میں اپنے بیٹے کو للکارا ——

دو کڑیل نوجوان مجمع کو چیرتے سامنے آ گئے۔

"یار محمد، غلام نبی، سرداروں نے تمہاری ماں کو قتل کیا ہے —— یہ وہی ہے جس نے اپنے ہاتھوں سے تمہاری بہنوں کو ڈولی میں بٹھا کر رخصت کیا تھا —— جاؤ میں تمہیں حکم دیتی ہوں سردار مرید کو قتل کر دو —— اُسے کتے کی موت مار ڈالو —— جاؤ ورنہ میں تمہیں دودھ کی دھاریں نہیں بخشوں گی —— جاؤ" ——

سکینہ بی بی پر دیوانگی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ دیوانہ وار اصغری کی لاش سے لپٹ کر گاؤں والوں کی بزدلی کو گالیاں دے رہی تھی۔

"نہیں سکینہ بہن —— ابھی نہیں —— ابھی میں زندہ ہوں —— میں اس گاؤں کا نمبردار ہوں یہ قرضہ میرے سر چڑھا ہے —— میں ہی اسے اُتاروں گا —— یوسف، اکبر، صدیق گھوڑیاں تیار کرو۔ ابھی وار نکلے گی —— پلوال والوں کو بتا دینا کہ نتھو خاں کی غیرت نہیں مری وہ اکیلا مرا ہے —— جاؤ بندوقیں نکالو —— جاؤ ——"

نمبردار غلام احمد نے اپنے بیٹوں کو للکارا ——

پندرہ بیس منٹ بعد ہی پلوال کی طرف شمشیر نگر کے پندرہ بیس جوان بندوقیں اور برچھیاں اُٹھائے للکارے مارتے اُڑتے چلے جا رہے تھے۔

بدلہ

شمشیر نگر سے اُٹھی آندھی نے ایک مرتبہ تو پلوال کو ہلا کر رکھ دیا —— !

نمبردار کے تینوں لڑکے للکارے مارتے ہوئے رائفلیں تانے سرداروں کی حویلی کے [باہر] کھڑے ہو کر بہت دیر تک انہیں گالیاں دیتے رہے۔

لیکن ——

یہاں کوئی ہوتا تو باہر آتا۔

یہ صرف بدمعاش ہی نہیں سیاستدانوں کی بھی حویلی تھی اور یہ وہ سیاسی غنڈے [تھ]ے جو کوئی بھی واردات کرنے سے پہلے اُس کے نتائج و عواقب کی تیاری پہلے سے کر لیا [کر]تے تھے۔ سرداروں نے حنیف خاں کو قابو کرنے کے لئے فضل شاہ کے تعاون سے سارا [منص]وبہ ضرور بنایا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں غیرت پہ حملے کی خبر سن کر وہ تلملاتا ہوا اپنے [مک]ان سے باہر نکلے گا اور پہلے سے گھات میں لگے فضل شاہ اور سردار اُسے مار ڈالیں گے۔

لیکن ——

انہوں نے اِس مفروضے کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا کہ شمشیر نگر کے باسیوں کے دلوں [میں] نتھو خاں نے تیس سال تک بلا شرکت غیرے حکومت کی ہے عین ممکن تھا کہ اس کے [ق]اتلان مند شمشیر نگر کے باسیوں کی غیرت کے لیے یہ حرکت تازیانے کا کام کرتی اور وہ جوش [می]ں اندھے ہو کر اپنی بزدلی کو ایک طرف رکھ کر کوئی بھی جذباتی قدم اُٹھا لیں —— !

ان نام نہاد شرفا کے نزدیک غنڈہ گردی کا بہترین اصول بھی تھا کہ اپنے جرم کا کوئی [نش]ان باقی نہ رہنے دیا جائے جس کی مدد سے انصاف کی عدالت میں انہیں مجرم ثابت

کیا جا سکے ــــــ

وہ جانتے تھے کہ اندھے قانون کو جرم کے ثبوت درکار ہوتے ہیں۔ دنیا کا کوئی
محض اپنے دل کی گواہی یا واقعات کی بنیاد پر فیصلہ نہیں کیا کرتا ــــــ

کسی کو ملزم نامزد کر دینا کافی نہیں ہوتا بلکہ اُس کے لئے ثبوت بھی فراہم کرنے پڑتے
اور اپنے جرم کا یہ مہذب دنیا کے وحشی کوئی نام ونشان نہیں چھوڑتے تھے۔

جو لوگ نتھو خاں کی غیرت پر حملہ آور ہوتے تھے۔ اُن میں سردار مرید اور فضل شاہ
کے کارندے شامل تھے۔ یہ اتفاق تھا کہ مرنے والا سردار مرید کا آدمی تھا اور اُس کی شناخ
کر لی گئی تھی جبکہ سردار مرید اور اُس کا بھائی گزشتہ چالیس گھنٹے سے شہر میں موجود اپنی کو
میں قیام پذیر تھے۔

انہوں نے حملے کے وقت شہر میں اپنی موجودگی ثابت کرنے کے لئے انہوں نے
ثبوت یہاں جمع کئے ہوئے تھے۔ جس رات یہ حملہ ہوا دونوں بھائی ایک اہم سرکاری
میں موجود تھے۔ جہاں صوبے کی قریباً تمام اہم شخصیات کا اجتماع تھا۔ اس شہر کے تمام پو
آفیسر اس بات کے گواہ تھے ــــــ!

شمشیر نگر کے جیالے پہلے تو سرداروں کو گالیاں نکالتے رہے پھر انہوں نے ہوا
فائرنگ شروع کر دی۔

اُن کی دہشت نے پلوال کے مکینوں کو اپنے گھروں میں مقید کر دیا تھا۔ یوں بھی
نے اپنے گاؤں والوں کے ساتھ کوئی ایسے اچھے تعلقات قائم نہیں کئے تھے کہ کوئی اُ
بھڑکائی آگ کا ایندھن بنتا ــــــ!

حویلی کے اندر سے کوئی مزاحمت نہ ہونے پر سکینہ کے بیٹے برچھیاں لہراتے حویلی
مردانے حصے میں جا گھسے انہوں نے وہاں موجود چوکیداروں کو مار مار کر بھرکس نکال د
تین چار کی ٹانگیں، بازو توڑ ڈالے۔ دو تین کے سر پھاڑ دیئے۔

لیکن ــــــ
گوہر مقصود کسی کے ہاتھ نہ لگا۔ سردار مرید نہیں تھا۔ اپنی روایات کا احترام کرتے ہ

ہوں نے "زنان خانے" کا رُخ نہیں کیا تھا۔

علی الصباح جب انہوں نے پلوال کی طرف پولیس کی جیپ اور ٹرک کو بڑھتے دیکھا
بادل نخواستہ گھوڑیاں بھگاتے ہوئے شمشیر نگر پہنچ گئے ــــــ

بڑی سردارنی بیگم نے آدھی رات ہی کو شہر والی کوٹھی میں فون کر کے اس ناگہانی آفت
اطلاع کر دی تھی جہاں سے سرداروں نے خاص طور پر ایس ایس پی کی قیادت میں اپنی
یلی کی حفاظت کے لیے پولیس فورس بھیجی تھی ــــــ

اس فورس کو شمشیر نگر کے پندرہ بیس مکینوں کے نام کی لسٹ خصوصی طور پر دی گئی تھی
ان لوگوں کو ہر قیمت پر گرفتار کرنا ہے۔

اور ــــــ

اس لسٹ میں سب سے پہلا نام نذر محمد کا تھا ــــــ!

شمشیر نگر کا ہر وہ باسی جس سے ان لوگوں کو کسی بھی مزاحمت کی اُمید تھی اس کا
اس لسٹ میں شامل تھا اب دنیا کی کوئی طاقت انہیں بچا بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ پلوال
ملہ ہوا تھا اور سرداروں کے ملازمین زخمی ہوئے تھے۔

پولیس نے اس طرح شمشیر نگر پر دھاوا بولا تھا جیسے وہ دشمن ملک کا کوئی دیہات ہو
اں دشمن فوجیں چھپی ہوئی تھیں۔ انہوں نے گھروں کے اندر گھس کر مردوں کو زدوکوب کیا پولیس
ے سے عورتیں اور بچے بھی نہ بچ سکے۔ مردوں کو انہوں نے مار مار کر اَدھ موا کر دیا اور گھسیٹتے
ئے پولیس کے ٹرکوں تک لے آئے۔ انہوں نے گرفتار شدگان کے بازو انہی کے کپڑوں سے
یچھے کی طرف باندھے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر پولیس کے جیالے انہیں
قوں کے بٹ مارتے ہوئے پولیس لائن تک لے آئے تھے جہاں اگلے روز سارا دن پولیس
نا کہ مجسٹریٹ کے سامنے پیش کئے بغیر اُن سب کا ریمانڈ لے لیا گیا۔

اس سارے آپریشن کی نگرانی فضل شاہ خود کر رہا تھا ــــــ

اُس نے اُسی روز ایک ہنگامی پریس کانفرنس میں اپنے حلقہ انتخاب میں پڑنے والے
ہات "پلوال" کے ایک "سیاسی اور سماجی خانوادے" کے ساتھ ہونے والی غنڈہ گردی کی کھُل کر

مذمت کرتے ہوئے ملزموں کو کیفر کردار تک پہنچائے بغیر چین سے نہ بیٹھنے کا عہد کیا تھا ـــــ

اس سارے ہنگامے میں نتھو خاں کی بیوی کی موت کو بالکل فراموش کر دیا گیا ـــــ

اس گاؤں میں کوئی مائی کا لال بچا ہی نہیں تھا جو تھانے تک جا کر اس واردات کو بھی درج کروانے کی بحث کر لیتا ـــــ

حملہ آور کی لاش پولیس والے اپنے ساتھ پوسٹ مارٹم کے بہانے لے گئے تھے۔ گاؤں کے بچے کھچے بوڑھوں اور عورتوں نے منت سماجت کر کے نتھو خاں کی بیوہ اصغری کا مردہ خراب ہونے سے بچایا ورنہ تو پولیس والے اُس کی لاش کا "پوسٹ مارٹم" کروانے پر بھی تلے ہوئے تھے۔

اُسی روز دوپہر کے بعد پولیس والوں نے بھی ایک عورت کا بندوبست کیا جس نے اصغری کی لاشے کو غسل دیا گاؤں کے چند بوڑھوں نے اُس کا جنازہ اُٹھایا اور پولیس کے کڑے پہرے میں اُس کے خاوند نتھو خاں کے پہلو میں دفنا دیا۔

اُس روز حنیف خاں کی ماں کے قل تھے جب وہ گاؤں کے باہر پہنچا ـــــ!!

گاؤں سے باہر شام ڈھلے جب وہ کھیتوں کی آڑ میں چھپ کر بیٹھا اپنے کسی واقف کار کا انتظار کر رہا تھا تو اُسے بابا حیات اُس طرف آتا دکھائی دیا۔ مسجد کا خدمت گار تھا اب مولوی صاحب کے لئے روٹی لے کر جا رہا تھا۔

بابا حیات نے جب اچانک حنیف خاں کو اپنے سامنے پایا تو بے ساختہ اُس کے آنسو بہہ نکلے۔ کمزور اور بے بس بابا حیات نے جس پر نتھو خاں نے اپنی زندگی میں بے شمار احسان کئے تھے روتے ہوئے حنیف خاں کو اُس کی غیر موجودگی میں بیتنے والی قیامت کی کہانی سنا دی اور اُس کے سامنے ہاتھ باندھتے ہوئے التجا کی کہ وہ واپس لوٹ جائے کیونکہ اب حالات وہ نہیں رہے یہاں قدم قدم پر اُس کی جان کو خطرہ ہے فضل شاہ اور سرداروں کے آدمی علاقے میں چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور وہ اُسے پولیس تک پہنچنے سے پہلے ہی مار ڈالیں گے۔

حنیف خاں کو یوں لگا جیسے کسی نے پوری قوت سے زہر میں بجھا بھالا اُس کے سینے میں

اُتار دیا ہو ـــــ

اُسے اپنے دل کی دھڑکن بند ہوتی محسوس ہوئی ـــــ!

اُس کے کانوں میں رات کا سارا سناٹا در آیا تھا اور آنکھوں کے سامنے موت کا سایہ پرا پھیلتا چلا جا رہا تھا۔

اچانک ہی اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے پھوٹ پڑے ـــــ

وہ بچوں کی طرح سسکیاں لے کر رونے لگا ـــــ

بابا حیات کے حوصلہ دینے پر بالآخر وہ سنبھل گیا ـــــ پھر اچانک ہی اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس کی کایا پلٹ رہی ہو ـــــ

اُس کی رگوں میں تیرنے والے خون کی حدت اچانک ہی بڑھنے لگی تھی اور اب اُس کو بدن میں خون کے بجائے انگارے دوڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں اور سانسوں سے آگ برس رہی تھی۔

"بابا حیات تو جا ـــــ کسی سے میری آمد کا ذکر نہ کرنا۔ صغراں کو آج رات ہی شہر میں پھوپھا کے گھر پہنچا دینا ـــــ لیکن کسی بات کی گاؤں والوں کو خبر نہ ہونے دینا۔ میں زندگی بھر تمہارا احسان نہیں بھولوں گا ـــــ زندگی رہی تو اس احسان کا بدلہ ضرور دوں گا ـــــ"

اُس نے پانچ نوٹ بابا حیات کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

بابا حیات تڑپ کر رہ گیا ـــــ

قدرت نے اگر زندگی میں پہلی مرتبہ اُسے نتھو خاں کے کسی احسان کا معمولی سا شکریہ ادا کرنے کا موقع بھی دیا تو بے چارہ اتنا مجبور تھا کہ شہر تک صغراں کا کرایہ بھی نہیں خرچ کر سکتا تھا اس نے بہت "ناں ناں" کی۔

لیکن ـــــ

حنیف خاں نے زبردستی نوٹ اُس کی قمیص کی جیب میں ڈال کر اُسے اس ہدایت کے ساتھ رخصت کر دیا کہ خود کو نارمل رکھے۔

وہ جانتا تھا کہ بابا حیات جان پر کھیل کر بھی اس فرض سے کوتاہی نہیں برتے گا۔ اُسے

ابھی بہت سے کام کرنے تھے ——

آج بہت عرصے بعد اُس نے اپنے بدن میں وہی چیتے کی سی پھرتی محسوس کی جو کبھی وہ اپنے باپ کی معیّت میں سرحد عبور کرتے ہوئے رینجرز یا بی ایس ایف والوں کے گھیرے میں آنے کے بعد محسوس کیا کرتا تھا۔

بابا حیات اندھیرے کی چادر میں گم ہوا تو حنیف خاں بوجھل قدموں سے قبرستان کی طرف چل دیا ——

قبرستان پر موت کا سناٹا طاری تھا۔

رات دیر گئے تک وہ اپنی ماں کی قبر سے لپٹ کر پشیمانی کے آنسو بہاتا رہا ——

صبح کاذب کی روشنی پھوٹنے پر وہ چل دیا۔

اُس نے اندازہ کیا تھا کہ اب سرحد عبور کرنا اُس کے لئے شاید اتنا آسان نہ رہے کیونکہ دونوں طرف صیاد اُس کے لیے جال بچھائے بیٹھا تھا پھر آخر وہ اپنی لڑائی میں کب تک مکھے سانسی کے لڑکوں کو گھسیٹتا رہے گا ——

یہ جنگ اب اُسے اکیلے لڑنی تھی —— !

دشمن نے اس کے باپ کے بعد اس کی ماں کو بھی مار ڈالا تھا —— اب دنیا میں اُس کے لئے زندہ رہنے کی کون سی ایسی خاص وجہ باقی رہ گئی تھی۔ ٹھیک ہے اُس کے باپ کی مرتے دم تک خواہش تھی کہ وہ صغراں کو اپنی بہو بنا کر لے آئے —— اُس کی ماں نے اپنی زندگی ہی میں صغراں کو بہو کا رتبہ دے دیا تھا۔

لیکن ——

وہ صغراں کی خاطر اپنے والدین کے قاتلوں کو زندہ چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا؟

اس کی ماں کے قاتل کون تھے؟

اس سوال کا جواب اُسے فوراً تلاش کرنا تھا۔ محض ایک حملہ آور کا تعلق سردار مرید سے ہونے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ آنکھیں بند کر کے اس بات پر یقین کر لے ——

فضل شاہ جیسے خبیث سے کسی بھی سازش کی توقع کی جا سکتی تھی ——

خدا جانے ایک لاش وہاں جان بوجھ کر نہ چھوڑ دی گئی ہو؟ یہ بھی تو ممکن تھا کہ پہلے کی طرح اُس نے دھوکے کی چال چلی ہو اور اُن کی دشمنی کا رُخ پلوال کی طرف ہی موڑنا چاہتا ہو۔

لیکن ——

اب یہ مشکل نظر آتا تھا۔ سردار مرید یونین کونسل کا چیئرمین بن چکا تھا اور دونوں پارٹیوں نے اپنے —— مفادات پر مکمل اتفاق کرنے کے بعد ہی فضل شاہ کو اس عہدے تک پہنچایا تھا۔ گو کہ اس دوستی کی بنیاد منافقت تھی، لیکن اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔

یہ لوگ اپنے مفادات کے لئے کہاں تک گر سکتے تھے اس کا اندازہ حنیف خاں سے زیادہ اور کون لگا سکتا تھا جس نے فضل شاہ کو اتنے قریب سے دیکھا تھا۔

بابا حیات نے اُسے بتایا تھا کہ اُس کے ٹیوب ویل کے چاروں ملازم بھی غائب ہیں اور عین ممکن تھا کہ انہیں اغواء کر لیا گیا ہو۔

لیکن ——

حنیف خاں کچھ اور ہی سوچ رہا تھا اور اب اپنی سوچ کی تصدیق کے لئے ہی اُس نے جلالپور کا رُخ کیا تھا۔ جہاں اُس کے باپ کا پرانا ملازم منشی رہتا تھا۔ منشی نے ساری زندگی اُن کے ہاں گزاری تھی اور حنیف خاں کو اُمید تھی کہ اگر کچھ سچائی وہ جان سکتا ہے تو منشی ہی اُس کا مضبوط ذریعہ ہو گا —— !

جلال پور میں وہ کبھی گھوڑی پر بیٹھ کر اپنے باپ کے ساتھ آتا تو سارا گاؤں اس کے استقبال کے لئے کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔ لیکن آج وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں رات کے اندھیرے میں منشی کے گھر داخل ہوا تھا ——

گاؤں کے ایک کونے میں واقع منشی کے گھر کا دروازہ اُس نے کھٹکھٹایا اور دروازہ کھلنے پر اُسے سامنے اس کی بیٹی کی شکل دکھائی دی۔ گو کہ حنیف خاں کا حلیہ خاصا بدلا ہوا تھا لیکن رُقیہ نے اُسے پہچان لیا۔

اُس نے سہم کر حنیف خاں کو سلام کیا۔ جس نے اندر داخل ہونے پر دروازے کو کنڈی
کر بند کر دیا تھا۔

"منشی کہاں ہے"؟

اُس نے رقیہ سے اِس انداز میں دریافت کیا کہ سہمی ہوئی لڑکی کے منہ سے بے ساختہ
نکل گیا۔

"اندر ہی ہے"

"چلو میرے ساتھ۔ اپنی ماں کو بھی بلا لاؤ ــــ اور ہاں کسی کو میری آمد کی خبر نہ دینا
سمجھ گئی ہو ناں"

اُس نے رقیہ کو دبے دبے نہیں دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"ماں بھی اندر موجود ہے"

رقیہ نے کہا اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

"آجا بیٹا ــــ ہمیں تیرا ہی انتظار تھا ــــ"

اُسے اپنی پشت سے منشی کی بوڑھی بیوی کی آواز سنائی دی۔

حنیف خاں دوسرے کمرے میں داخل ہوا تو منشی کی بیوی نے لالٹین کی لو بڑھا دی۔
منشی ایک چارپائی پر اِس طرح لیٹا تھا کہ اُس کے لئے اپنے جسم کو جنبش دینا بھی ناممکن
ہو رہا تھا پھر بھی کراہتے ہوئے اُٹھا اور سرہانے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا منشی کو"؟

حنیف خاں نے اُس کی بیوی سے پوچھا۔

جواب میں بوڑھی عورت سسکیاں لے کر رونے لگی۔ حنیف خاں کے حوصلہ دلانے پر
اُس نے بتایا کہ تین روز قبل فضل شاہ کے آدمی اُسے اُٹھا کر لے گئے تھے۔ وہ لوگ منشی کی مدد سے
صغراں کو اغوا کر کے لے جانا چاہتے تھے لیکن منشی نے اُن کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا اور اُن
کے ہر لالچ کو ٹھکرا دیا جس کا نتیجہ اُس کے سامنے ہے۔

منشی کی بیوی ہی کی زبانی اُسے علم ہوا کہ تینوں ملازموں پر انہوں نے بہت ستم ڈھائے

اور اُن کی بیویوں اور بچوں کو یرغمال بنا کر اُن سے وعدہ لیا گیا وہ حملہ آوروں کے خلاف
مزاحمت نہیں کریں گے۔ منشی کی زبانی ہی اُسے علم ہوا کہ سردار مرید اور فضل شاہ کے غنڈوں
نے مل کر یہ کارروائی کی ہے وہ لوگ صغراں کو یرغمال بنا کر حنیف خاں کو سامنے لانا چاہتے
تھے تاکہ اُسے پولیس کے ہاتھ لگنے سے پہلے ہی مار ڈالیں ــــ

رات گئے تک منشی کی بیوی اور بیٹی اُس کی ماں کے سوگ میں روتی رہیں۔ انہوں
نے حنیف خاں کی بہت منت سماجت کی کہ وہ یہاں کچھ روز کے لئے رک جائے کیونکہ اس
علاقے میں قدم قدم پر اُسے جان کا خطرہ ہے۔

لیکن ــــ

حنیف خاں نے منشی کی بیوی کو کچھ پیسے دے کر رات کے دوسرے پہر ہی وہاں سے
رخصت لے لی ــــ

اُس کو اپنے دشمنوں کا علم ہو چکا تھا ــــ

اب اُسے جو کچھ بھی کرنا تھا اپنے زورِ بازو پر کرنا تھا۔ یہ بات وہ بھی جانتا تھا کہ
جب تک فضل شاہ اور سردار مرید کو موت کے گھاٹ نہیں اُتارے گا۔ ایک پل کے لئے بھی
وہ چین کی نیند نہیں سو سکے گا ــــ!!

وہ اپنے دشمنوں کو تربیت یافتہ جرنیلوں کی طرح "سرپرائز" دینا چاہتا تھا۔ اُس
کے دشمنوں کو ابھی گمان بھی نہیں تھا کہ حنیف خاں اُس علاقے میں موجود ہے ــــ انہوں
نے حنیف خاں کے ہر ممکن ٹھکانے پر اپنا جال بچھا رکھا تھا ــــ حنیف خاں کے لئے کچھ
کرنے کا یہی موقعہ تھا۔

اُسے یاد تھا کہ کبھی کبھی جب "بی ایس ایف" کو اُن کی آمد کی خبر ہوتی تو وہ ساری سرحد پر
روشنی کر کے ناکے لگا دیئے کرتے تھے لیکن نتھو خاں اِن حالات میں سرحدی پوسٹ کے پہلو سے
عبور کیا کرتا تھا۔

وہ حنیف خاں سے کہا کرتا تھا کہ دشمن کو کبھی یہ گمان بھی نہیں گزرے گا کہ جن کیلئے

اس نے چپے چپے پر جال بچھا رکھا ہے وہ دشمن اُس کے گھر میں ہی چھپا ہوا ہے۔ یوں بھی حملہ آور جب میدان میں پھیل جائیں اور وہ دشمن کو بھی خود سے کمزور سمجھتے ہوں تو اپنے گھر کی طرف اُن کا دھیان نہیں جایا کرتا ــــ !!

وہ سردار مرید کو اُس کی حویلی میں گھس کر قتل کرنا چاہتا تھا ــــ وہ اُن لوگوں پر ثابت کرنا چاہتا تھا کہ نتھو خاں کا بیٹا اُن کی توقعات سے بڑھ کر بہادر اور غیرت مند ہے اور مفروری کی حالت میں بھی وہ اپنے سر چڑھنے والا کوئی بھی قرض بمعہ سود چکانے کی ہمت رکھتا ہے۔

شبیر خان کے علاقے سے خریدا ہوا ولایتی ریوالور اور گولیوں کا پٹہ اس نے اپنے کپڑوں کے نیچے محفوظ کیا ہوا تھا۔ جس طرح اُس نے اپنی ڈاڑھی اور مونچھیں بڑھا کر اپنا حلیہ بگاڑا ہوا تھا اُسے دیکھ کر یہی گمان گزرتا تھا کہ وہ اِس علاقے کے کسی گاؤں کا کوئی "کمی کمین" ہوگا۔ اپنے دشمنوں کو مطمئن رکھنے کے لئے اُس نے وہ سارا دن پلوال کے کھیتوں میں بسر کیا ــــ شام ہوتے پر پلوال کی طرف آنے والی سڑک سے گزرتی کاروں سے اُس نے اندازہ کر لیا تھا کہ اُس کی ماں کے قتل کے بعد وہ موذی "جشنِ فتح" منانے اپنے گھروں کو واپس لوٹ رہے تھے کیونکہ انہوں نے اپنی دانست میں ہر قابلِ ذکر شمشیر نگر کے باسی کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا تھا اور ان لوگوں کی تو کوئی ضمانت کروانے والا بھی نہیں تھا۔

سردار مرید نے حال ہی میں یونین کونسل کی چیئرمینی سنبھالی تھی ــــ

انہوں نے اپنے پرانے وفادار عالم داد کی بھی سیاست کی کالی ماتا کے حضور چڑھا کر یہ رتبہ حاصل کیا تھا۔ اِس علاقے میں اِس سے زیادہ آمدنی والا کوئی سیٹ نہیں تھا گو کہ فضل شاہ کے ساتھ سرداروں کا ففٹی ففٹی کا معاہدہ ہوا تھا۔

لیکن ــــ

سردار مرید نے ایسا طریقہ ڈھونڈ لیا تھا جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ اُسے اگر اب کوئی خطرہ سیاسی طور پر تھا تو وہ تھا عالم داد ــــ

عالم داد جسے اُن لوگوں نے ریاست شاہ کے قتل کے الزام میں جیل میں قید کروا رکھا تھا۔ سرداروں کا دیرینہ رفیق تھا اُس نے کبھی تصور نہیں کیا تھا کہ سردار رشید اس جیسے محسن کے ساتھ بھی کچھ کر گزرے گا۔ فضل شاہ نے جہاں بادل نخواستہ سرداروں سے یونین کونسل کی "ڈیل" کی تھی وہاں اُس نے مستقبل کے ممکنہ خطرے، عالم داد سے بھی نجات حاصل کر لی تھی۔ اُسے سرداروں میں اگر کسی سے سیاسی طور پر کوئی خطرہ تھا تو وہ عالم داد تھا۔

عالم داد اب سردار مرید کے لئے خطرہ بنتا جا رہا تھا۔

اُس کی ملاقات کو جیل جانے والوں کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہو رہا تھا جس کا مطلب صاف ظاہر تھا کہ عالم داد کے ہمدردوں کی تعداد بڑھ رہی ہے جو سردار مرید کے لئے کوئی نیک شگون نہیں تھا۔

عالم داد جیل میں بیٹھ کر سیاست کر رہا تھا۔

اُس نے اپنے تین چار ایسے جاں نثار ساتھی پیدا کر لیے تھے جنہوں نے اُس کے ناجائز دھندے کو ففٹی ففٹی کے لالچ میں سنبھال لیا تھا اور اُس کی ہدایات کے مطابق سرداروں کے خلاف بھی سیاسی طور پر سرگرم عمل تھے۔ عالم داد نے یہ کوشش کی تھی کہ وہ اپنا کوئی ایسا پریشر گروپ کھڑا کر لے جس کی مدد سے وہ سرداروں کو ایک طرف کر کے فضل شاہ سے معاملہ طے کر لے اور جیل کی چار دیواری سے باہر آ جائے۔ بصورت دیگر تو یہ لوگ اُسے پھانسی پر لٹکائے بغیر چین سے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔

سردار مرید نے اِس خطرے کو بھانپ لیا تھا اور اپنے بڑے بھائی کی ہدایت پر ہفتے میں کم از کم دو دن اپنے گاؤں میں گزارنے شروع کر دیئے تھے تاکہ عالم داد کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھ سکے ــــ

آج بھی وہ "سب اچھا" کی خبر ملنے پر گاؤں آیا تھا ــــ

فضل شاہ کی خواہش بھی یہی تھی کہ وہ خود پلوال میں بیٹھ کر حنیف خاں کے خلاف "آپریشن" کی نگرانی کرے اور جتنی جلدی ممکن ہو اس مصیبت سے چھٹکارہ حاصل کرے۔

سردار مرید نے یونین کونسل کی ممبری سنبھالتے ہی اپنی نئی داشتہ الماس بیگم کو "بیوی" بنا لیا تھا اور آج اُس کی خواہش پر اُسے اپنے گاؤں لے کر آیا تھا جبکہ پہلی باقاعدہ بیوی اپنی سوکن کی آمد کی خبر پا کر اپنے سسرال جا چکی تھی۔

رات کا پہلا پہر بیت رہا تھا۔

سردار مرید کو اس کی نو بیاہتا نے اپنے ہاتھ سے جام تیار کر کے دیا تھا اور اب وہ اس کے زانوں پر سر رکھے خود کو راجا اندر محسوس کر رہا تھا۔

اس کے شہوانی جذبات نقطہ عروج کو چھو رہے تھے۔

اس درمیان اس نے الماس بیگم کو ہر ممکن طریقے سے ایک ہی بات سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ مستقبل کا چیف منسٹر ہے ـــ کیونکہ اس نے اپنی سیاست کا آغاز ہی بڑے بھرپور انداز میں کیا تھا اور یونین کونسل کی چیئرمین شپ پہلے ہی مرحلے پر ہاتھ آ جانے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ وہ بے حد عقل مند ذہین شخص ہے جس کے لئے ایک ایک کر کے کامیابیوں کے دروازے کھلتے چلے جائیں گے ـــ الماس بیگم نے بھی خود کو ابھی سے صوبے کی خاتون اول سمجھنا شروع کر دیا تھا اور اس کا دماغ بھی آسمانی پنگھوڑا جھولنے لگا تھا۔

خدا جانے وہ نقاب پوش آسمان سے نازل ہوا تھا، یا زمین پھاڑ کر برآمد ہوا ـــ انہوں نے تو کھڑکی کا شیشہ ٹوٹتے دیکھا جس کے ساتھ ہی ایک ہاتھ اندر آیا اس نے بجلی کی سی پھرتی سے اندر کی کنڈی کھولی اس کے ساتھ ہی نقاب پوش اندر کود گیا۔

"کہ کہ کون ہو تم ـــ"

اس پر چونکہ سب سے پہلے الماس بیگم ہی کی نظر پڑی تھی۔ اس لئے اس نے یہ سوال کر کے دریافت کیا۔

"یہ حرام خور مجھے جانتا ہے کہ میں کون ہوں؟

نقاب پوش نے اپنے منہ پر لپیٹا کپڑا اٹھا دیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں ریوالور پکڑا ہوا تھا۔

اس اثناء میں سردار مرید بھی اس اچانک آفت سے گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

"تم ـــ حنیف خاں کک کیا بات ہے تم ......"

اس کی زبان لڑکھڑانے لگی تھی۔

"شاید ابھی تک تمہارا نشہ نہیں اترا سردار مرید ورنہ تم جان جاتے کہ کیا بات ہے

تم نے کیا سمجھ لیا تھا کہ شمشیر نگر میں صرف کمی کمین ہی رہتے ہیں۔ تمہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ ابھی میں زندہ ہوں ـــ تم نے میری ماں کو مار ڈالا ـــ حنیف خاں کی ماں کو ـــ"

اس کے لہجے میں رعد کڑک رہی تھی۔

"ہم میں کچھ نہیں جانتا۔ ہم تو یہاں رہتے ہی نہیں ـــ یہ فضل شاہ کی چال ہے حنیف خاں اس نے پہلے بھی ایسے کیا تھا۔ تم جانتے ہو تمہارے باپ نے معاہدہ کیا تھا ـــ"

"بکواس مت کرو ـــ"

حنیف خاں نے اس کی بات غصے سے کاٹ دی۔

"تم تو مرنے والے ہو سردار مرید لیکن مرنے سے پہلے ایک بات سنتے جاؤ کہ فضل شاہ بھی زندہ نہیں بچے گا۔ میں تم لوگوں کو چن چن کر مار ڈالوں گا۔ تم جانتے ہو میں کس باپ کا تخم ہوں ـــ تم نے خود موت سے دوستی کی ہے۔ اب مرنے سے کیوں ڈرتے ہو۔ سردار مرید تم نے میری غیرت کو للکارا ہے۔ میں تمہاری ساری نسل ختم کر دوں گا"

اس کا خون کھول رہا تھا۔

اپنی ماں کے قاتل کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ کر اس کے لئے خود پر قابو پانا ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔

"دیکھو حنیف خاں ـــ تم اس وقت غصے میں ہو تم میری بات نہیں سمجھ رہے۔ میں بے گناہ ہوں۔ میں تو اپنے سگے بھائی سے بھی علیحدہ ہونے والا ہوں کیونکہ اس نے میری مرضی کے خلاف فضل شاہ سے معاہدہ کیا ہے ـــ"

سردار مرید جس کا سارا نشہ ہرن ہو گیا تھا ـــ موت کو سامنے دیکھ کر جس کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ اس کی منت سماجت پر اتر آیا تھا۔

"چلو ـــ میں تم دونوں کو ہمیشہ کیلئے الگ کر دیتا ہوں"ـــ

اس نے ریوالور کو فائرنگ پوزیشن میں کرتے ہوئے اس کی طرف سیدھا کیا۔

"دیکھو تم بچ کر نہیں جا سکو گے ـــ میرے مسلح آدمی ہر طرف موجود ہیں ـــ حنیف خاں ـــ حنیف خاں"ـــ

سردار مرید نے بزدلوں کی طرح ہکلاتے ہوئے الماس بیگم سے لپٹنا چاہا۔

لیکن ——

حنیف خاں نے آگے بڑھ کر اُس کی کمر میں زوردار لات رسید کی اور وہ بلبلا کر دیوار سے جا لگا۔

الماس بیگم پہلے طوائف زادی اور بعد میں کچھ اور تھی۔ اُسے سردار مرید جیسے درجنوں گدھے ساری زندگی مل سکتے تھے۔

لیکن ——

زندگی ایک مرتبہ چلی گئی تو دوبارہ نہیں مل سکتی تھی۔

"بھائی صاحب مم میرا کوئی گناہ نہیں —— مجھے تو اس کے غنڈے زبردستی اُٹھا کر لے آئے ہیں —— مولا حسین کا واسطہ مجھے کچھ نہ کہیئے ——"

اُس نے گھگیاتے ہوئے اپنی جگہ کھڑے کھڑے ہاتھ باندھے۔

سردار مرید نے اس طرح اُس کی طرف دیکھا جیسے اُس کی بات کے صدمے سے سردار مرید کا دماغ ہی خراب ہو گیا ہو۔

"اگر اپنی سلامتی چاہتی ہو تو چپ چاپ ایک طرف بیٹھی رہو —— اب تمہارے منہ سے آواز بھی نکلی تو تم بھی اس کے ساتھ ہی جاؤ گی ——"

حنیف خاں نے اُسے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا۔

سردار مرید نے اُٹھ کر کھڑے ہونا چاہا۔

لیکن ——

حنیف خاں کے ریوالور نے شعلہ اُگلا —— اُس نے سردار مرید کے سر کو نشانہ بنایا تھا۔ پہلی گولی نے ہی اُسے ڈھیر کر دیا۔ محض اپنی تسلی کے لئے اس نے سارا ریوالور سردار مُرید پر خالی کر دیا اور اُسی کھڑکی کے راستے باہر پھلانگ گیا۔

سردار مرید کے "مسلح آدمیوں" کے اُس کی خوابگاہ پر پہنچنے تک حنیف خاں اُس کی گھوڑی سمیت حویلی سے باہر جا چکا تھا ——

الماس بیگم نے سب سے پہلے اپنے زیورات اور سردار مرید کی جیب سے بٹوہ نکال
را اپنے پرس میں ڈالا تھا جس کے بعد اُس نے بین ڈالنے شروع کئے ——

"کون تھا —— کون تھا؟" ——

کسی نے چیختے ہوئے اُس سے پوچھا۔

"ہائے میں لُٹ گئی —— ہائے میرا سہاگ اُجڑ گیا۔ مجھے کیا علم تھا کہ اُن کا یہاں آنا ہی
ہیے تباہ کر دے گا —— ہائے ہم یہاں کیوں آئے —— مجھے کیا علم سردار صاحب نے شاید
سے یہاں کہا تھا۔ حنیف خاں اُس مُوذی کا نام تھا ——"

اُس نے ٹسوے بہاتے ہوئے کہا۔

حنیف خاں —— نتھو خاں کا بیٹا —— سردار مرید کو حنیف نے قتل کر دیا"

سرداروں کی حویلی کے ہر مکین کی زبان پر یہی رٹ لگی ہوئی تھی۔

چند منٹ کے اندر پلوال کے در و دیوار اس خبر سے گونج اُٹھے ——!

واہ شیر کے بچے —— واقعی تو نے نتھو خاں کا بیٹا ہونے کا حق ادا کر دیا" ——

عالم داد کے بوڑھے باپ —— صاحب داد نے بے ساختہ اُسے دل ہی دل میں
اد دی۔

روتی اور بین کرتی ہوئی عورتوں نے شہر میں موجود سردار رشید کو اس اندوھناک سانحے
ا خبر بذریعہ ٹیلی فون کر دی تھی جس نے فوراً یہ خبر فضل شاہ تک پہنچا دی تھی۔

"خس کم جہاں پاک"

فضل شاہ نے ٹیلی فون بند ہوتے ہی بڑبڑاتے ہوئے کہا —— لو بیٹا تم کرلو چیڑ ملنی ——"

وہ بڑی سفّاکی سے زیر لب مسکرا دیا ——

جہاں یہ خبر اُس کے لئے بطور سیاستدان ایک اچھی خبر نہ تھی۔ وہیں خوف کی لہر اُس
ا ریڑھ کی ہڈی میں بھی سرایت کر گئی۔

حنیف خاں سے کچھ بھی ممکن تھا ——

ان حالات میں بھی جس شخص نے سردار مرید کی حویلی میں گھس کر اُسے قتل کر دیا تھا

وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اُس کے لئے فضل شاہ کا قتل بھی کوئی مشکل بات نہیں تھی۔

اس کا شیطانی ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ بالآخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ کر مطمئن ہو لیا۔ وہ حنیف خاں کو خفیہ طور پر ملنے کا پیغام دینے جا رہا تھا۔ اُس نے سوچا کر حنیف خاں سے سردار رشید کا قتل کروانے کے بعد اُسے خود گولی مروا دے گا۔

حنیف خاں کو پیغام کس طرح بھیجا جائے؟ ——

یہی تھا وہ اہم سوال جس کا جواب اُسے تلاش کرنا تھا۔ یہ بات تو وہ جانتا تھا کہ حنیف خاں کے نزدیکی لوگوں میں سے کوئی بھی نہیں تسلیم کریگا کہ وہ کبھی اِن سے ملنے آیا ہے خواہ انہیں کچھ بھی لالچ دیا جائے ——

پھر کون سا طریقہ اختیار کیا جائے؟ ——

وہ بے چینی سے ٹہلتا ہوا سوچ رہا تھا۔ بالآخر ایک تجویز اُس کے ذہن میں آ ہی گئی۔

لیکن ——

اِس تجویز پر اسے عمل بڑی احتیاط سے کرنا تھا۔ اگر سرداروں کو معمولی شک بھی گزر جاتا کہ وہ اُن کے خلاف سازش کر رہا ہے تو اپنی ساری توانائیاں صرف کر کے بھی وہ اس کو مار ڈالتے، کیونکہ سردار مرید کی موت اُن کے لئے کوئی معمولی سانحہ نہیں تھا۔

اُن کے ہاتھ آئی چیز مینی دوبارہ نکل گئی تھی۔

اُس نے اپنی خوابگاہ میں عمر دین کو طلب کیا تھا جسے اُس کے معتمد خصوصی کی حیثیت حاصل تھی اور شاید عمر دین ہی وہ واحد انسان تھا جسے اِس بات کا بھی علم تھا کہ بڑے شاہ صاحب کی موت حنیف خاں کے ہاتھوں نہیں بلکہ فضل شاہ کے ہاتھوں ہی ہوئی تھی۔

فضل شاہ نے اُسے اعتماد میں لے کر سارا منصوبہ سمجھا دیا۔

گو کہ عمر دین کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔

لیکن ——

کبھی کبھی وہ سوچتا کہ قدرت نے ایک ہی وقت میں کتنے جانوروں کی خصلت اس شخص

پیدا کر دی ہے اور اِس درندے کو انسان کا روپ دے کر انسانوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیا ہے ——

"شاہ جی یہ کام تو سمجھیں ہو گیا۔ آپ آج ہی نذر محمد کا کیس انکوائری افسر چوہدری نظامت ہوادیں اور باقی معاملات مجھ پر چھوڑ دیں ——"

عمر دین بھی شیطان کا چیلا ہی تو تھا۔

"ٹھیک ہے شاباش —— یہ بات تو میرے دماغ میں آئی ہی نہیں۔ یہ تو اپنے گھر کا ملا ہوا ناں ——"

فضل شاہ نے مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اور ہاں جی میری ایک اور تجویز بھی ہے۔ یونین کونسل کی گدی سرداروں کے پاس ہی ہنے دیں۔ اس وقت یہ بات بہت ضروری ہے کہ اُن کا اعتماد بحال رکھا جائے۔ آپ ا مطلب سمجھ گئے ہیں ناں ——"

عمر دین نے اگلا پتہ بھی پھینکا۔

"عمر دین تم یار اچھے بھلے سیاستدان ہو گئے ہو"

فضل شاہ نے بھیانک قہقہہ لگایا۔

"شاہ جی سب آپ کی جوتیوں کے طفیل ہے —— ہم کیا اور ہماری اوقات کیا؟"

اُس نے چمچہ گیری کے انداز میں دانت نکالے۔

دونوں شیطان دیر گئے تک منصوبہ بندیاں کرتے رہے۔

نذر محمد نے کبھی قتل و غارت گری میں دلچسپی نہیں لی تھی۔ وہ بڑے دھیمے مزاج کا امن پسند انسان تھا۔

لیکن ——

جب اُسے تھانے کی حوالات میں یہ خبر ملی کہ حنیف خاں نے اپنی ماں کی قبر کی مٹی ٹنے سے پہلے اُس کا حساب بے باق کر دیا ہے تو اُس کا ڈھیروں خون بڑھ گیا۔

"واہ شیرو واہ ـــــ تو واقعی تھتو خاں کا بیٹا ہے ـــــ ٹھنڈ پڑ گئی کلیجے میں ـــــ
حوالدار! تیرے منہ میں گھی شکر" اُس نے خبر دینے والے حوالدار کو جو اُس کے نزدیکی گاؤں کا
مکین اور تھتو خاں کا بہت احسان مند بھی تھا کہا۔

نذر محمد جانتا تھا کہ دلیری میں حنیف خاں کی کوئی مثال اس علاقے میں نہیں ہے۔
بدمعاشی سے یہ لوگ اُسے زیر نہیں کر سکتے تھے۔ لے دے کر ان کے پاس صرف سیاست،
منافقت اور مکاری تھی۔ وہ جانتا تھا اس خبر کو سن کر فضل شاہ کو جان کے لالے پڑ گئے ہوں
گے اور وہ اب خاموشی سے نہیں بیٹھے گا کچھ نہ کچھ کر کے رہے گا۔

اُس روز جب عمر دین اُسے ملنے آیا تو نذر محمد کا ماتھا ٹھنکا۔

"دیکھو نذر محمد مجھے تم سے یا فضل شاہ سے کچھ لینا دینا نہیں ہے ـــــ میں تو تھتو خاں کے
سارے خاندان کی عزت کرتا ہوں اور مرتے دم تک کرتا رہوں گا۔ حنیف خاں اس خاندان
کا واحد چشم و چراغ ہے ـــــ اگر خدانخواستہ اُسے کچھ ہو گیا تو تھتو خاں کی سنتان
ہی ختم ہو جائے گی ـــــ میرے پاس ایک تجویز ہے۔ اس سے تمہاری بھی جان چھوٹتی ہے
اور معاملہ بھی ٹھیک ہو جائے گا ـــــ میں فضل شاہ کو مناؤں گا حالانکہ اُس کا بھائی قتل ہوا
ہے لیکن تمہاری خاطر میں اُسے کسی نہ کسی طرح راضی کر لوں گا ـــــ بس تم کسی کو اس بات کا علم
نہ ہونے دینا کہ فضل شاہ نے تمہاری رہائی کے لئے کام کیا ہے ـــــ اس کے عوض تم حنیف خاں
کو پابند کرو کہ وہ شاہ صاحب کی طرف منہ نہ کرے۔ جہاں تک سرداروں کا تعلق ہے تو یہ
فیصلہ تمہارے اور اُن کے درمیان ہے اس میں فضل شاہ نہیں آئے گا ـــــ نذر محمد تم نے
دھوپ میں بال سفید نہیں کئے تم کیا سمجھتے ہو کہ ایک وقت میں حنیف خاں مفرور رہ کر دو گروپوں
سے مقابلہ کر سکتا ہے ـــــ ہرگز نہیں۔ اس مہلت سے فائدہ اُٹھاؤ نذر محمد اس طرح حنیف خاں
سرداروں کو بھی مات کر دے گا اور ہاں یہ بات دماغ سے نکال دینا کہ وہ پولیس سے ساری
زندگی بچا رہے گا ـــــ اگر فضل شاہ سے دوستی ہو گئی تو میں تمہیں ضمانت دیتا ہوں کہ حنیف
خاں کو بری کروا کے ہی دکھا دوں گا ـــــ"

نذر محمد جانتا تھا کہ اس "پیشکش" کے پس پردہ خطرناک سازش ہے؟
فضل شاہ ایک تیر سے دو شکار کرنے جا رہا تھا۔ جہاں وہ ایک طرف حنیف خاں کے

لیے اپنے دیرینہ دشمنی اور سنگل کے ممکنہ خطرے سردار رشید کو مروا سکتا تھا وہاں حنیف خاں
کو بھی اس طرح چکر دے کر دھوکے سے مار سکتا تھا ـــــ

لیکن ـــــ

اُسے فی الوقت عمر دین کی ہاں میں ہاں ملانے کے علاوہ کوئی چارہ دکھائی نہیں دے
رہا تھا۔ اگر وہ فضل شاہ کی طرف سے ہونے والی یہ پیشکش ٹھکرا دیتا تو شمشیر نگر میں کوئی اُس
کی بہن کا چالیسواں کروانے کی جرأت بھی نہ کر سکتا ـــــ

اس پر قاتلانہ حملے کا پرچہ ہوا تھا اور فضل شاہ اگر چاہتا تو ایسی ایسی دفعات اُس پر
لگوا دیتا کہ پھر ساری زندگی وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہی گزار دیتا ـــــ

حالات کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے اُس نے عمر دین کی ہاں میں ہاں ملانا ہی مناسب
جانا ـــــ

لیکن ـــــ

وہ گر کر صلح نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ فضل شاہ کو خود پر شک کرنے
کا موقع دے۔

یہ بات وہ بھی سمجھتا تھا کہ عمر دین جو بظاہر اس کا ہمدرد بن کر کھڑا ہے دراصل فضل شاہ
کا ادنیٰ سا نوکر ہے اور اُسے نذر محمد یا حنیف خاں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ تجویز اُس کی
نہیں بلکہ فضل شاہ کی تھی ـــــ!

"عمر دین تم ہماری برادری کو جانتے ہو۔ ہم لوگ کٹ تو سکتے ہیں۔ جھک نہیں سکتے۔
حنیف خاں نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں ـــــ میرا اُس
سے کوئی رابطہ نہیں ہوا۔ اگر کبھی ملاقات ہوئی تو میں اُسے سمجھانے کی کوشش کروں گا کہ وہ
فضل شاہ سے علاقہ نہ رکھے ـــــ جہاں تک سرداروں کا تعلق ہے تو وہ شاید میری بات
مانے اور اس بات کی تم فکر نہ کرنا ہمارے درمیان اس معاہدے کی ہوا بھی کسی کو نہیں
لگے گی ـــــ"

لیکن یہ خیال ذہن سے نکال دینا کہ کوئی حنیف خاں کو چکر دے سکتا ہے۔ وہ بھی

نتھو خاں کا بیٹا ہے"——

اُس نے بالآخر عمر دین کو مطمئن کر دیا۔

" بس نذر محمد تم بھی اس بات کا خیال رکھنا کہ اس مسئلے میں تیری عزت اور جان دونوں
داؤ پر لگے ہیں اگر تمہاری رہائی کے بعد حنیف خاں کی طرف سے فضل شاہ پر کوئی حملہ ہوا تو
وہ مجھے برباد کر کے رکھ دے گا"

عمر دین نے بظاہر خود کو مظلوم ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

نذر محمد کو تیسرے دن رہائی مل گئی۔

طے شدہ منصوبے کے مطابق اُس کی ضمانت کے لئے نمبردار کی طرف سے درخواست دی
گئی اور وہ ضمانت پر رہا ہو گیا۔

ایس ایچ او چوہدری نظامت نے کیس خود تیار کرنا تھا۔ اُس نے "تفتیشی رپورٹ" میں
نذر محمد کو بے گناہ قرار دے دیا۔

نذر محمد گاؤں آیا تو سیدھا بہن کی قبر پر فاتحہ پڑھنے گیا تھا۔

نہلے پہ دہلا

صغراں نے بابا حیات کی بات پر صاد کیا تھا۔

وہ جانتی تھی کہ ابھی اس گاؤں میں اُس کے خاوند کے وفادار موجود ہیں جن میں سے
بابا حیات بھی تھا۔ جس نے راتوں رات صغراں کو شہر میں ولی محمد کے گھر پہنچا دیا تھا۔

ولی محمد کی شہر میں معمولی سی دکان تھی۔ وہ بھی آج ہی اصغری کے کفن دفن سے فارغ
ہو کر اپنے گھر پہنچا تھا جب صغراں کو بابا حیات وہاں چھوڑ گیا۔ ولی محمد تھا تو رشتے میں حنیف
کا پھوپھا۔

لیکن——

اُس نے کبھی نتھو خاں کو اُس کے کرتوتوں کی وجہ سے پسند نہیں کیا تھا۔

وہ بڑا محتاط اور سیدھا سادھا آدمی تھا جس کی زندگی کا مقصد ڈر ڈر کر صبح سے شام
کرنے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ گاؤں سے اُس کی دلچسپی اس حد تک ہی تھی کہ نتھو خاں اُس کا سالا
تھا اور اُس کی بیوی کبھی کبھی اپنے بھائی سے ملنے چلی جایا کرتی تھی یا پھر نتھو خاں کی بیوی تھی
جو اپنی ساری زندگی گاؤں کی کوئی نہ کوئی سوغات بھیجتی رہی۔

ولی محمد جانتا تھا کہ صغراں کے یہاں تک پہنچنے کے پیچھے کتنی ہی کہانی ہے——!

وہ خود ڈرا اور سہما ہوا تھا کہ کہیں پولیس کا عذاب اس پر بھی نہ آجائے۔ اُس نے یہ
بھی چاہا کہ صغراں کو اپنے گھر سے نکال دے۔

لیکن——

اُس کا دل یہی چاہتا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو صغراں جلد از جلد یہاں سے چلی جائے۔

وہ سرداروں اور فضل شاہ سے متعلق کسی غلط فہمی یا خوش فہمی کا شکار نہیں تھا اور جانتا تھا کہ صغراں ہی اُن کے ہاتھ میں ترپ کا ایسا پتّہ ہے جب چاہیں پھینک کر حنیف خاں کو دھوکا دے سکتے ہیں۔

شمشیر نگر میں جن لوگوں نے نتھو خاں کے گھر پر حملہ کیا تھا وہ اُس کی بیوی کو قتل کرنے نہیں آئے تھے بلکہ صغراں کو اغوا کرنے آئے تھے تاکہ اُسے اپنے پاس یرغمال بنا کر حنیف خاں کو اپنے جال میں پھنسنے پر مجبور کر دیں۔

عین ممکن تھا اب وہ لوگ صغراں کی تلاش میں یہاں تک پہنچ جاتے —— !

بابا حیات تو اُسے چھوڑ کر انہیں قدموں پر واپس لوٹ گیا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گاؤں میں کسی کو بھی اُس پر شک گزرے۔

ولی محمد نے بادلِ نخواستہ صغراں کو سینے سے لگا کر پیار کیا تھا جبکہ اُس کی بیوی تو پرمٹی جا رہی تھی۔

جس خوف کا سامنا ولی محمد کو تھا۔ اُس تلخ حقیقت کو حنیف خاں نے بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔ وہ جانتا تھا اُس کا پھوپھا ایک کمزور اور غریب آدمی ہے اور اپنے دشمنوں سے اُسے ہر کمینگی کی توقع تھی۔ اُن لوگوں کو جب علم ہوا ہوگا کہ صغراں غائب ہے تو انہوں نے پاگل کتوں کی طرح اُس کا تعاقب شروع کر دیا ہوگا۔

اِس سے پہلے کہ یہ خونخوار کتّے صغراں تک پہنچتے وہ راتوں رات اپنے پھوپھا کے ہاں پہنچ گیا پہلے تو اُس کی شکل پر نظر پڑتے ہی ولی محمد کے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔ اِس کا دل دھک سے رہ گیا۔

لیکن ——

جب اُسے علم ہوا کہ حنیف خاں راتوں رات اُسے یہاں سے نکال کر لے جائے گا تو اُس کے دل کو اطمینان ہوا۔

"پھوپھا گھبرانا نہیں۔ بس ایک کام تم کر دو —— اس وقت نکاح خواں کا بندوبست اور ہمارا نکاح پڑھا دو۔ کم از کم میرے ماں باپ کی روحوں کو یہ سکون تو مل جائے"

حنیف خاں نے کہا۔

ولی محمد نے پس و پیش کرنا چاہا واقعی یہ معاملہ اس کے بس سے باہر تھا۔

لیکن ——

اُس کی بیوی آڑے آ گئی۔

وہ نتھو خاں کی بہن تھی ——

حنیف خاں نے ہزار ہزار کے کئی نوٹ ولی محمد کے ہاتھ میں تھما کر تو اُسے خاصا بہادر کر دیا تھا پھر بھی احتیاطاً اُسی کی پھوپھی دونوں کو راتوں رات شہر کے دوسرے حصے میں اپنے شادی شدہ بیٹے کے گھر لے گئی جس نے حنیف خاں کی طرف سے ملنے والے نوٹوں اور اللہ کی مدد کے سہارے یہ معاملہ بھی نمٹا دیا۔

دونوں کا نکاح باقاعدہ پڑھا گیا۔

اپنی پھوپھی کے اصرار پر اُس نے سہاگ رات اُس کے بیٹے کے گھر میں منائی اور اگلے روز اپنی بیوی کے ساتھ اپنے ٹھکانے کی طرف چل دیا۔

اُس نے کسی کو بھی ممکنہ ٹھکانے سے آگاہ نہیں کیا تھا۔

اس مرحلے پر وہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

دوسرے شہر میں جب وہ گھر پہنچا تو نذیرا اُس کا بے چینی سے منتظر تھا۔

"اتنے دن کہاں لگا دیئے —— یہ کون ہے"؟

اُس نے چھٹتے ہی دو سوال پوچھ ڈالے۔

حنیف خاں کے لئے یہ امر باعث اطمینان تھا کہ وہ اِس گھر میں اِس وقت اکیلا ہے۔

"اس کو لانے میں اتنے دن لگ گئے۔ یہ تیری بھابھی ہے صغراں ——"

اُس نے اپنی بیوی کا تعارف کروایا۔

نذیرے موچی نے کمال اداکاری سے صغراں کے لئے نیک تمناؤں کا اظہار کیا اور فوراً بازار جا کر اُن کے کھانے پینے کے لئے بہت سی چیزیں لے آیا۔ اُس نے شام تک صغراں کی معصومیت کا بھرپور فائدہ اٹھا کر اُسے اِس بات کا قائل کر لیا تھا کہ وہ انتہائی وفادار اور ہمدرد

انسان ہے۔

یہی تھا وہ پہلا تاثر جو صغراں نے اُس سے متعلق قائم کیا۔

رات کو جب حنیف خاں اور نذیرا دوسرے کمرے میں اکیلے بیٹھے تھے اور صغراں
کے لئے ہانڈی روٹی تیار کر رہی تھی تو حنیف خاں نے بے اختیار پوچھ لیا۔

"شریفاں کہاں گئی؟"

"جہاں اُسے جانا تھا!"

نذیرے نے فی البدیہہ جواب دیا۔

"میں سمجھا نہیں ــــ تم کیا کہہ رہے ہو"؟

حنیف خاں کو واقعی سمجھ نہیں آئی تھی۔ اِس نے اپنی دانست میں یہی سوچا تھا کہ شا
نذیر موچی نے اُس کی ناراضگی ختم کرنے کے لیے لڑکی کو ماں باپ کے پاس بھیج دیا ہے۔

"یار اس میں سمجھنے والی کیا بات ہے؟ جو عورتیں اپنے یاروں کے لئے ماں باپ
عزت پر لات مار کر آجائیں وہ کہا جاتی ہیں ــــ وہ کوئی گھریلو سگھڑ عورت تو تھی نہیں
بدمعاش عورت تھی۔ میں نے اپنا موج میلہ کر کے اُسے آگے روانہ کر دیا۔ اپنے حصے
پیسے وصول کر لئے۔ آخر تمہارے بعد گھر کا خرچ بھی تو چلانا تھا۔ پانی کی موٹر لگائی تھی
نلکے میں تو سارا دن پانی آتا نہیں۔ یوں بھی وہ میری کوئی منکوحہ تو تھی نہیں۔ نہ ہی
زندگی ایسی عورتوں کو کوئی پلے سے باندھ کر رکھتا ہے ــــ"

اُس نے ڈھکی چھپی رکھے بغیر ساری بات کہہ دی۔

ایک لمحے کے لئے تو حنیف خاں کا دل بھی چاہا کہ اس کا گلہ دبا کر ابھی قصہ ختم کر
لیکن ــــ

حالات نے آج اُسے پہلی مرتبہ ایسی بے غیرتی پر مجبور کیا کہ وہ مسکرا کر چپ ہو رہا

"دیکھو یار حنیفے۔ میرا تمہارا زندگی بھر کا ساتھ ہے۔ میں نے کبھی تمہارے دھندے
اعتراض نہیں کیا تم میرے پر نہ کرنا۔ میرے خیال سے اس طرح ہم دونوں کا گزارہ ہو سکتا
ہے ــــ"

اُس نے حوصلہ پا کر اگلی بات بھی کہہ دی۔

حنیف خاں نے اُس روز ایک فیصلہ بہر حال کر لیا تھا کہ اُسے جلد از جلد نذیرے سے
بھی جان چھڑانی چاہیئے۔ لیکن ابھی اِس کا وقت نہیں آیا تھا۔ اُس نے صغراں کی ذمہ داری
کا بوجھ جب اپنے کندھوں پر ڈالا تھا خواہ مخواہ خود کو بزدل سا محسوس کرنے لگا تھا۔

یوں بھی ابھی اُسے کچھ اور حساب بے باق کرنے تھے۔

اِس نے صغراں کو بھی نذیرے سے متعلق کوئی ہدایت دینا اِس لیے مناسب نہ جانا کہ اُس
طرح خواہ مخواہ اُس کے شک میں مبتلا ہونے کا خطرہ موجود رہتا۔ فی الوقت اُس کے پاس صغراں
کو چھپائے رکھنے کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ پندرہ بیس روز اسی طرح گذر گئے۔

ساری زندگی نہ محنت مزدوری اِس نے کی تھی نہ ہی نذیرے نے ــــ دونوں جمع پونجی
ہی کھاتے رہے۔

"حنیفے۔ تمہارے پاس کوئی قاروں کا خزانہ نہیں ہے۔ ہم دونوں مفرور اور اشتہاریوں کی
زندگی بسر کر رہے ہیں ایسی زندگی میں قدم قدم پر پیسے کی ضرورت رہتی ہے۔ خدا معلوم کس جگہ سے
کب ہمیں بھاگ کر کہاں پناہ لینی پڑے۔ میری بات مانو تو تمہارے لیے ایک شاندار دھندہ ہے
میرے پاس"؟

اِس روز جب نذیرے نے کہا تو واقعی اُسے احساس ہوا کہ وہ تو اب اپنی صغراں میں ہی
زیادہ دلچسپی لینے لگا تھا۔

"کیا"؟

اُس نے بے چینی سے پہلو بدل کر پوچھا۔

"آجکل تو یہ سالے سکولوں کالجوں کے لونڈے سڑکوں پر بسیں اور پٹرول پمپ لوٹ
رہے ہیں تو ہم کیا یہ بھی نہیں کر سکتے"؟

نذیرے نے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

"لیکن اِس کے لئے مقامی حالات سے واقف ہونا ضروری ہے نذیرے ــــ ہر کام

کے کچھ اصول ہوتے ہیں"۔

اس نے نیم دلی سے کہا۔

"یار ایک تو مجھے سمجھ نہیں آتی۔ عورتوں کا دھندہ تم مجھے کرنے نہیں دیتے۔ چوری چکاری تم نہیں کرنا چاہتے تو پھر کرو گے کیا؟ تو تم یار! ایسے شریف بن رہے ہو جیسے ساری زندگی مسجد میں اذان دیتے ہوئے یہاں آ گئے ہو۔ آخر اپنے باپ کے ساتھ مل کر تم نے چوری ہی کی ہے۔ کیا ہوا سرحد کے اس پار یا اس پار —— اب میں تمہاری مرضی کا کام کہاں سے لاؤں —— تم حالات کو سمجھ نہیں رہے ہمارے پاس اگر نوٹ نہ رہے تو ہم کہیں کے نہیں رہیں گے —— مجھے تو لگتا ہے کہ شادی نے تمہیں بزدل بنا دیا ہے"۔

نذیرے کی آخری بات تازیانے کا کام کر گئی۔

حنیف خاں بپھر گیا۔

اس نے واقعی حنیف خاں کو بہت بڑا طعنہ دے کر اس کی غیرت جگا دی تھی۔

"نذیرے خبردار کبھی میری مردانگی پر حملہ نہ کرنا —— کیا چاہتے ہو تم بتاؤ میں کرنے کو تیار ہوں"۔

حنیف خاں نے غصے اور اعتماد سے کہا۔

"یہ ہوئی ناں مردوں والی بات۔ میں نے یہاں تین چار مہینے رہ کر جھک نہیں ماری اور گرد کی ساری خبر رکھتا ہوں۔ یہاں سے پندرہ بیس میل دور ایک پٹرول پمپ پر نظر ہے میری —— وہاں سے شام کو پٹرول پمپ کا منشی رقم کا تھیلا لے کر موٹر سائیکل پر شہر میں اپنے مالک کو جس کے اور بھی کاروبار ہیں شام تک کی آمدنی پہنچانے آتا ہے۔ اگر تم میرا ساتھ دو تو ہم آسانی سے اسے قابو کر لیں گے —— تیس چالیس ہزار سے کم کیا ہوگا اس کے پاس ——"

نذیرے نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے —— میں تیار ہوں"۔

اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا ——

اگلے روز سہ پہر کو دونوں ایک لاری پر بیٹھ کر اس جگہ کی طرف چل دیئے جس کی نشاندہی نذیرے نے کی تھی۔

نذیرے نے اسے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ اس نے واقعی تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد منصوبہ بنایا تھا۔ یہاں سے ایک چھوٹی سڑک شہر کو جاتی تھی اور پٹرول پمپ مضافاتی علاقے میں قائم تھا۔ نذیرے نے اسے بتایا تھا کہ وہ کسی جگہ منشی کو رسی باندھ کر روک سکتے ہیں۔ جہاں سے اس کی مشکیں کس کر اسے یہیں پھینک کر وہ اس کی موٹر سائیکل کے ذریعے بھاگ سکتے ہیں۔

حنیف خاں نے اس کے منصوبے کا بڑی تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا تھا اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اس میں کامیابی کے خاصے امکانات ہیں۔

حنیف خاں کے لئے گو اس نوعیت کی ڈکیتی کا یہ پہلا تجربہ تھا۔

لیکن ——

وہ بہت با اعتماد تھا۔

نذیر موچی نے پہلے سے ہی تمام ممکنہ خطرات پر نظر رکھی تھی۔ دونوں موٹر سائیکل آسانی سے چلا سکتے تھے۔ انہیں بس یہاں سے تھوڑے فاصلے تک ہی جانا تھا جس کے بعد وہ دوسرے راستے سے شہر واپس پہنچ جائے ——!

پٹرول پمپ کے منشی نے اپنی دانست میں شہر جانے کے لیے یہ بڑا محفوظ شارٹ کٹ تلاش کیا تھا۔ یہ راستہ فاریسٹ کالونی سے گزر کر جاتا تھا اور معمول کے راستے سے آدھا گنا کم تھا۔

آج بھی وہ معمول کے مطابق سارے دن کی جمع پونجی ایک کنوس کے تھیلے میں رکھے۔ آنے والے مصائب سے بے نیاز معمول کے مطابق موٹر سائیکل پر جا رہا تھا جب فاریسٹ کالونی سے بمشکل ایک فرلانگ پہلے والے موڑ پر آیا تو اسے دو درختوں کے درمیان ایک رسی بندھی نظر آئی جن پر سرخ رنگ کے کپڑے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی بندھے تھے۔

اس کا بظاہر مطلب یہی تھا کہ فاریسٹ کالونی میں کوئی کام ہو رہا ہے اور ان لوگوں نے احتیاطاً راستہ بند کر رکھا ہے۔

شام کا ملگجا اندھیرا سیاہی میں ڈھلنے لگا تھا جب منشی نے موٹر سائیکل روکی اور چاہا کہ

اُتر کر آگے کی صورتحال کا جائزہ لے یا پھر واپس لوٹ کر دوسرے راستے سے شہر جائے ___

ابھی اُس کی موٹر سائیکل بمشکل بند ہی ہوئی تھی جب اچانک ہی موٹے سے تنے والے ایک درخت کی عقب سے دو نقاب پوش برآمد ہوئے جن میں سے ایک نے اُس کی طرف پستول تان رکھا تھا

"خبردار ___ اپنی جگہ سے نہ ہلنا۔"

حنیف خاں کی ایک ہی دھمکی سے منشی کی گھگی بندھ گئی۔

"کک کک کیا بات ہے۔ تم تم کون ہو؟"

اس نے ہکلاتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں دریافت کیا۔

"چپ۔ خبردار جو آواز نکالی۔ منہ دوسری طرف کر دو۔"

اِس مرتبہ حنیف خاں نے اُسے زور سے ڈانٹا تھا کہ بے چارہ دھان پان سا منشی ھل کر رہ گیا۔ بے اختیار چابی والے کھلونے کی طرح اس کی گردن دوسری طرف گھوم گئی۔

حنیف خاں نے پھرتی سے اُس کی کمر پر لات رسید کی تو منشی اوندھے منہ زمین بوس ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ اُس کے منہ سے چیخ نکلے۔ نذیرے نے اُس کی گردن پر گھٹنا ٹکا دیا اور اُس کے کندھے پر دوسرے بڑے سے کپڑے سے اُس کا منہ باندھ دیا۔

اسی اثنا میں وہاں بندھی رسّی سے حنیف خان نے اُس کے ہاتھ اور پاؤں بھی باندھ دیئے۔ منشی نے جس کی خوف کے مارے پہلے ہی زبان گنگ ہو چکی تھی چپ چاپ اپنے ساتھ یہ ہر برداشت کر لیا اور حنیف خاں نے اُسے کندھے پر بوری کی طرح اُٹھا کر سڑک کے کنارے درختوں کے پیچھے رکھ دیا۔

اس دوران نذیرا موٹر سائیکل سٹارٹ کر چکا تھا۔ تھیلہ حنیف خان نے قابو کر لیا اور موٹر سائیکل کو وہ نہر کی پٹڑی کے کنارے بھگانے لگا۔ قریباً ڈیڑھ میل دور جا کر اُس نے موٹر سائیکل نہر میں پھینک دی اور دونوں پیدل ہی فاریسٹ کالونی کی طرف چل دیئے۔

انہوں نے کالونی کے باہر کا ایک لمبا چکر کاٹا اور پہلے سے طے شدہ دو مختلف راستوں سے شہر کے ریلوے اسٹیشن تک دو مختلف بسوں کے ذریعے پہنچ گئے۔ جہاں سے وہ ایک

تانگے پر بیٹھ کر اپنے محلّے سے نزدیکی علاقے میں اُتر گئے اور وہاں سے پیدل اپنے گھر آگئے۔

"کیوں حنیف خاں کیسا رہا کاروبار۔"

نذیرے نے استفہامیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

"واہ نذیرے ___ یار تو نے تو کمال ہی کر دیا۔"

حنیف خاں نے اسے توصیفی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ابھی تو نے دیکھا ہی کیا ہے حنیفے ___ آگے آگے دیکھنا ___ بس میرے مشوروں پر عمل کرتے رہو۔ دنوں میں کروڑپتی بنا دوں گا پھر اس شہر کی کوئی بڑی سی کوٹھی خرید کر اپنا نام بدل کر ساری زندگی نوابوں کی طرح ٹھاٹھ باٹ سے گزارنا ___"

نذیرے کی گردن کچھ زیادہ ہی پھول گئی تھی۔

آٹھ دس روز تک انہوں نے جی بھر کے عیاشی کی۔ اِس درمیان حنیف خاں اپنی نوبیاہتا کو دوسرے بڑے شہر میں "ہنی مون" منانے لے گیا اور نذیرے نے گھر پر ہی ایک فاحشہ سے رنگ رلیاں منانی شروع کر دیں۔

یہ غریب اور سفید پوش لوگوں کا علاقہ تھا۔

قریباً تمام لوگ اِس علاقے میں دوسرے شہروں سے آکر قیام پذیر ہوئے تھے پہلے پہل وہ یہاں صرف مزدوری کے لیے آئے تھے پھر اپنا گھر بار بھی یہیں منتقل کر لئے۔

یہ لوگ صبح سے شام تک کاروبارِ حیات میں اس قدر اُلجھ جاتے کہ انہیں ایک دوسرے کے متعلق کچھ علم ہی نہیں ہو پاتا تھا۔ یوں بھی ابھی اِس محلّے میں لوگوں نے ایک دوسرے سے بے تکلف ہونا شروع نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کسی کو علم نہ ہو سکا کہ یہاں کون آتا ہے؟ اور کون جاتا ہے؟

اگر کسی نے نوٹس بھی لیا تو یہی سمجھا ہو گا کہ یہ لوگ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ قیام پذیر ہیں۔

کراچی آئے آج انہیں آٹھواں دن تھا جب اچانک ہی صغراں نے اُس سے پوچھا۔

"کچھ گاؤں کی بھی خبر ہے ___ خدا جانے میرے باپ پر کیا گزر رہی ہو گی۔"

حنیف خاں نے گاؤں کو بھلایا تو نہیں تھا۔

اِس کی تو ایک ایک سانس وہیں اٹکی تھی۔

فی الوقت اگر اس نے شمشیر نگر کو نظرانداز کیا ہوا تھا تو صرف اِس لئے کہ سردار مرید کے قتل

کے بعد اُٹھنے والے طوفان کی گرد کچھ بیٹھ جائے تو وہ اگلا لائحہ عمل اختیار کرے ___

لیکن ___

اُسے اچانک ہی خیال آیا کہ واقعی اِس کے ماموں نذر محمد کی زندگی تو ان لوگوں نے جہنم بنا دی ہوگی۔ اُسے سب سے پہلے اپنے ماموں کی فکر کرنی تھی۔ جس کے ذریعے وہ گاؤں میں اپنی جائیداد فروخت کر سکتا تھا۔ ورنہ عین ممکن تھا کہ فضل شاہ کچھ دنوں بعد ہی اِس کی جائیداد ہی بحق سرکار ضبط کروا دیتا۔ ابھی تک کم از کم وہ اِس صدمے سے محفوظ تھا۔

"ہاں تم نے ٹھیک کہا ہے کہ ماموں کی خبر لینی ہی چاہیئے"

اور ___

اگلے ہی روز وہ اپنے ٹھکانے پر واپس آگئے۔

صغراں کو نذیرے کے ساتھ گھر پر چھوڑ کر وہ ایک مرتبہ پھر اکیلا ہی شمشیر نگر کی طرف جا رہا تھا۔ اِس مرتبہ پھر وہ اپنے گاؤں میں چوروں کی طرح داخل ہوا تھا۔

اُس نے گاؤں کے باہر ہی بڑے معصومانہ انداز سے یہ خبر حاصل کر لی تھی کہ نذر محمد ضمانت پر گاؤں آ گیا ہے اور ضمانت بھی نمبردار احمد یار نے کروائی تھی۔

پہلے تو اُسے اِس بات پر حیرت ہوئی کہ یہ سب کچھ کیسے ممکن ہو گیا؟ سرداروں اور فضل شاہ کی موجودگی میں تو نذر محمد کی ضمانت کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ پھر اُس کے دل نے گواہی دی کہ یقیناً یہ بھی دشمنی کی کوئی چال ہی ہوگی۔

اپنے گھر پہنچ کر اُس کے اِس شبہے کی تصدیق بھی ہو گئی۔

نذر محمد نے اُسے گلے لگاتے ہی بچوں کی طرح رونا شروع کر دیا تھا۔ حنیف خاں نے اُسے تسلی دے کر خاموش کروایا تو نذر محمد نے نارمل ہونے کے بعد تمام واقعات اسے سنا دیئے۔

"حنیف خاں تم جو بات کہنے والے ہو میرے دماغ میں بھی یہی بات ہے۔ مجھے بھی یہی شک ہے کہ اِس کے پیچھے فضل شاہ کی کوئی شرارت ضرور ہوگی۔ لیکن اِس مرتبہ ہم اُس کے ساتھ سیاست کریں گے۔ سالے نے خود کو سمجھ کیا رکھا ہے ___"

نذر محمد نے اُس کے تبصرے سے پہلے ہی اُس کے دل کی بات کہہ دی۔

"ہم اُس کے ساتھ کیا سیاست کر سکتے ہیں ماما"

حنیف خان نے بد دلی سے کہا۔

"ہے ایک بات۔ ہمیں اس مہلت سے فائدہ اُٹھا کر تمہاری جائیداد کا مسئلہ نمٹا لینا چاہیئے"

نذر محمد نے اُس کے دل کی بات کہہ دی تھی۔

واقعی اُس کے لئے یہ بڑا جان لیوا مسئلہ تھا۔

دونوں ماموں بھانجے کے درمیان ایک معاہدہ طے پا گیا تھا۔ جس کے تحت حنیف خان نے اپنی زمین کا مختار نامہ اپنے ماموں کو مکمل اختیارات کے ساتھ منتقل کر دیا تھا۔ اِس طرح اُس کے دل پر پڑا بھاری بوجھ اُتر گیا تھا۔

ماموں نذر محمد کی چار جوان بیٹیاں ابھی بیاہنے والی تھیں اور اُن کا ذریعہ آمدن اُن کی تھوڑی سی زمین کے سوا کچھ نہیں تھا۔ نتھو خاں زندہ ہوتا تو وہ خود اُس کی ساری بیٹیاں بیاہ دیتا۔

لیکن ___

اب حالات کا دھارا اُن سب کو مخالف سمت بہہ رہا تھا۔

حنیف خاں کے لئے نذر محمد نے سارے کاغذات چوری چھپے تیار کروا رکھے تھے۔ جن پر اُس نے پرانی تاریخوں میں حنیف خاں کے دستخط کروا لیے اب وہ اپنے اگلے مشن کا ایک مرحلہ مکمل کر چکا تھا۔

فی الوقت اُسے یہ سارا کام فضل شاہ کو دھوکے میں رکھ کر ہی کرنا تھا۔

اور ___

اُس نے ایسا ہی کیا۔

اُس رات شمشیر نگر میں صبح ہونے تک نمبردار احمد دین کے گھر نذر محمد اور حنیف خاں کی بیٹھک چلتی رہی۔ جائیداد خریدنے کے لیے احمد دین تیار ہو گیا۔

تینوں نے اِس بات کا عہد کیا تھا کہ جائیداد کی احمد دین نمبردار کے نام منتقلی تک وہ

اِس بات کا کسی کو کانوں کان ہوا بھی نہیں لگنے دیں گے۔

اِس مرتبہ جب صبح کاذب کی روشنی پھوٹنے سے پہلے حنیف خاں نے اپنے والدین کی قبروں پر فاتحہ پڑھ کر اپنے گاؤں کو الوداع کہا تو اُس کا دل دھک سے رہ گیا۔

وہ بڑی حسرت بھری نظروں سے اپنے آباؤ اجداد کی اُس حویلی کو آخری لمحے تک دیکھتا رہا جس میں کبھی نتھو خاں علاقے کے سردار کی حیثیت سے بیٹھا کرتا تھا۔

اُس روز زندگی میں پہلی مرتبہ اُسے اِس تلخ حقیقت کا شدت سے ادراک ہوا کہ مروجہ سیاست میں ٹانگ اُڑانے سے وہ چور ہی بنا رہتا تو بہتر تھا۔ یہ سارا عتاب اس پر گندی سیاست میں داخل ہونے کے بعد ہی نازل ہوا تھا۔

اُسے اِس لفظ سے بھی گھِن آنے لگی تھی۔

اُس کا بس چلتا تو اپنے علاقے کے سارے سیاستدانوں کو جو غریب اور اَن پڑھ عوام کو اپنی ہوسِ اقتدار کی ڈگڈگی پر بندر کا ناچ نچاتے رہتے تھے قطار میں کھڑے کر کے گولی مار دیتا۔

لیکن ——

وہ بے بس تھا۔

یوں بھی یہ موذی حشرات الارض کی طرح چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے اور اَن کو ختم کرنا اب کسی کے لئے بھی ممکن نہیں رہا تھا۔

بھیگی آنکھوں اور بوجھل دل کے ساتھ اس نے اپنے گاؤں کو الوداع کہا تھا اور اپنے ماموں نذر محمد سے کہا تھا کہ وہ جایئداد سے حاصل ہونے والی تمام رقم لے کر اپنے خاندان سمیت یہاں سے نکل جائے اور کسی بڑے شہر میں آباد ہو کر زندگی کے باقی دِن آرام سے بسر کر لے ——!!

اُس نے اپنے باپ کی تربیت کے پیشِ نظر اپنے ماموں کو بھی اپنے ایڈریس سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ کبھی وہ پولیس کی گرفت میں آ جاتا اور حنیف خاں کو لینے کے دینے پڑ جاتے البتہ اس نے نذر محمد سے یہ ضرور کہا تھا کہ وہ ولی محمد سے رابطہ رکھے اور وہ اُس کے ذریعے اُن سے آن ملے گا۔

نذر محمد نے اُس کی بڑی منت سماجت کی تھی کہ اِس زندگی پر لعنت بھیج کر وہ بھی اُن کے ساتھ ہی آ جائے اور باقی زندگی گمنامی میں گزار دے۔

لیکن ——

اِس بات کا علم حنیف خاں کو اچھی طرح تھا کہ یہ اُس کے لیے ممکن نہیں رہے گا یوں بھی اُسے اپنی فطری جبلّت پر کنٹرول حاصل نہیں رہا تھا۔ وہ جانتا تھا جب تک فضل شاہ کو کیفرِ کردار تک نہ پہنچا دے ایک لمحے کے لئے بھی سُکھ کا سانس اُسے نہیں آئے گا۔

اُس کے باپ کی روح تب تک بے چین رہے گی ——

حنیف خاں کی روانگی کے اگلے ہی روز نذر محمد چوری چھپے عمر دین سے جا ملا۔ اِس نے عمر دین کو بتا دیا کہ کل حنیف خاں اُسے ملنے آیا تھا اور اُس نے فضل شاہ کی پیشکش مان لی ہے ——

"کہاں ہے وہ آج کل"؟

عمر دین نے بے چینی سے پوچھا۔ بظاہر اُس نے یہ سوال اِس طرح کیا تھا جیسے اُس کا بڑا خیرخواہ ہو ——

"عمر دین —— تم جانتے ہو وہ کس باپ کا بیٹا ہے۔ میں نے درجنوں مرتبہ کرید کرید کر اُس کا ایڈریس پوچھنا چاہا لیکن اُس نے سختی سے مجھے ڈانٹ دیا کہ میں اب دوبارہ یہ سوال نہ کروں —— تم نہیں جانتے عمر دین میری بیٹی بھی اُس کے پاس ہے خدا جانے وہ کس حال میں ہے؟ کہاں ہے؟ ہمیں تو خود اس کی کوئی خبر دینے والا نہیں رہا۔

نذر محمد نے اُس سے بھی زیادہ ہوشیاری دکھائی اور مظلومیت کی تصویر بن گیا۔

"نذر محمد —— میرا مطلب تھا کہ آخر وہ ہمارے جگری یار کا بیٹا ہے۔ اس وقت فضل شاہ بڑے عہدے پر فائز ہے میں اس صلح کے بدلے فضل شاہ کے ذریعے اُس کی رہائی کی کوشش کر سکتا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ اگر وہ سردار رشید کا صفایا کر دے تو فضل شاہ اُس کی مکمل حمایت کرے گا اور اُس کی رہائی کے لئے بھی سر دھڑ کی بازی لگا دے گا —— تم میرا مطلب سمجھتے ہو ناں —— دیکھو بھائی ہم ایک ہی برادری کے ہیں۔ ہمارے درمیان کون سا پردہ ہے۔

اس کے علاوہ حنیف خاں کی جان بچتی نظر نہیں آتی ـــــ تم یہی سوچو آخر کب تک وہ مفرور کی زندگی گزارے گا۔ پھر تمہاری بیٹی یعنی اُس کی بیوی بھی ساتھ ہے۔ اُسے کہاں کہاں لیے پھرے گا۔ اکیلا مرد تو کوئی بات نہیں ـــــ عورت ذات کا ساتھ اس زمانے میں ذرا مشکل ہی سے گزارہ ہوتا ہے ـــــ میری بات سمجھ گئے ناں ـــــ

عمر دین نے اپنی دانست میں اُسے بے وقوف بنالیا تھا۔

اور ـــــ

نذر محمد نے بھی تاثر دیا جیسے وہ اُس کے پنجے میں آگیا ہے۔

ہاں بھائی عمر دین تمہاری بات تو بالکل صحیح ہے۔ میں اُسے ضرور اس بات کا قائل کرلونگا بلکہ میں کوشش کروں گا کہ کسی طرح اُس کو فضل شاہ سے ملاقات کے لیے بھی تیار کرلوں ـــ اور مجھے اُمید ہے وہ میری بات مان جائے گا" ـــ

اس نے عمر دین کی تسلی کروادی ـــــ

" نذر محمد تو ایک مرتبہ حنیف خاں کو تیار کرلے۔ باقی سب کچھ مجھ پر چھوڑ دے۔ اور یہ بات بھی یاد رکھنا۔ میں اُسے گر کر صلح نہیں کرنے دوں گا ـــــ برابری کی بنیاد پر بات ہو گی۔ آخر ہم بھی ذات برادری والے لوگ ہیں اور حنیف خاں کوئی معمولی آدمی نہیں۔ نتھو خاں کا بیٹا ہے ـــــ نتھو خاں کا بیٹا"

عمر دین نے بڑے جوش سے کہا۔

نذر محمد دل میں اُس کی بے وقوفی پر ہنس رہا تھا کہ اپنی دانست میں عمر دین نے اُسے گدھا بنالیا ہے۔

وہ جانتا تھا کہ ایک مرتبہ اگر فضل شاہ اور حنیف خاں کا آمنا سامنا ہو گیا تو حنیف خاں کو دنیا کی کوئی طاقت اُس کے ہاتھ سے نہیں بچا سکے گی۔

فضل شاہ بڑا مکّار بدمعاش تھا۔

اُس نے اندازہ کرلیا تھا کہ لڑائی سے تو حنیف خاں کو زیر نہیں کرسکے گا۔ اس لئے اُس نے مکاری کا یہ جال پھیلایا تھا۔ ایک مرتبہ اگر [illegible] اس جال میں اُلجھ جاتا تو پھر کبھی

سے باہر نہ نکل سکتا ـــــ

نذر محمد کو علم تھا کہ اگر وہ کبھی حنیف خاں کو دل سے بھی اس صلح کے لئے تیار کرلیتا تو بھی شاہ اُسے دھوکے سے مار دیتا۔

اُس نے عمر دین سے وعدہ کیا تھا کہ جس روز بھی اب حنیف خاں ملنے آیا وہ ہر ممکن ش کرے گا کہ اس کی ملاقات عمر دین سے ہو جائے۔

اس نے عمر دین کے اعتماد کے غبارے میں اتنی ہوا بھر دی تھی کہ عمر دین نے اس ملاقات لے ہی روز فضل شاہ کو شہر جاکر مبارکباد دیتے ہوئے کہا تھا۔

"شاہ جی ـــــ بس چند دنوں کی بات ہے آپ کے راستے کے دونوں کانٹے صاف یں گے ـــــ سردار رشید تو حنیف خاں کے ہاتھوں مارا جائے گا اور حنیف خاں کا م" آپ کے ہاتھوں ہو جائے گا"

اپنی بات کے اختتام پر اُس نے فاتحانہ قہقہہ لگایا تھا۔

لیکن ـــــ

فضل شاہ کا جواب اس کی توقعات کے مطابق نہیں تھا

اُس کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ ضرور آئی تھی لیکن اس نے برملا کہا تھا

عمر دین تمہارے منہ میں گھی شکر، لیکن تم جتنا اس کام کو آسان سمجھ رہے ہو یہ اتنا آسان ہے ـــــ وہ زخم خوردہ سانپ ہے ـــــ بڑے حساب اور دانائی سے قابو کرنا پڑیگا"

اسید بادشاہ آپ کو اس سے متعلق کچھ زیادہ ہی غلط فہمی ہو گئی ہے ـــــ خیر! ہاتھ کنگن لا کیا ـــــ بس آپ ایک آدھ مہینے ہی میں دیکھ لیجئے ـــــ"

اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔

دین ـــــ تم اس کام کے لئے دو مہینے لے لو ـــــ میں دو مہینے تک یونین کونسل ین کی سیٹ تمہارے لئے رکوائے رکھتا ہوں ـــــ اگر تم نے یہ کارنامہ انجام دے دیا تو ر سے تمہارے لئے کم از کم انعام یہی ہو گا ـــــ"

فضل شاہ نے اُس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا"

فضل شاہ کی آخری بات نے عمر دین کو ہلا کر رکھ دیا تھا ـــــ

اتنی بڑی پیشکش ـــــ

اُس نے تو زندگی میں کبھی اتنے بڑے انعام کا تصور نہیں کیا تھا

اُس کے لئے تو جیسے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا تھا ـــــ اپنے گھر کی طرف واپس لوٹتے ہوئے
اُس کا دماغ تمام راستے آسمان پر پرواز کرتا آیا تھا۔ اُس نے تصور میں خود کو یونین کونسل کا
چیئرمین سمجھ کر جانے کتنے اہم فیصلے بھی کر لئے تھے۔

اب اُسے ہر صورت یہ کام کرنا تھا ـــــ جس کے لئے ضروری تھا کہ وہ نذر محمد کی زیادہ
سے زیادہ خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

لیکن ـــــ

اِس مرحلے پر بھی اُس نے بڑی احتیاط سے کام لیا تھا اُس نے سوچا کہ کوئی ایسی حرکت ہرگز
نہیں کرے گا جو نذر محمد کی ناراضگی کا باعث بن سکے۔

اپنے گاؤں پہنچ کر اُس نے سب سے پہلا کام یہی کیا تھا کہ اگلے روز نذر محمد کو دیسی
گھی کے دو کنستر اور ایک "سجر سوئی" بھینس روانہ کر دی تھی۔

یہ اُس کی طرف سے "اظہار خیر سگالی" تھا۔

نذر محمد عام حالات میں شاید ان تحائف پر تھوکنا بھی گوارہ نہ کرتا، لیکن اندریں حالات
اُس نے بادل نخواستہ بڑی خوش دلی سے یہ تحائف شکریہ کے ساتھ قبول کر لئے تھے

اُسے اب جو کچھ بھی کرنا تھا اپنی خاندانی روایات کے برعکس بڑی مکاری اور ہوشیاری
سے فضل شاہ اور اِس کے حواریوں کو دھوکے میں رکھ کر کرنا تھا۔

اگر انہیں ذرا سا بھی شک گزر جاتا تو وہ لوگ اُس کو زندہ درگور کر دیتے۔ نذر محمد نے
دوسری طرف سرداروں کے خطرے کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔

سرداروں نے اِس کی ضمانت پر رہائی کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا تھا بلکہ اِس
بات کا سراغ لگانے کے لئے کوشاں تھے کہ کس نے اُس کی مدد کی ہے؟ اور اِس ضمانت کے
پس پردہ کون سا خفیہ ہاتھ کارفرما ہے۔

لیکن ـــــ

فضل شاہ کے دست راست عمر دین نے بھی کسی امکانی خطرے کو نظر انداز نہیں
تھا ـــــ!

سرداروں کو تھانے کے اے ایس آئی کے ذریعے جو خفیہ رپورٹ ملی تھی اُس کے مطابق
[illegible] محمد کی رہائی میں بنیادی کردار حنیف خاں کی طرف سے بڑے تھانیدار کو دیئے جانے والے
[illegible] لاکھ روپوں کی رشوت نے ادا کیا تھا۔

یہ تھانیدار کوئی ایسا نیک نام نہیں تھا جس سے متعلق سرداروں کو کوئی غلط فہمی ہوتی یہ
[illegible] ت وہ بخوبی جانتے تھے کہ دو تین ڈاکے مار کر پانچ دس لاکھ اکٹھے کر لینا حنیف خاں کیلئے
[illegible] مشکل کام نہیں ہے۔ عین ممکن ہے یہ کارنامہ اُس کے ہاتھوں انجام پایا ہو۔

اس بات کا تو انہیں گمان بھی نہ گزر سکا کہ اُن تک جو "انتہائی خفیہ رپورٹ" پہنچی ہے
[illegible] کا محرک بھی عمر دین ہے۔

یہ عمر دین ہی تھا جس نے سرداروں کو مطمئن کرنے کے لئے اس تھانے میں اُن کے اعتماد
[illegible] لے ایک سب انسپکٹر کی مٹھی گرم کر کے اُس کی زبانی سرداروں تک یہ "اہم رپورٹ"
[illegible] ئی تھی ـــــ

اب سرداروں کا سارا زور اِس بات پر لگا تھا کہ نذر محمد سے حنیف خاں کب رابطہ کرتا
؟

بس ایک صورت تھی اُن کے نزدیک سردار مرید کے قتل کا بدلہ لینے کی ـــــ انہوں نے
[illegible] دانست میں بڑی ہوشیاری دکھائی تھی اور نزدیک دور کے دیہاتوں کے کئی بدمعاشوں سے
[illegible] کر کے انہیں اپنی مدد پر آمادہ کیا تھا۔

سرداروں کی طرف سے حنیف خاں کے سر کی قیمت دو لاکھ روپے مقرر کی جا چکی تھی ـــــ
[illegible] انہوں نے ہر بدمعاش کو یہ پیشکش کر دی تھی کہ زندہ یا مردہ ـــــ کسی بھی صورت میں حنیف خاں
[illegible] تک پہنچانے والے کو وہ دو لاکھ روپے ادا کرنے کے پابند ہوں گے۔ سرداروں کو
[illegible] تھی کہ حنیف خاں کا اِن میں سے کسی ایک سے تو کوئی تعلق یا رابطہ ہو گا۔

یہ بات تو وہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ نتھو خاں کے بیٹے کا زندگی گزارنے کا اپنا
ہے۔ وہ چور کا بیٹا تھا۔

ایسے چور کا بیٹا جس نے ساری زندگی سرحد کے پار چوری کی تھی اور کبھی بھارتی بارڈر
فورسز کے قابو نہیں آیا تھا۔

نتھو خاں کے سر کی قیمت بھارتی علاقے میں مقرر تھی۔

اُس نے اپنے بیٹے کو اِس دھندے پر لگاتے وقت ایک ہی نصیحت کی تھی کہ چور
ساتھی نہیں ہوتا اُس نے متعدد مرتبہ حنیف خاں سے کہا تھا۔

"بیٹا ـــــ ہمیشہ چوری اکیلے کرنا ـــــ اکیلے آدمی کے بچ نکلنے کے چانسز صد فی صد
سکتے ہیں لیکن ساتھی کیساتھ کبھی بھی پچاس فیصد سے زیادہ نہیں رہتے ـــــ"

اُس نے اپنے بیٹے کو اپنے دھندے کا ایک ہی اصول بتایا تھا کہ کامیاب رہنے کے
اُسے سب سے بہترین اصول یہی ہے کہ وہ کبھی کسی پر اعتبار نہ کرے ـــــ اور زندگی میں جو
قدم اُٹھائے اپنے زورِ بازو پر اُٹھائے ـــــ

حنیف خاں اب تک پولیس فضل شاہ اور سرداروں کے چنگل سے اِس لئے بچا ہوا
س نے اپنے باپ کی اِس نصیحت کو حرزِ جان بنالیا تھا ـــــ

وہ تو اُس وقت کو پچھتا رہا تھا جب اُس نے اپنے باپ کی دوسری اہم نصیحت کو نظر
ز کے زہراں بائی جیسی حرافہ کے پاس اپنا جسم اور دل گروی رکھ دیا تھا ـــــ

کبھی کبھی جب وہ زہراں کا تصور کرتا تو اُس کا خون کھول اُٹھتا ـــــ اس کا جی
اِن ماں بیٹی کو ایسا سبق سکھائے کہ وہ اپنے ہم پیشہ لوگوں کے لئے نشانِ عبرت بن جا

لیکن ـــــ

اُسے ابھی وقت اور موقع کا انتظار تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں بہت سے محاذوں پر
ہتا تھا۔

اُسے ایک ایک کر کے زندگی کے سارے قرض چکانے تھے۔

لیکن ـــــ

فی الوقت فضل شاہ سب سے بڑا قرض بن کر اُس کے کندھوں پر سوار تھا۔ اُسے اِس سے
ے کچھ نہیں سوجھتا تھا۔

نذر محمد نے گاؤں میں یہی تاثر بنا رکھا تھا کہ اُس کا بھانجا حنیف خاں اپنے ماں باپ
دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اُس نے جگہ جگہ فضل شاہ اور سرداروں کے خلاف نفرت
ظہار کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ ڈنکے کی چوٹ اپنے گاؤں میں رہے گا۔

کسی مائی کے لال کی جرأت نہیں کہ اُس کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھ سکے۔

ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے اُس کے کہنے پر عمر دین نے اِس درمیان
س کو بھی دو تین مرتبہ مختلف اوقات میں اُس کے پاس بھیجا تھا تاکہ سرداروں کو یہ غلط
رہے کہ فضل شاہ اُس کی طرف سے ڈھیلا نہیں پڑا اور کسی اور کو اِس ضمن میں کچھ اور سوچنے
بھی موقعہ نہ دیا جائے

اِس درمیان وہ کئی مرتبہ احمد دین نمبردار کے ساتھ شہر گیا تھا۔

لیکن ـــــ

کسی نے کبھی انہیں اکٹھے جاتے یا واپس آتے نہیں دیکھا تھا ـــــ!

وہ الگ الگ جاتے اور الگ الگ لوٹ آتے۔

اِس درمیان نذر محمد کی کوشش تو یہی ہوتی کہ گاؤں میں کسی کو اس بات کا پتہ نہ چل سکے
ہ گاؤں سے باہر کسی کام سے گیا ہے۔

لیکن ـــــ

کبھی ایسا ہو بھی جاتا اور کوئی ذات برادری کا ـــــ اُسے ملنے کے لئے اگر گھر آ بھی جاتا تو
کے گھر والی عموماً نزدیکی کسی گاؤں میں کسی کام کے لئے جانے کا بہانہ کر دیتی ـــــ! یا پھر
یں ڈاکٹر سے دوائی لینے کا بہانہ تو اُس کے پاس ہمیشہ سے موجود رہا تھا ـــــ نذر محمد نے
ر خاص یہ احتیاط برتی تھی کہ اپنی بیٹیوں کو بھی اس بات کی ہوا نہیں لگنے دی تھی کہ وہ
ر رہا ہے؟

جب کبھی اُس نے بیوی سے اُس کی پُراسرار سرگرمیوں کے متعلق کچھ جاننا چاہا تو نذر محمد نے اُس سے بھی کہا کہ وہ فی الحال خاموشی سے اچھے وقت کا انتظار کرے۔ اُس نے اپنی بیوی سے کہہ دیا تھا کہ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے حنیف خاں کی مدد اور مشورے سے اُن سب کی بہتری کے لئے کر رہا ہے۔

اس درمیان اُس نے بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے گھر میں موجود تمام کپڑے لتے گہنے اور چھوٹی چھوٹی قیمتی چیزیں بھی شہر میں ولی محمد کے گھر منتقل کر دی تھیں ـــــ

اُس نے عمر دین کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔

ہر دوسرے تیسرے دن وہ عمر دین کے ڈیرے پر کسی نہ کسی بہانے پہنچ جاتا۔ اُس کی کوشش تھی کہ بجائے اِس کے کہ عمر دین اُس کے گاؤں آکر اُس کی خیریت دریافت کرے وہ خود بھی اُس کی تسلی کروا آتا۔

حنیف خاں نے اُسے مشورہ دیا کہ سرکاری کام میں کبھی اپنا ہاتھ نہ کھینچے اور جہاں دس روپے سے کام بنتا ہو وہاں بیس دے کر بنوا لے۔ اُس نے نذر محمد سے کہہ تھا کہ انہیں یہ سارا کام ہنگامی بنیادوں پر کرنا ہے۔ اگر کسی بھی مرحلے پر دشمنوں کو خبر ہو گئی تو اُس کے لئے لاینحل مسائل پیدا ہو جائیں گے۔

دس پندرہ روز تک یہی دھندہ چلتا رہا ـــــ

احمد دین نمبردار سرکار دربار کی ساری ہیرا پھیریاں سمجھتا تھا۔ اُس نے بھی یہ ساری جائیداد اونے پونے ہی خریدی تھی اور اسے اپنے نام منتقل کروانے کے لیے ہر جائز اور ناجائز حربہ آزما کر بالآخر بیس روز کی جان توڑ محنت کے بعد یہ معرکہ سر کر لیا تھا۔

نذر محمد نے اُس سے شہر ہی میں رقم وصول کی تھی اور شہر ہی کے ایک بینک میں اپنا اکاؤنٹ کھول کر رقم وہاں جمع بھی کروا دی تھی۔

یہ کوئی چھوٹا سا شہر تو تھا نہیں کہ یہاں ہر کسی کو اُس کی آمد کی خبر ہو ـــــ

اُسی روز احمد دین نمبردار کی مدد ہی سے اُس نے ایک پراپرٹی ڈیلر کی مدد سے ایک گنجان آباد علاقے میں مکان کرائے پر حاصل کر لیا ـــــ

پہلے روز ولی محمد کی بیوی اپنی دونوں بیٹیوں کو اپنے ساتھ شہر لے گئی ـــــ

گاؤں والوں کو یہی علم تھا کہ ولی محمد کے بیٹے کی شادی ہونے والی ہے اور اُس کی بیوی نذر محمد کی بیٹیوں کو کام کاج کے لئے ہی لے گئی ہے۔

دوسرے روز نذر محمد کی بیوی اپنی دونوں بیٹیوں کو دربار سلام کروانے کے لئے شہر لے آئی۔

اُس کی روانگی کے قریباً ایک گھنٹے بعد ہی نذر محمد بھی گاؤں سے باہر آ گیا ـــــ

اُس رات نمبردار احمد دین کے بیٹوں نے نتھو خاں کی زمین پر ہل چلا دیئے اور راتوں رات نذر محمد اور نتھو خاں کی حویلی میں منتقل ہو گئے۔

صبح گاؤں والوں کے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ نذر محمد نے ساری جائیداد اُن کے پاس فروخت کر دی ہے ـــــ

یہ خبر گاؤں سے نکلی اور ارد گرد کے دیہاتوں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی ـــــ!

عمر دین کو جب اُس کے ایک کارندے نے آکر بتایا کہ اُس کے ساتھ کیا ہاتھ ہو گیا ہے؟ تو اُسے کہنے والے کی بات پر یقین نہ آیا۔

وہ فوراً اپنی گھوڑی پر سوار شمشیر نگر نذر محمد کی خیریت دریافت کرنے کے بہانے پہنچ گیا۔

جہاں پہنچ کر اُس کے سارے خواب ریزہ ریزہ ہو گئے۔

غصے اور بے بسی سے اُس کا خون کھول اُٹھا۔

اُس کے دماغ کی رگیں پھٹنے کو آ رہی تھیں۔

نذر محمد نے کتنی معصومیت سے اسے اُلو بنا لیا تھا اُس کے سارے کئے کرائے پر پانی پھیر کر رکھ دیا تھا اب وہ کم از کم ساری زندگی فضل شاہ کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا تھا کیونکہ اُس نے فضل شاہ کو نذر محمد کی طرف سے مکمل بے بنیاد کر دیا تھا۔

عین ممکن تھا کہ فضل شاہ اگر یہ معاملہ اپنے ہاتھ میں رکھتا تو اُسے یہ دن دیکھنے نصیب نہ ہوتے۔

نمبردار احمد دین کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

اِس کی وجہ شمشیر نگر میں ایک ہی برادری کے لوگوں کی اکثریت تھی۔ جنہوں نے اب احمد دین نمبردار کو نتھو خاں کا متبادل جان کر قبول کر لیا تھا۔

درندے

نذیرے نے ساری زندگی حرام کمایا اور حرام ہی کھایا تھا ــــ!

جانے اس کی کون سی چال سیدھی پڑگئی تھی کہ حنیف خاں نے اسے اپنے لیے ناگزیر جاننا شروع کر دیا تھا اور نذیرا اسی صورتحال کا مکمل فائدہ اٹھانے پر تُلا ہوا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ سونے کی ایسی چڑیا پھر کبھی اس کے قابو نہیں آئے گی اور اس کی مدد سے راتوں رات وہ سیٹھ بن جانے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ جس کامیابی اور صفائی سے حنیف خاں نے پہلی واردات کی تھی اس کے بعد سے تو اُسے کچھ زیادہ ہی یقین ہو چلا تھا کہ تقدیر نے اس کے ہاتھ میں ترپ کا پتہ دے دیا ہے۔

اس نے حنیف خاں کی غیر موجودگی میں صغراں کا اعتماد بہر طور حاصل کر لیا تھا۔ اُس نے یوں نوکروں کی طرح جی جان سے دن رات اُس کی خدمت کی تھی کہ بے چاری صغراں اُسے دُنیا میں اپنے خاوند کا سب سے بڑا ہمدرد خیال کرنے لگی تھی۔

حنیف خاں کی آمد کے پندرہ بیس روز بعد ہی اُس نے دوسری واردات بھی کر دا دی ــــ

اس مرتبہ نذیرے نے شہر کی ایک مضافاتی آبادی میں ایک سُنار کی دکان پر نقب لگوائی تھی۔ وہاں سے انھیں توقعات کے مطابق سونا اور روپیہ مل گیا تھا۔ یہاں بھی حنیف خاں نے بڑی دلیری کا مظاہرہ کیا تھا اور ایک مرحلہ پر جب علاقے کا چوکیدار اُن کے آڑے آنے لگا تو اُسے باندھ کر ایک طرف پھینک دیا تھا جس کے بعد وہ بڑی آسانی سے یہاں سے بھی نکل آئے تھے۔

حنیف خاں نے اس مرتبہ اس کی توقعات کے برعکس اُسے آدھا مال سونپ دیا تھا اور اُس نے پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی حنیف خان کو لاعلم رکھ کر نزدیکی شہر میں اپنا جو بنک اکاؤنٹ کھولا ہوا تھا۔ اُس میں ساری رقم جمع کروا دی۔

دن ہفتوں اور مہینوں میں بدل رہے تھے ــــ

صغراں کی شادی کو ۸ واں مہینہ ہونے کو آیا تھا اور وہ اب کسی بھی لمحے ماں بننے والی تھی ــــ

حنیف خاں جانتا تھا کہ صغراں کے بچے کی اہمیت کیا ہے؟

یہ اس کی نسل کو قائم رکھنے کی ایک آخری کوشش ہوگی اگر اُسے خدانخواستہ کچھ ہو جاتا تو وہ جیتے جی مر جاتا۔ یہ بچہ اس کی نسل کا تسلسل برقرار رکھ سکتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ صغراں کو اس حالت میں زیادہ سے زیادہ سکون ملنا چاہیئے۔

اس کے ذہن پر اب یہ خوف سوار رہنے لگا تھا کہ اُس کا خاوند ایک مفرور قاتل ہے جس کو کسی بھی لمحے پولیس گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اُتار سکتی ہے۔

اُس درمیان دو تین مرتبہ اُس نے دوسرے شہر میں اپنے ماموں نذر محمد سے بھی رابطہ کیا تھا جس نے فضل شاہ اور سرداروں کے خوف سے اب تک چار مکان تبدیل کر لیے تھے ــــ!

ایک روز بالآخر اُس نے فیصلہ کُن انداز میں صغراں کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔

"کہاں"؟ ــــ

اُس نے حیرانگی سے پوچھا۔

"تمھارے والدین کے گھر"

حنیف خاں بولا۔

"لیکن ــــ یہ کیسے ممکن ہے وہ تو خود۔ ۔ ۔"

"دیکھو صغراں اِس وقت ہمارے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہ گیا۔ یہاں کوئی تمھاری تیمارداری نہیں کر سکتا۔ میرے لیے یہ تصوّر بھی بڑا جان لیوا ہے کہ خدانخواستہ تمھیں کچھ

ہو نہ جاتے"۔

اُس نے صغراں کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"تم خود ہی کہہ رہی ہو کہ چاچے کے پیچھے فضل شاہ ہاتھ دھو کر پڑا ہے —— حنیف خاں کہیں میرا اُن کے پاس جانا اُن پر کوئی عذاب نہ لے آئے —— وہاں میری چار بہنیں بیاہنے والی بیٹھی ہیں" ——

صغراں نے اُسے تلخ حقائق سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔

"مَیں نے بہتر سوچنے سمجھنے کے بعد ہی یہ فیصلہ کیا ہے صغراں —— یوں بھی مَیں نہیں چاہتا کہ میرا بیٹا ایسے گھر میں جنم لے جہاں دو مجرم پہلے ہی سے موجود ہوں۔ کم از کم مَیں اپنا منحوس سایہ اُس پر نہیں پڑنے دوں گا خواہ مجھے اس کی کچھ بھی قیمت اَدا کرنی پڑے۔

اُس نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

"جیسے تمھاری مرضی ——"

شاید صغراں کو بھی بات سمجھ آگئی تھی۔

حنیف خاں نے نذیرے کے ہزار مرتبہ پوچھنے پر بھی کبھی اُسے دل کی کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ اُسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ حنیف خاں کا ماموں رہتا کہاں ہے۔ بس اتنی خبر تھی کہ اس کے خاندان نے گاؤں چھوڑ دیا ہے —— یوں بھی نذیرے کے لیے اِن باتوں کی کچھ زیادہ اہمیّت نہیں تھی۔ انھوں نے اب قدرے بڑا مکان کرائے پر لیا ہوا تھا۔ جس کے ایک کمرے میں جس کا دروازہ باہر گلی میں کُھلتا تھا نذیرے کا ڈیرہ لگا ہوا تھا ——

حنیف خاں چونکہ اُس کی مکّاریوں سے آگاہ تھا اس لیے اس نے کبھی اپنی موجودگی میں اُسے صغراں سے زیادہ قریب ہونے کی مہلت نہیں دی تھی۔ صغراں اُس کے لیے البتہ تینوں وقت کا کھانا باقاعدگی سے پہنچا دیتی تھی کبھی کبھی سرِ راہے کوئی بات دونوں کے درمیان ہو جاتی۔

حنیف خاں کی شدید خواہش تھی کہ نذیرا الگ سے گھر لے کر رہے ——

لیکن ——

اس پر بھی وہ خدا کا شکر اَدا کرتا کہ ابھی نذیرے جیسے کمینے شخص کی آنکھوں میں اتنی حیا تو موجود ہے۔

نذر محمد کے گھر اس کی بیٹی کی آمد نے سب کے جذبات میں ہلچل مچا دی تھی۔ لمبے عرصے بعد وہ اپنی بیٹی سے مل رہا تھا۔ اُس کی بیوی تو بیٹی کی بلائیں لیتی نہیں تھکتی تھی جس نے اپنے ماں باپ کے حکم کی تعمیل میں خود کو تج دیا تھا۔

وہ جانتے تھے کہ ایک مفرور کے ساتھ زندگی بسر کرنا صغراں کے لیے کتنا اذیت ناک ہوگا!

لیکن ——

جتنے احسانات اُن پر نتھو خاں کے خاندان کے تھے اس کے بعد یہ کوئی بڑی قیمت نہیں تھی جو انھیں اَدا کرنی پڑی۔

صغراں کو حنیف خاں کے کہنے پر انھوں نے شہر کی ایک ماہر لیڈی ڈاکٹر کو دکھانا شروع کیا تھا۔ پندرہ سولہ روز بعد اُس نے حنیف خاں کی غیر موجودگی میں بچے کو جنم دیا تو بے ساختہ نذر محمد کی آنکھیں بھر آئیں۔

اب اُسے کم از کم یہ اُمید تو پیدا ہو چلی تھی کہ نتھو خاں کا نام تو دُنیا پر ابھی زندہ رہ جائے گا۔

یہ اولاد کی تڑپ تھی یا خون کی کشش جو اگلے ہی روز حنیف خاں کو کھینچ کر یہاں لے آئی ——!

اُس نے جب یہ سُنا کہ اللہ نے اس کے گھر بیٹا پیدا کیا ہے تو اُسے اپنا وجود ہلکا ہو کر ہَوا میں تیرتا محسوس ہونے لگا۔

عابد خان اُس نے بچے کا نام رکھا تھا اور دل ہی دل میں خود سے عہد کیا تھا کہ اپنی مجرمانہ زندگی کا سایہ بھی کبھی اس پر نہیں پڑنے دے گا۔

"ماما نذر محمد مَیں نے اپنی زندگی کے سارے اثاثے تیرے نام کر دیئے ہیں۔ تُو نے

آج تک متعدد مرتبہ مجھے پیسے لوٹنے کی کوشش کی ہے ۔۔۔ بس یہ سمجھ لینا کہ میری جائداد سے حاصل ہونے والی ساری دولت میرے بیٹے اور میری بیوی کی ہے ۔۔۔ اگر تم مجھ پر کوئی احسان کر سکتے ہو تو وہ یہی ہے کہ میرے بچے کی پرورش ایسے کرنا جیسے نتھو خاں کے پوتے کی ہو سکتی تھی ۔۔۔ مَیں نے ایک اور شہر میں تمھارے لیے مکان دیکھ لیا ہے ۔ وہ مکان خرید لو ۔۔۔ مکان کے نیچے موجود مارکیٹ سے تمھیں ماہانہ اتنی آمدن ہوتی رہے گی جن میں تمھارا خرچ آسانی سے چلتا رہے ۔۔۔ پھوپھا ولی محمد کو مَیں نے راضی کر لیا ہے وہ تمھاری دونوں بیٹیاں اپنے دونوں بیٹوں سے بیاہ دے گا ۔۔۔ میں باقی دونوں کی ذمہ داری قبول کرتا ہوں ۔ انھیں بھی ایسے ہی رخصت کروں گا جیسے میرا باپ اگر زندہ ہوتا تو رخصت کرتا ۔۔۔ ماما ۔۔۔ میری زندگی کا کچھ بھروسا نہیں ۔۔۔ مجھے ایک پل قرار نہیں آتا ۔۔۔ اب تک مجھے ایک ہی خوف ڈستا رہتا تھا کہ مَیں مر گیا تو میرے باپ کا نام لینے والا کون اس دُنیا میں رہ جائے گا ۔۔۔ اب مَیں اِس فکر سے آزاد ہو گیا ہوں ۔۔۔ مَیں فضل شاہ کو نہیں چھوڑ سکتا ۔۔۔ اُس نے میرے باپ دادا کی نگری مجھ سے چھڑا دی ہے ۔۔۔ مَیں نہیں چاہتا کہ شمشیر نگر کی تاریخ میں کبھی میرا نام بزدلوں میں لکھا جائے ۔۔۔ ماما ! مَیں تمھارے سر پر ایک بڑا بوجھ ڈال رہا ہوں صغراں اور عابد کو اب تمھیں ہی سنبھالنا ہے ۔۔۔ جب تک کہ میری قسمت کا کوئی فیصلہ نہ ہو جائے"۔۔۔

اُس نے نذر محمد کو اعتماد میں لے کر کہا ۔

نذر محمد کے جذبات بہت عجیب ہو رہے تھے ۔

وہ اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ تھا ۔ جانتا تھا کہ اب وہی اس خاندان کا بڑا بزرگ ہے ۔

لیکن ۔۔۔

حنیف خاں نے باپ کی موت کے بعد سے جس طرح انھیں سنبھالا تھا اس کے بعد سے اُسے اپنا قد حنیف کے سامنے چھوٹا دکھائی دینے لگا تھا ۔

دیر تک وہ فضاؤں میں گھورتا رہا ۔۔۔

وہ جانتا تھا کہ حنیف خاں وہی کرے گا جو اُس نے کہا ہے ۔ پھر بھی اس کا دل چاہتا

تھا کہ وہ ایسا نہ کرے ۔ اس نے چاہا کہ حنیف خان کو سمجھائے کہ اب دُنیا اور حالات وہ نہیں رہے ہیں حنیف خان نے اس کی بات نہ مانی ۔

ایک مرتبہ پھر نذر محمد کے کندھوں پر بڑا بوجھ آن پڑا تھا ۔

اس کو بادل نخواستہ ہی سہی یہ ذمہ داری نبھانی تھی ۔

وہ تو اس کا اپنا خون تھا ۔ اگر کسی غیر نے بھی اُس کے ساتھ یہ احسان کیا ہوتا تو وہ ضرور اس کے کام آتا ۔ حنیف خاں نے تو اس کے دل و دماغ سے ایک ایک کر کے سارے بوجھ ہی اُتار دیتے تھے ۔

اپنے بیٹے کو جی بھر کر دیکھنے کے بعد وہ صغراں سے مل کر واپس لوٹ آیا ۔۔۔

واپس لوٹتے ہوئے گو کہ وہ بڑا سوگوار تھا ۔

لیکن ۔۔۔

خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا ۔ جیسے اُس کے دل و دماغ پر پڑا منوں بوجھ اُتر گیا ہو ۔

نذیرے کو جب اُس نے بیٹے کی پیدائش کی خوشخبری سنائی تو اس نے یوں بے اختیار اُسے مبارکباد دی تھی جیسے واقعی اُسے بہت خوشی ہوئی ہو ۔

" یہ تم نے بہت اچھا کیا حنیف خان جو اُسے گھر چھوڑ آئے ۔ حالات کسی وقت بھی کوئی غلط رُخ اختیار کر سکتے تھے ۔۔۔"

اُس نے حنیف خاں کے فیصلے کو سراہتے ہوئے کہا ۔

" ہاں نذیرے یار مَیں نے سوچا آخر میرے گناہوں کی سزا میری بیوی اور بچے کیوں ملے ؟"

حنیف خاں نے خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا ۔

" مَیں نے اس مرتبہ بڑا شاندار شکار تاڑا ہے حنیف خاں ۔ دیکھو گے تو عش عش کر اُٹھو گے ۔"

نذیرے نے گفتگو کا رُخ دوسری طرف موڑتے ہوئے کہا۔

"کون سا؟"

حنیف خان نے پوچھا اور وہ اُسے تفصیلات بتانے لگا۔ اس مرتبہ اس نے حنیف خاں کے لیے شہر کی ماڈرن آبادی کا ایک مکان تلاش کیا تھا۔

اس مکان کا مالک ایک بڑا سرکاری افسر تھا جس نے اپنے ہاں حرام کی دولت کے انبار جمع کر رکھے تھے۔

"جس گھر میں ہم جائیں گے یہ اس کی دوسری بیوی ہے جس کا کسی کو شاید اس نے ابھی تک علم نہیں ہونے دیا۔ دن میں وہ اکیلی یا پھر گھر پر کام کرنے والی آیا ہی ہوتے ہیں۔ ہم دوپہر کے بعد سلام کرنے چلے جائیں گے"——

نذیرے نے اُسے تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔

"ابھی دو تین روز ٹھہر جاؤ —— اتنی جلدی کیا ہے"——

حنیف خاں نے بظاہر بے دلی سے کہا۔

"یار کل کس نے دیکھی ہے —— وہ پرسوں دورے پر دوسرے شہر جا رہا ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے ساری معلومات جمع کی ہیں۔"

نذیرے نے اُسے بتایا۔

"یار نذیرے بات کو سمجھا کرو —— ابھی میں اپنے بچے کو اکیلا چھوڑ کر آیا ہوں۔ میرا ذہن..."

"اچھا تو یوں کہو ناں کہ شادی کر کے تم بزدل ہو گئے ہو"——

نذیرے نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے اُس کی دُکھتی رگ کو چھیڑا۔

"نذیرے..."

غضب سے اس کی آنکھیں پھٹنے کو آ گئی تھیں۔ ایک مرتبہ تو نذیرا بھی دہل کر رہ گیا۔

"خبردار —— آج کے بعد مجھے یہ طعنہ نہ دینا۔ تم جانتے ہو میں کون ہوں"——

"یار —— تم تو خواہ مخواہ بُرا منا گئے"——

نذیرے کی جان میں جان آئی تو اُس نے بے شرموں کی طرح دانت نکالتے ہوئے ڈھٹائی سے کہا۔

"زبان کو لگام دے کر رکھا کرو۔ تم جانتے ہو میں اس لہجے میں بات سُننا پسند نہیں کرتا"——

اُس کا غصہ ابھی تک نہیں اُترا تھا۔

نذیرے نے منت سماجت کر کے اُسے نارمل کر لیا۔

لیکن ——

اسی روز نذیرے کو احساس ہو گیا کہ ابھی تک حنیف خاں نے اُسے اپنا محتاج سمجھنا شروع نہیں کیا۔

پانچویں روز وہ نئی واردات پر جا رہے تھے ——!

اس مرتبہ بھی سارا پلان حنیف خاں نے ہی تیار کیا تھا۔ اُس نے ماہر فوجیوں کی طرح پہلے دن میں گھوم کر اس علاقے کی طرف آنے جانے والے تمام راستوں کا جائزہ لیا اور اپنے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب دے کر گھر آ گیا تھا ——!

دوپہر کے بعد وہ لوگ کوٹھی کے دروازے پر اطلاعی گھنٹی بجا رہے تھے۔ دروازہ گھر کے بیرے نے کھولا جس کے کپڑوں نے اس کی شناخت کروا دی تھی۔ حنیف خاں نے اپنا تعارف ٹیلی فون کے لائن مین کی حیثیت سے کروایا اور بتایا کہ وہ لوگ چونکہ بین بکس میں تبدیلی کر رہے ہیں اس لیے ٹیلی فون کی تار ٹھیک کرنا چاہتے ہیں۔

بیرے نے لاپرواہی سے کندھے اُچکاتے ہوئے پہلے دروازہ کھولا پھر بند کر کے کنڈی لگا دی۔

دونوں کو اپنے ہمراہ لے کر وہ برآمدے تک آ گیا ——

برآمدے کے نزدیک پہنچ کر حنیف خاں نے اچانک ہی ایک ہاتھ مضبوطی سے اُس کے منہ پر رکھا اور دوسرے سے اُسے قابو کر لیا۔

اس درمیان اُس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نذیرے نے کپکپاتے ہاتھوں

سے اپنے تھیلے میں پہلے سے موجود ٹیپ رول نکالا اور اُس کے مُنہ پر باندھنا شروع کر دیا۔۔۔۔ اب اس کے منہ سے آواز نکلنے کے چانسز بالکل ختم ہو کر رہ گئے تھے کیونکہ وہ پہلے ہی اتنا خوف زدہ اور گھبرایا ہوا دکھائی دے رہا تھا کہ نذیرے کو ہر آن اس کے بے ہوش ہونے کا دھڑکا لگا رہا ۔۔۔۔

دوسرے تھیلے سے حنیف خاں نے ایک چھوٹی سی رسّی نکال کر اُس کے دونوں ہاتھ اور پاؤں باندھ کر اُسے برآمدے سے ملحقہ کمرے میں پھینک کر باہر سے دروازے کو کُنڈی لگا دی۔

اب وہ دبے قدموں سے سامنے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے جو شاید اس گھر کا ڈرائنگ روم تھا۔ دونوں نے اسی اثناء میں اپنے چہروں کو پہلے سے موجود ماسک کے ذریعے اس طرح ڈھانپ لیا تھا کہ وہ کسی انگریزی فلم کے ڈاکو نظر آرہے تھے۔

اس کمرے میں درمیانی عمر کی ایک خوبصورت خاتون ٹی وی پر کسی فحش فلم سے لُطف اندوز ہو رہی تھی۔ جب اچانک ہی یہ قیامت اُس کے سر پر ٹوٹ پڑی۔

اپنی طرف حنیف خاں کو پستول تانے دیکھ کر اُس کے مُنہ سے بے ساختہ چیخ نکلی، لیکن اُس کی آواز ٹی وی سے برآمد ہونے والی چیخوں سے زیادہ اُونچی نہیں تھی۔

"دیکھو خاتون ہماری تمھارے ساتھ کوئی دشمنی نہیں۔۔۔۔ اگر تعاون کرو گی تو تمھاری جان اور عزت بچ جائے گی ورنہ مال تو جائے گا ہی جان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گی"۔۔۔۔

حنیف خاں نے اس کی طرف پستول لہراتے ہوئے مقامی زبان میں کہا۔

اُس نے نذیرے کو روانگی سے پہلے سختی سے تاکید کر دی تھی کہ وہ اپنی زبان نہیں کھولے گا۔ اس طرح ممکن ہے اُن کے لب ولہجے سے اُن کے علاقے کی نشاندہی ہو جاتے۔ البتہ حنیف خاں کو مقامی زبان میں اچھی طرح بات کرنا آتی تھی۔

"ت ت تم کیا چاہتے ہو" ۔۔۔۔

خاتون نے خوف زدہ لہجے میں ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"تجوری کی چابی اور تمھاری خاموشی" ۔۔۔۔

حنیف خاں نے مختصر بات کی۔

خاتون نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا اور جب اُسے یقین ہو گیا کہ یہاں کوئی اس کی دکو نہیں آئے گا تو اس نے دوسرے کمرے میں موجود اپنے پرس سے چابی نکال کر اس کی ف بڑھا دی۔

حنیف خاں نے چابی پکڑنے کے بجائے اس کو تجوری کھولنے کا حکم دیا۔ اس درمیان ں نے پستول خاتون کی طرف اسی طرح سیدھا کیے رکھا۔

صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اگر اُس نے اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش بھی کی تو وہ ہائی اقدام سے دریغ نہیں کرے گا۔

خاتون نے لرزتے ہاتھوں سے تجوری کا دروازہ کھول دیا۔

حنیف خاں نے اُسے پیچھے ہٹنے کا حکم دیا اور نذیرے نے جس کی آنکھیں تجوری میں موجود رے جواہرات کے زیورات اور کرنسی نوٹوں کو دیکھ کر پھٹی جا رہی تھیں لرزتے ہاتھوں ، اپنا تھیلا بھرنا شروع کر دیا۔

چند منٹ کے بعد ہی اُن کا مشن مکمّل ہو چکا تھا۔

حنیف خاں نے بڑی پھرتی سے ٹیلی فون کا کریڈل کھینچ کر توڑ دیا اور خاتون کو گھر کے رمیں بند کر کے اُسے باہر سے کُنڈی لگا کر بند کر دیا۔

انھوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ گھر میں کسی کی آمد تک ان دونوں کے یہاں سے نکلنے امکانات بہت کم ہیں۔ کیونکہ اس گھر کے ہمسائے میں آباد مکینوں کے پاس اپنے ہمسایوں چیخ و پکار پر کان دھرنے کے لیے بھی وقت نہیں تھا۔

گھر سے باہر وہ اس طرح نکلے جیسے اسی گھر کے مکین ہوں۔

انھوں نے یہاں سے تین چار گلیوں تک پیدل سفر طے کیا تھا۔ جس کے بعد مختلف ریاں بدلتے ہوئے وہ شام کو دیر گئے اپنے گھر پہنچے تھے۔

اس مرتبہ ان کے ہاتھ لگنے والے زیورات اور نقدی لاکھوں کی مالیت کے تھے۔

بڑا کامیاب ڈاکہ تھا ۔۔۔۔

حنیف خاں نے نہ چاہنے کے باوجود نذیرے کو کئی مرتبہ دل ہی دل میں داد دے چکا تھا اور اُس سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اب کم از کم دو تین مہینے وہ خاموشی سے گزار سکتے ہیں۔

"یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا حنیف خاں ـــــ ابھی فکر کی کیا ضرورت ہے۔"

نذیرے نے مُرغے کی طرح گردن پُھلاتے ہوئے کہا۔

فضل شاہ کی حالت زخم خوردہ سانپ سے زیادہ خطرناک تھی۔

حنیف خاں نے اُسے مکّاری اور منافقت کے میدان میں بھی شہ مات دے دی تھی۔ حالانکہ وہ خود کو اِس میدان کا پُرانا کھلاڑی سمجھتا تھا اور آج تک کم از کم اس میدان میں اُس نے مار نہیں کھائی تھی۔ اس کا دل تو یہی چاہتا تھا کہ عمردین کو زمین میں گاڑ کر اس پر کُتّے چھوڑ دے۔

لیکن ـــــ

یہ اس کی سیاسی مصلحتیں اور مجبوریاں تھیں جنھوں نے اس کے ہاتھ باندھ رکھے تھے اُسے اس علاقے کے بدمعاشوں اور رسّہ گیروں کی زیادہ سے زیادہ دوستی درکار تھی اور عمردین کا شمار علاقے کے گِنے چُنے رسّہ گیروں میں ہوتا تھا۔

فضل شاہ کو رہ رہ کر ایک ہی پچھتاوا ڈسنے آیا تھا کہ اُس نے حنیف خاں کی جائداد بحق سرکار ضبط کیوں نہ کروا دی۔ اپنی دانست میں اس نے یہ قدم اس لیے نہیں اُٹھایا تھا کہ حنیف خاں کے ساتھ ملنے کا دروازہ کُھلا رکھے۔

یہ بات تو وہ بھی جانتا تھا کہ ریاست شاہ کا قاتل حنیف خاں نہیں، وہ خود ہے اور حنیف خاں نے بظاہر اس کا کچھ نہیں بگاڑا جبکہ فضل شاہ نے اس کے باپ اور ماں دونوں کو قتل کروایا ہے۔

لیکن ـــــ

اُس کے نزدیک دوستی یا دشمنی کے لیے کسی وجہ کا ہونا ضروری نہیں تھا۔ وہ اپنی فطرت میں شیطان تھا جو بدی کے لیے کوئی نہ کوئی جواز ڈھونڈ لیتا تھا۔ اب حنیف خاں

نے اس کے ساتھ جو ہاتھ کیا تھا اور جس طرح اُسے دھوکے میں رکھ کر اس سے اونے پونے داموں پر اپنی جائداد فروخت کر دی تھی۔ اس کے بعد سے تو اس کے لیے حنیف خاں کو زندہ چھوڑنے کا کوئی جواز ہی باقی نہیں رہا تھا،

لیکن ـــــ

حنیف خاں سے بھی پہلے وہ ایک اور حساب چکانا چاہتا تھا۔

اور ـــــ

یہ تھا نذر محمد ـــــ

نذر محمد ہی دراصل اس کہانی کا مرکزی کردار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ حنیف خاں میں اِتنی عقل فہم نہیں کہ وہ ایسی کوئی چال چلتا۔ وہ نتھو خاں کا بیٹا اور دو جمع دو چار کرنے والا سیدھا سادا بدمعاش تھا۔ جو کبھی نہ کبھی اُس کے جال میں ضرور پھنس جاتا۔

اب اس کے انتقام کی آگ تب ہی ٹھنڈی ہوتی جب وہ نذر محمد کو کوئی گہری چوٹ لگاتا۔ فضل شاہ کے شیطانی اور اذیت پسند دماغ نے اس کو یہی راہ سجھائی تھی کہ وہ نذر محمد کو قتل کروانے کے بجائے اس کو ایسا روگ لگا دے جس کے بعد ساری زندگی وہ زندہ درگور ہو کر رہ جاتے۔ اس کے نزدیک نذر محمد کے قتل سے اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو سکتا تھا۔

"عمردین مجھے باتوں اور وضاحتوں کے بجائے عملی انسان پسند ہیں ـــــ تم نے زیادہ ہوشیاری دکھا کر میرے جال میں پھنسی مچھلی کو نکال دیا ہے ـــــ اس کے ازالے کی ایک ہی صورت ہے عمردین مجھے نذر محمد جیسے بوڑھے اور بے ضرر شخص سے کچھ نہیں لینا ـــــ وہ اپنی طبعی عمر جی چکا ـــــ کتنے دن اور جی لے گا۔ دو سال، پانچ سال بس، اس سے زیادہ وہ کیا جیئے گا ـــــ لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ اب وہ جتنے عرصے بھی زندہ رہے اُسے یہ احساس ہوتا رہے کہ اُس نے فضل شاہ کو دھوکہ دے کر ناقابلِ تلافی گناہ کیا ہے ـــــ اب وہ جب تک جیئے اپنی زندگی پر لعنت بھیجتا رہے ـــــ عمردین اس کی لڑکی اُٹھا لاؤ۔ میں شمشیر نگر کے باسیوں کے سامنے اُس کی لڑکی کو ننگا نچواؤں گا ـــــ بس اس سے کم کسی صورت میں تم مجھے مطمئن نہیں کر سکتے ـــــ ہماری تمھاری دوستی کے برقرار رہنے کی بس یہی ایک شرط ہے ـــــ

اور ہاں اس مرتبہ ناکام رہو تو مجھے اپنا مُنہ دکھانے کے بجائے ہمیشہ کے لیے مُنہ کالا کر جانا۔ سمجھ گئے ناں میری بات"۔

اُس نے اپنے سامنے سر جھکاتے عمردین سے دوٹوک لہجے میں کہہ دیا۔

"شاہ جی ــــ پہلے بات تھی کچھ اور ــــ ٹھیک ہے میری چال سیدھی نہیں پڑی اور وہ بوڑھا ہمیں چکر دے گیا۔ لیکن، اب وہ مجھ سے بچ نہیں سکتا۔ مَیں اُسے زمین کی ساتوں تہہ سے نکال لاؤں گا۔ میرے بندے شہر میں اُس کے رشتہ دار ولی محمد کے گھر کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اُن کے ذریعے ہم لوگ نذر محمد کے گھر تک پہنچ سکتے ہیں ــــ جس روز اُس کا گھر دیکھ لیا۔ سمجھ لیجئے آپ کی خواہش پوری ہوگئی ــــ"

عمردین نے بڑی سفّاکی سے دانت نکالے۔

"عمردین مَیں تم سے پھر یہی بات کہوں گا کہ فضل شاہ کو باتوں سے نہیں عمل سے ہی خوش کیا جاسکتا ہے۔ میری بات سمجھ گئے ناں" ــــ

فضل شاہ کی سنجیدگی برقرار رہی۔

"بالکل سمجھ گیا شاہ جی ــــ بالکل سمجھ گیا"

عمردین نے ہونقوں کی طرح گردن ہلائی۔

اُس نے بظاہر تو اس کام کو بہت آسان سمجھا تھا۔

شہر کے بڑے بڑے بدمعاشوں سے اُس کے ذاتی تعلقات تھے وہ جب بھی انھیں اشارہ کرتا۔ نذر محمد کی کسی بھی بیٹی کو اُٹھا کر اُس کے ڈیرے پر پہنچا دیتے۔

لیکن ــــ

گزشتہ چار یا پانچ ماہ سے ولی محمد کے گھر کی مسلسل نگرانی کروانے کے باوجود اُسے ابھی تک نذر محمد کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ دوسری طرف فضل شاہ کی ناراضگی میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس درمیان اس کے آدمیوں نے دو مرتبہ نذر محمد کے مکان تک رسائی حاصل کی تھی۔

یہ الگ بات کہ دونوں مرتبہ انھیں یہی علم ہوا کہ نذر محمد نے مکان تبدیل کر لیا ہے ــــ!

اب عمردین کے شیطانی دماغ نے اُس کے ٹھکانے کا پتہ لگانے کے لیے انتہائی اقدام کا فیصلہ کر لیا تھا۔ جس کے لیے اُس نے ایک بے ضمیر پولیس سب انسپکٹر کی خدمات بھی حاصل کر لی تھیں، شوکت نام کا یہ سب انسپکٹر اُس کا دیرینہ ساتھی تھا اور عمردین کی کوششوں سے ہی اُسے "لائن حاضری" کے طویل عذاب سے نجات ملی تھی اور اس نے حال ہی میں اُسی تھانے میں شوکت کی تعیناتی کروائی تھی جس کی حدود میں ولی محمد کا گھر آتا تھا۔

اس روز ولی محمد اپنے کام سے واپس لوٹا ہی تھا جب دروازے پر دستک سنائی دی۔ اُس نے خود دروازہ کھولا تو سامنے پولیس کو دیکھ کر اُس کے قدموں تلے سے زمین ہی نکل گئی ــــ

"ولی محمد تمھارا نام ہے اوئے" ــــ

انسپکٹر شوکت نے جس کے تین سپاہی بھی موجود تھے بڑی بدتمیزی سے دریافت کیا۔

"ہاں جی، ــــ مَیں ہی ہوں ولی محمد۔ کیا بات ہے؟"

اس نے خوف زدہ لہجے میں دریافت کیا۔

"ابھی تجھے بتاتے ہیں کام کیا ہے ــــ بدمعاشوں اور قاتلوں کی پشت پناہی کرتے ہو اور پوچھتے ہو کیا بات ہے ــــ اوئے تم چیز کیا ہو اوئے ــــ دو چھتر تم نہیں کھا سکتے تمھارا دماغ ایسا درست کروں گا کہ زندگی بھر یاد کرو گے" ــــ

انسپکٹر شوکت نے اس سے پولیس والوں کے انداز میں غنڈہ گردی کی۔

"دروازہ کھول اوئے ــــ"

ایک سپاہی نے اُسے گالی دے کر کہا۔

اور ــــ

بے چارے ولی محمد نے دروازہ اِن موذیوں کے لیے کھول دیا

انسپکٹر شوکت اور اس کے ساتھی اندر گھس آئے۔

"کہاں چھپا رکھا ہے اوئے تُو نے حنیفے کو ــــ"

انسپکٹر شوکت نے اُسے موٹی سی گالی دے کر کہا۔

"مجھے کچھ نہیں پتا جناب۔ میرا اُن لوگوں سے کیا لینا دینا۔ مَیں نے تو ساری زندگی گاؤں کی شکل نہیں دیکھی۔ مَیں تو۔۔۔۔"

"چُپ کرا دتے ـــ کیا بک بک لگا دی ہے۔ جو سوال چوہدری صاحب نے کیا ہے صرف اس کا جواب دو ـــ ماما شہر دا" ـــ

اس سپاہی نے ولی محمد کو اس طرح ڈانٹا کہ بے چارہ سہم کر رہ گیا۔

"لیکن جناب مجھے کیا علم کہ حنیفا یہاں ہے۔ مَیں نے تو آج تک اُس کی شکل نہیں دیکھی" ـــ

ولی محمد نے اپنی صفائی پیش کی۔

"اچھا ـــ اوتے بشرے اسے ـــ دکھا شکل ـــ"

انسپکٹر شوکت نے اپنے ایک ساتھی سے کہا۔

اچانک ہی ولی محمد کو یوں لگا جیسے اس کا دم گھُٹ جائے گا۔ ایک سپاہی نے اس کی گردن کو اپنی گرفت میں لے کر اس طرح جھٹکا دے کر زمین پر پھینکا تھا کہ وہ سیدھا دیوار سے ٹکراتا ہوا انسپکٹر کے قدموں میں جا گرا جس نے اس کی کمر میں اتنے زور سے ٹھوکر ماری کہ اسے اپنی پسلی ٹوٹنے کا احساس ہوا۔

بے اختیار اس کے مُنہ سے چیخیں نکلنے لگیں ـــ

چیختے چلّاتے ولی محمد کو بالوں سے پکڑ کر اُس سپاہی نے کھڑا کیا اور اُس کے مُنہ پر ایک زوردار تھپڑ جڑ دیا۔

ولی محمد کی چیخ و پکار پر اس کی بیوی اور بچے بیٹھک میں گھُس آئے۔ اپنے خاوند اور باپ کی یہ حالت دیکھ کر انھوں نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا ـــ!

پولیس والوں نے انھیں گالیاں دے کر کمرے سے نکال دیا اور ولی محمد کو مارتے پیٹتے تھانے میں لے آئے۔ قریباً نیم بے ہوش ولی محمد کو انھوں نے کوڑے کے ڈرم کی طرح اُٹھا کر حوالات میں پھینک دیا۔

ولی محمد جب کچھ دیکھنے اور سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو بے اختیار اس کے دل سے حنیف خاں کے لیے گالیاں اور بددعائیں نکلنے لگیں جس کی وجہ سے زندگی میں پہلی مرتبہ اُسے اس نوعیت کی ذلّت سے دوچار ہونا پڑا ـــ

اس نے تو اس خوف سے کہ نتھو خاں کی وجہ سے کہیں پولیس والے اس کے گھر کا دروازہ نہ دیکھ لیں ساری زندگی شمشیر نگر کا رُخ نہیں کیا تھا۔

لیکن ـــ

اس کی زندگی بھر کی محنت آج اکارت ہو چکی تھی۔

جسمانی تکلیف سے زیادہ بے عزتی کا احساس اُس کے لیے جان لیوا ہوتا جا رہا تھا۔

اُسے یہ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ آج اچانک چار پانچ ماہ بعد پولیس نے اس کے گھر پر کیوں دھاوا بول دیا ـــ!

پولیس نے حالانکہ اپنی دانست میں اس کو کچھ زیادہ ہاتھ نہیں دکھائے تھے، لیکن بے چارے ڈھلتی عمر کے ولی محمد کو اپنی ہڈیاں دُور سے چیختی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

ابھی اُسے ہوش آئے چند منٹ ہی گزرے تھے جب سفید کپڑوں میں ملبوس ایک ڈھلتی عمر کا حوالدار اس کے دروازے کی سلاخوں کے نزدیک آ کر بیٹھ گیا۔

"کیا حال ہے ولی محمد ـــ مجھے نہیں پہچانا ـــ"

اس نے بڑے ہمدردانہ لہجے میں دریافت کیا۔

"نہیں بھائی جی ـــ آپ کون ہیں؟"

ولی محمد نے ہائے ہائے کرتے ہوئے پوچھا۔

"خیر ـــ جانے دو۔ پھر تمھیں بتا دوں گا لیکن تم یہاں کیسے آ گئے؟"

اُس نے دوبارہ مکاری سے کہا۔

"بھائی جی خدا رسولؐ کی قسم مجھے کچھ علم نہیں کہ حنیفا کہاں ہے ـــ مَیں نے تو اس موذی کی شکل کبھی ڈھنگ سے نہیں دیکھی"۔

ولی محمد نے جان چھُڑانے کے لہجے میں کہا۔

"دیکھو ولی محمد ——— مَیں تمھارا ہمدرد ہوں ——— یہ لوگ تمھاری جان نہیں چھوڑیں گے۔ پولیس والے مفرور کو گرفتار کرنے کے لیے اس کے رشتہ داروں کی جان عذاب میں لے آتے ہیں ——— تم خواہ مخواہ مارے جاؤ گے۔ عقل سے کام لو" ———

اُس نے ہمدردانہ لہجے میں بڑی رازداری سے کہا۔

"لیکن مَیں کیا کروں ———"

اُس نے بے چارگی سے پوچھا۔

"ایک تجویز ہے میرے پاس ——— جس سے تمھاری جان چھُٹ جائے گی۔"

"کیا" ؟

ولی محمد کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔

"دیکھو تمھیں اِس سے کیا لینا دینا۔ اُس نے کون سا جانداد بیچ کر تمھیں حصّہ دیا ہے۔ جس کو اُس نے دولت دی ہے اس کا عذاب بھی وہی بھگتے۔ تمھیں کیا مصیبت پڑی ہے اس جنجال میں پھنسنے کی ——— تم ان لوگوں کو نذر محمد کا اڈریس دے دو۔ وہ کچھ دے دلا کر اِن کا مُنہ بند کر دے گا۔ تمھارے پاس کیا ہے دینے کے لیے۔ تم اِن کا منہ بند نہیں کر سکتے۔"

حوالدار نے دائیں آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

بات تو وہ صحیح کہہ رہا تھا ———

ولی محمد کے دل نے کہا۔ آخر اُسے کیا مصیبت پڑی ہے کہ یہ عذاب اپنی جان پر ڈالے۔ اُس کی بیٹیاں جوان ہیں۔ کہیں پولیس والے انھیں بھی لے آتے تو۔۔۔۔ ؟

اس سے آگے اس کی سوچیں منجمد ہونے لگیں۔

اس کے گمراہ دماغ نے کہا کہ اس کو ملا بھی کیا ہے۔ ساری رقم تو واقعی نذر محمد لے گیا۔ وہی اب اس مصیبت کو بھی بھگتے۔ یہ بات بھی ٹھیک تھی کہ اس کے پاس تو پولیس کا منہ بند کرنے کے لیے رقم موجود تھی ———

اس کے پاس دینے کے لیے کیا تھا ؟

جو تھوڑا بہت حنیف خاں نے دیا تھا اس سے بیٹی بیاہ دی۔

لیکن ———

اُسے نذر محمد کے گھر کا علم کہاں تھا ؟

شاید اِس لیے نذر محمد نے اُسے نہیں بتایا تھا کہ اُسے علم ہو گا کہ کبھی ولی محمد پر یہ وقت بھی آ سکتا ہے۔ کمبخت کتنا ہوشیار نکلا ——— مجھے مروانے کے لیے قربانی کا بکرا بنا دیا اور خود ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر رہا ہے ———

اُسے یاد آ گیا کہ نذر محمد نے اُسے تین چار روز بعد ملنے آنا تھا۔ یہی ایک صورت تھی جس سے وہ اس کی نشاندہی کر سکتا تھا جس سے اس کی جان چھوٹ جاتی ———

"نذر محمد نے تین چار دن بعد مجھے ملنے آنا ہے۔ مَیں اُسے گرفتار کروا دوں گا لیکن خدا کے لیے مجھے کچھ نہ کہو ——— مَیں بے قصور ہوں ———"

اس نے کپکپاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے ——— مَیں انسپکٹر صاحب سے بات کرتا ہوں" ———

اور ———

اس کے ہمدرد حوالدار نے انسپکٹر صاحب سے بات کر لی۔ معاملہ دونوں کے درمیان یہ ٹھہرا کہ جیسے ہی نذر محمد اس کے گھر آیا وہ کسی بہانے وہاں سے باہر آ کر پولیس کو مطلع کر دے گا اور فی الوقت اُسے اپنی جان چھڑانے کے لیے پانچ ہزار روپے پولیس کو خرچ پانی کے لیے دینے پڑیں گے۔

ولی محمد کے بیٹے نے رات کو پانچ ہزار روپے دے کر اپنے باپ کی جان چھڑائی جس سے ڈھنگ سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔

اپنے گھر پہنچ کر ولی محمد دو دن تک اپنے جسم کو ٹکور دی اور جی بھر کے حنیف خاں کی ساری نسل کو گالیاں دیں جس کی وجہ سے اُسے یہ دن دیکھنا پڑا تھا۔ اُس نے اپنی بیوی سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اگر آج کے بعد اُس نے اپنے پچھلوں سے ملاقات کرنے کی بھی کوشش کی تو وہ اُسے اُن کے گھر میں بھیج دے گا۔

بے چاری سہم کر چُپ ہو رہی۔

واقعی اس کا شوہر یہ کچھ کہنے میں حق بجانب تھا۔

تیسرے روز جب ولی محمد چلنے کے لائق ہوگیا تو نذر محمد بھی اس کے ہاں کسی کام سے آگیا، اس درمیان اس نے سختی سے اپنے گھر والوں کو تنبیہہ کردی تھی کہ وہ نذر محمد سے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کریں۔

نذر محمد سے سلام دُعا کر کے وہ بازار سے اُس کے لیے بوتل لینے کے بہانے باہر گیا اور قریباً بھاگتا ہوا اپنے گھر سے بمشکل ایک فرلانگ کی دُوری پر واقع تھانے میں جا پہنچا ——

انسپکٹر شوکت کسی کام سے باہر نکل رہا تھا جب دونوں کا آمنا سامنا ہوا۔

"تم جاؤ —— خبردار اُسے علم نہ ہونے دینا" ——

اُس نے ولی محمد سے کہا جس کا سانس بُری طرح پھُولا ہوا تھا۔

ولی محمد نے اُس کی نصیحت پر عمل کیا اور جب وہ گھر پہنچا تو نذر محمد کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہ تھانے سے ہوکر آرہا ہے۔

ولی محمد نے حفظِ ماتقدم کے لیے اُسے بتادیا کہ اُن کے ساتھ کیا گزری ہے۔ اس نے بتایا کہ پولیس کو دس ہزار روپیہ دے کر اور جوتے کھا کر اپنی جان چھُڑائی ہے۔

نذر محمد یہ بات سُن کر قدرے گھبرا گیا۔ اُس نے جیسے تیسے بوتل زہر مار کی اور فوراً اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

"میرے خیال سے مجھے چلنا چاہیئے —— بھائی ولی محمد ہماری وجہ سے جو زیادتی تمھارے ساتھ ہوئی اُس کا ازالہ تو نہیں ہوسکتا لیکن مَیں کوشش کروں گا کہ اب تمھیں پولیس تنگ نہ کرے —— لیکن تم بھی یہ بات سمجھتے ہو کہ ناخن سے گوشت الگ نہیں کیا جاسکتا بہرحال تمھاری نتھو خاں سے رشتہ داری ہے اور پولیس کو تو موقع چاہیئے کسی کو تنگ کرنے کا —— اچھا خدا حافظ" ——

ولی محمد کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ باہر آگیا —— !!

اُس کے تو وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہونے جارہا ہے۔

اس وقت انسپکٹر شوکت اور اس کے تین سپاہی سفید کپڑوں میں اس کا تعاقب کر رہے تھے اُن کے پاس دو موٹر سائیکلیں تھیں جب کہ انسپکٹر شوکت خود ایک کار میں بیٹھا تھا۔ نذر محمد کو اگر معمولی سا شک بھی ہوتا تو وہ ہوشیار ہوجاتا۔

یہاں سے اُن کے گھر کا فاصلہ پانچ میل سے کم نہیں تھا۔ اُس نے یہ فاصلہ پیدل اور بس کے ذریعے طے کیا تھا۔

لیکن ——

اپنے گھر پہنچنے تک اُسے علم ہی نہ ہوسکا کہ بلاؤں نے صغراں کا گھر دیکھ لیا ہے —— انسپکٹر شوکت قانونی طور پر تو اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا لیکن اس نے اپنے پُرانے یار عمر دین کا حق نمک اَدا کیا تھا۔ اس کو یہی ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ عمر دین کے لیے نذر محمد کے گھر کا پتہ لگاتے۔

اور ——

اُس نے یہ شیطانی کارنامہ انجام دے دیا تھا۔

عمر دین اُس وقت اپنے دیرینہ بدمعاش ساتھی شیری کے ساتھ اُس کے اڈے پر موجود تھا جب اُسے انسپکٹر شوکت کی طرف سے خوش خبری سنائی گئی۔

عمر دین کے دانت بے اختیار باہر نکل آئے۔ بالآخر اُسے اپنے شیطانی منصوبے کامیاب ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ اُس نے شوکت کا دل و جان سے شکریہ اَدا کرتے ہوئے مستقبل میں اُس کا احسان مند رہنے کا وعدہ کیا اور شیری کے ساتھ کار میں بیٹھ کر اُس علاقے کی طرف چل دیا جس کی نشاندہی کی گئی تھی۔

انھوں نے نذر محمد کے مکان کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا اور عمر دین اُسے اس کی ڈیوٹی سمجھا کر واپس اپنے ٹھکانے پر لوٹ آیا تھا جہاں سے اس نے شیری کے ہاتھوں نذر محمد کی کسی بھی بیٹی کو وصول کر کے فضل شاہ تک پہنچانا تھا جس نے اس سے آگے شیطانی منصوبے پر عمل پیرا ہونا تھا —— !

"پولیس کی پرواہ نہ کرنا —— شاہ صاحب کے ہوتے ہوئے کسی کی جرأت نہیں کہ تمھاری

طرف آنکھ بھر کر بھی دیکھ لے —— شیری خاں یہ کام بہرصورت ہونا چاہیئے۔"
عمردین نے اُسے نوٹوں کا ایک بنڈل تھماتے ہوئے کہا۔
"یار عمرے تُو ہمارا پرانا سنگی ہے۔ زندگی میں آج تک تیرا کون سا کام ہم نے نہیں کیا۔ اوئے یہ تو بالکل معمولی سا کام ہے بھائی میرے —— تُو بے فکر ہوجا اور آج رات کو لڑکی وصول کر لینا —— اوئے تُو کہے تو سارے خاندان کو باندھ کرلے آؤں ایک لڑکی کی کیا بات ہے ——"
شراب کے نشے میں دُھت شیری بدمعاش نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔
"نہیں شیری جتنا کام کہا گیا ہے۔ اتنا ہی کرنا —— تُو فضل شاہ کے غصّے کو نہیں جانتا۔"
عمردین نے اُسے قدرے اونچی آواز سے کہا تو شیری نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔
لیکن ——
شیری کے تیور بھانپ کر وہ بے شرموں کی طرح ہنس دیا۔

نذرمحمد نے گھر پہنچ کر سُکھ کا سانس لیا ——
اب اُسے جلد از جلد اس شہر سے نکل جانے کی فکر دامنگیر ہونے لگی تھی۔ حنیف محمد نے اُسے بتایا تھا کہ ایک اور شہر میں اُس نے دوسرا مکان ان کے لیے خرید لیا ہے اور اس مکان کو فروخت کرنے کے لیے نذرمحمد نے ایک پراپرٹی ڈیلر سے بات بھی کر رکھی تھی۔
اُسے اب تک دو تین بڑی اچھی پیش کشیں بھی ہوتی تھیں۔
لیکن ——
کچھ زیادہ کی اُمید پر اس نے یہ معاملہ لٹکاتے رکھا۔ جو ولی محمد نے بتایا کہ پولیس اس کے دروازے تک پہنچ گئی ہے تو اُس کا بھی ماتھا ٹھنکا ——
گو کہ اُس نے اپنی دو بیٹیاں ولی محمد کے گھر بیاہ رکھی تھیں۔ اس کے باوجود وہ یہ بات جانتا تھا کہ جب کبھی ولی محمد پر کوئی دباؤ آیا وہ فوراً ہتھیار ڈال دے گا کیونکہ وہ شروع ہی سے بالکل الگ مزاج کا آدمی تھا جس نے یہی کوشش کی تھی کہ اُس کی زندگی صاف ستھری

اور آرام سے گزرے ——
اس کی دونوں بیاہی بیٹیاں ولی محمد کے بیٹوں کے ساتھ دوسرے شہروں میں رہتی تھیں جہاں وہ اپنی نوکریوں کے لیے قیام پذیر تھے اور یہ بیٹے بھی ولی محمد سے الگ رہتے تھے۔
لیکن ——
بہرحال وہ اس کا سمدھی تھا اور رشتہ بھی اتنا نازک۔ اس نے یہی مناسب جانا کہ فی الوقت اس سے کنارہ کشی اختیار کرلے اور اگلے تین چار ماہ تک خاموشی سے صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد ہی کوئی قدم اُٹھائے۔
وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے ولی محمد کسی امتحان سے گزرے ——!!
شام ڈھل رہی تھی جب وہ اپنے گھر سے اچانک ہی اس ارادے سے باہر نکلا کہ پراپرٹی ڈیلر کے پاس جا کر اس پیشکش کے لیے ہاں کر دے اور زربیعانہ پکڑلے۔
ابھی اس نے دروازے سے قدم ہی باہر رکھا تھا جب اچانک اس کو دوبارہ اندر آنا پڑا۔ دروازے کے باہر تین ہٹے کٹے بدمعاشوں نے دیوار سی بنا رکھی تھی ——
اِن تینوں میں سے وہ صرف عمردین کے بھائی نیاز کو پہچانتا تھا۔ باقی دو شاید مقامی بدمعاش تھے۔
"نذرمحمد تم کیا سمجھتے تھے کہ عمردین اور فضل شاہ کو بے وقوف بنا دو گے —— ارے ہم تو تمھیں قبر سے باہر نکال لائیں گے —— اب دیکھنا تمھارا کیا حشر ہوتا ہے ——"
یہ کہتے ہوئے نیاز نے اس کی کمر پر اتنی زور سے لات ماری کہ نذرمحمد منہ کے بل پرے جا گرا اِس سے پہلے کہ وہ کھڑا ہو کر کوئی چیخ و پکار کرے اُن میں سے ایک بدمعاش نے اس کی گردن اس طرح دبوچ لی تھی کہ اُس کے لیے اپنے جسم کو حرکت دینا اور منہ سے آواز نکالنا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔
اس پوزیشن میں وہ اُسے گھسیٹتے ہوئے اندر لے آئے۔
جس کمرے میں وہ آئے تھے وہاں اس وقت نذرمحمد کی بیوی اور اس کی چھوٹی بیٹی زینب موجود تھی۔ حنیف خاں کی بیٹی صغراں اپنی دوسری بہن کے ساتھ بازار کچھ سودا سلف

خریدنے گئی ہوئی تھی ——!

تینوں بدمعاشوں نے چند منٹ کے اندر اندر دونوں بوڑھوں کو باندھ کر ایک طرف پھینک دیا اور اپنی مدافعت میں ہاتھ پاؤں مارتی نذر محمد کی بیٹی زینب کو مرغی کی طرح اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا ——۔

"نیاز —— بے غیرت کمینے انسان تجھ میں ہمت ہے تو مجھے گولی مار ——اِس بے چاری کا کیا گناہ۔

"نہیں نذرے مَیں تجھے گولی نہیں ماروں گا۔ تیرے جرم کی سزا یہی ہے کہ تُو زندہ رہ کر ساری زندگی اپنی بیٹی کی تباہی پر آنسو بہاتا رہے —— کل تجھے علم ہو جائے گا کہ شمشیر نگر کے باسیوں کی آنکھوں کے سامنے تیری بیٹی کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے ——"

نیاز نے اس کی بیٹی کے ساتھ ایک انتہائی غلیظ حرکت کرتے ہوئے کہا۔

رسیوں سے جکڑے دونوں میاں بیوی تڑپ اُٹھے۔ انھوں نے ظالموں کی بہت منت سماجت کی لیکن اُن درندوں کے دلوں میں انسانیت کا شائبہ تک موجود نہیں تھا۔

انھوں نے روتی بلکتی اس کی بیٹی کو اپنے کندھوں پر اٹھایا اور اس کے مُنہ پر ہاتھ رکھ کر اُسے باہر لے آئے۔

"نیازے —— حنیف خاں تیری نسل کو برباد کر دے گا —— تیرا نشٹ کر دے گا —— اگر وہ زندہ رہا تو تجھے کُتے کی موت مار ڈالے گا"——

نیاز نے نذر محمد کی آخری آواز بھی سُنی تھی۔

وہ قہقہے لگاتا باہر آ گیا ——

نذر محمد اور اس کی بیوی چیختے چلاتے اب بے ہوش ہو چکے تھے ——!!

بدمعاشوں نے زینب کو پہلے سے باہر کھڑی اپنی جیپ میں پھینکا اور محلے داروں کی آنکھوں کے سامنے للکارے مارتے اور ہوا میں گولیاں چلاتے اسے اغوا کر کے لے گئے——!

مکان کے باہر سینکڑوں لوگ تماشا دیکھنے کے لیے اکٹھے ہو گئے تھے۔

لیکن ——

ان میں سے کسی نے مزاحمت کرنے کی کوشش نہ کی۔ وہ لوگ حملہ آوروں کو پہچانتے تھے۔

یہ شبدی بدمعاش کے آدمی تھے ——

اور ——

ان میں سے کسی کے خلاف زبان کھولنا اپنی موت کو دعوت دینے والی بات ہوتی۔ ابھی اس محلے میں کوئی ایسا غیرت مند نہیں پیدا ہوا تھا جو کسی کی بہن بیٹی کی غیرت کے لیے اپنی جان پر کھیل جاتا ——

یہ تو تماش بین تھے۔

ان کا کام تماشا دیکھنا اور اس سے حظ اُٹھانا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا جب یہ خود حالات کی ستم ظریفی کے ہاتھوں تماشا بن جاتے۔

لیکن ——

اُن کی کوشش بھی ہوتی تھی کہ دوسرے کا بھلے گھر جل جائے اُن کی ذات پر آنچ نہ آئے۔ اس مجمع میں سے کسی مرد نے یہ ہمت ہی نہ کی کہ مکان کے اندر جا کر ایک نظر اس کے مکینوں کی حالت کا جائزہ ہی لے لیتا۔

انھوں نے تو پولیس کو اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا ——!

جب اُن میں سے ایک سوشل ورکر قسم کے بزرگ نے اُن کی سوئی غیرت کو جگانا چاہا تو وہ اپنے اپنے کان لپیٹ کر چل دیتے۔

دونوں نیم بے ہوش بوڑھوں کو رسیوں سے نجات صغراں اور اس کی بہن نے دلائی۔ جو ابھی ابھی بازار سے واپس لوٹی تھیں ——!!

اپنے والدین کی یہ حالت دیکھ کر اُن کے لیے خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔

لیکن ——

حنیف خاں کی بیوی صغراں جو ذہنی طور پر کسی بھی قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے شاید پہلے ہی سے تیار رہتی تھی نے اپنے اوسان خطا نہ ہونے دیئے اور اپنے والدین ہی کو

نہیں بلکہ اپنی بہن کو بھی سنبھالے رکھا ـــــ!!

رات ڈھلے تک نذر محمد کے اوسان بحال ہوئے تو وہ بادلِ نخواستہ پولیس سٹیشن کی طرف چل دیا۔ جہاں پہلے تو کسی نے اس کی بات سننے ہی سے انکار کر دیا ـــــ

جب اُس نے رو رو کر آسمان سر پر اُٹھا لیا تو ایک اے ایس آئی نے اُس کے مُنہ پر زوردار تھپیڑ جڑ کر اُسے دھکے دے کر تھانے سے باہر نکال دیا ـــــ

اس پر دیوانگی طاری ہو رہی تھی ـــــ اپنے گھر کا راستہ بھی اُسے ڈھنگ سے یاد نہیں آ رہا تھا ـــــ

صبح ڈھل رہی تھی جب وہ اپنے گھر اس حالت میں پہنچا کہ اس کا ذہنی توازن بھی تقریباً بگڑ چکا تھا۔ گھر والوں کو اب اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔

زینب نے اپنے اوسان خطا ہونے تک مزاحمت کی تھی۔

وہ زندگی اور موت سے بے نیاز ہو کر ان غنڈوں سے ٹکرا گئی تھی۔ اس کی پیدائش گاؤں میں ہوئی تھی اور وہ جانتی تھی کہ عورت کی عزت ہی دراصل اُس کی زندگی ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ عزت گئی تو پھر زندگی بھی ہاتھ سے نکل گئی ـــــ

اس نے عمردین کے بھائی کو پہچان لیا تھا ـــــ

وہ جان گئی تھی کہ اس حرام کاری کے پیچھے فضل شاہ کا ہاتھ ہے۔ شاید وہ اس کے باپ کی سرکشی کا انتقام اُسے بے آبرو کر کے لینا چاہتا تھا۔

اپنی خاندانی روایات کو سمجھتے ہوئے اُس نے یہ تو جان لیا تھا کہ اب گھر زندہ جانے کا راستہ بھی اس پر بند ہو چکا تھا کہ جو لوگ اسے اغوا کر کے لے جا رہے ہیں ان کی حیثیت فضل شاہ کی حویلی کے کتوں سے زیادہ کچھ نہیں ـــــ

یہ لوگ اُسے فضل شاہ تک بہرصورت پہنچا دیں گے۔

اور ـــــ

فضل شاہ نے اس سے بہن کا رشتہ قائم کرنے کے لیے اُسے اغوا نہیں کیا تھا ـــــ!

اس کے لیے اب ایک ہی راستہ باقی بچا تھا اور وہ تھا موت ـــــ!

اُسے مرنا تھا ـــــ

یہی ایک صورت اس کی نجات کو ممکن بتی اور کسی بھی صورت میں وہ کسی کے لیے بھی قابلِ قبول نہ ہوتی۔ اس نے بے ہوش ہونے تک ان غنڈوں کے ساتھ بہادر مردوں کی طرح مزاحمت کی تھی ـــــ!

یہ لوگ کتنے بااثر تھے ـــــ

یہ کون تھے؟

کہاں سے آئے تھے؟

ان کا فضل شاہ سے کیا رشتہ تھا؟

اُسے اِن سوالات میں سے کسی کا جواب نہیں مل رہا تھا۔

اُسے تو بے ہوش ہونے سے پہلے شدت سے اپنی بے چارگی اور قانون کی بے بسی کا احساس ہوا تھا کیونکہ سارے راستے وہ مدد کے لیے چیختی آئی تھی۔ بہت سے راہ گیروں نے اُس کی آوازیں بھی سُنی تھیں۔

لیکن ـــــ

کوئی اُس کی مدد کو نہیں آیا ـــــ!

شاید یہ سب نامرد تھے۔

بے غیرت تھے ـــــ

یا پھر مجرموں کے ساتھی تھے، کیونکہ ظلم پر خاموش رہنے والا بھی ظالم کا ساتھی ہی ہوتا ہے ـــــ!

نیاز اور مقامی غنڈے نے اُسے جیپ کی پچھلی سیٹ پر اپنے درمیان بٹھا کر بے بس کیا ہوا تھا جبکہ اگلی سیٹ پر ایک غنڈہ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا اُسے مزید تیز جیپ چلانے کے لیے مسلسل اُکسا رہا تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ میں پستول پکڑ رکھا تھا ـــــ اور اسے مسلسل لہراتا آیا تھا۔

مزاحمت کرتی زینب کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی تھی ——

دونوں غنڈوں نے اس پر قدرے سکھ کا سانس لیا کیونکہ انھیں زینب کو قابو کرنے کے لیے بڑی محنت کرنا پڑی تھی۔ وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اُن پر حملہ کرتی تھی۔ دونوں نے اب تک اس کے منہ پر اس قدر تھپڑ مار کر اُسے ٹھنڈا اور خوفزدہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

لیکن ——

خدا جانے وہ کس مٹی کی بنی ہوئی تھی۔

خدا جانے اس کے وجود میں کوئی جن حلول کر گیا تھا۔ وہ اُن کے قابو میں نہیں آ رہی تھی دونوں نے اُس کا ایک ایک بازو پکڑ رکھا تھا جبکہ زیادہ چیخنے پر وہ اس کے مُنہ پہ ہاتھ بھی رکھ دیتے تھے۔

اُس کے بے ہوش ہونے پر جب وہ نیاز کے کندھے سے لگ گئی تو دونوں نے اپنی گرفت بھی ڈھیلی کر دی تھی۔

اُن کی خواہش تھی کہ اب وہ ٹھکانے پر پہنچنے سے پہلے ہوش میں نہ آئے ——!!

قریباً بیس منٹ کے بعد وہ شہر سے باہر آ گئے تھے۔ اب انھیں نزدیکی گاؤں میں زینب کو پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق پہنچانا تھا جہاں سے آگے یہ دوسرے خبیثوں کی ذمہ داری تھی کہ اُسے آگے لے جاتے ——!

انھیں اب ریلوے لائن عبور کرنی تھی —— جس کا پھاٹک اُن کی آمد سے پہلے ہی بند ہو چکا تھا اور یہ کوئی اچھا شگون نہیں تھا۔

یہاں سے کوئی متبادل راستہ بھی اس طرف نہیں جاتا تھا۔ نیاز نے ڈرائیور سے کہا تھا کہ گاڑی کو آگے لے جاتے وہ بندوق کی نوک پر پھاٹک کھلوا کر جیپ آگے لے جانے کا پروگرام بنا چکے تھے ——

جب وہ پھاٹک کے نزدیک پہنچے تو گاڑی بھی کچھ دُور سے آتی دکھائی دے گئی جس پر انھوں نے اپنا ارادہ بدل دیا تھا۔

زینب کو گاڑی کے تیز وسل کی آواز عالم ہوش میں واپس لائی تھی ——!

ابھی بمشکل اُس کے اوسان بحال ہوتے تھے جب اُس نے اپنے بدن میں بجلیاں تڑپتی محسوس کیں۔ اُس نے آخری منظر یہی دیکھا کہ دونوں بدمعاش گاڑی کی طرف متوجہ تھے جو ریلوے پھاٹک سے بمشکل پچاس گز کے فاصلے پر تھی ——!

زینب نے زخم خوردہ شیرنی کی طرح ہوا میں زقند بھری اور اُن کی ڈھیلی ڈھالی گرفت سے آزاد ہو کر جیپ سے باہر گر پڑی۔

اس سے پہلے کہ دونوں کو کچھ سمجھ آتے اُس نے ریلوے لائن کی طرف دوڑ لگا دی ——

دونوں اُسے گالیاں دیتے جیپ سے باہر آئے تھے۔

لیکن ——

اب خاصی دیر ہو چکی تھی ——

زینب اور ریل کا انجن ایک ہی وقت میں ریلوے لائن کے درمیان پہنچے تھے ——

برق رفتار آگ اُگلتے انجن نے حیا اور ایمان کی اِس دیوی کے جسم کو ہوا میں اُچھالا اور پرے پھینک دیا۔ فرشتہ اجل نے اس کی لاج یوں رکھی کہ زمین پر اُس کا بدن گرنے سے پہلے ہی اس کی رُوح قبض کر لی اور دوسرے ہی لمحے وہ خدا کے حضور پہنچ گئی۔ جہاں حُوریں اس کے استقبال کو دیدہ و دل فرشِ راہ کیے کھڑی تھیں ——!

صورت حال نے اتنی تیزی سے پلٹا کھایا تھا کہ اُن میں سے کسی کو کچھ سوچنے کا موقعہ ہی نہ مل سکا۔

زینب کے اس انتہائی دلیرانہ اقدام نے انھیں بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ لرز کر رہ گئے۔!

اتنی بہادر اور باکردار لڑکی انھوں نے زندگی میں اس سے پہلے دیکھی کہاں تھی۔

ریلوے پھاٹک کے دونوں طرف موجود لوگ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کے مُردہ جسم کے گرد دائرہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

شیدی کے آدمیوں نے یہ مہلت غنیمت جانی اور وہ جیپ کو مختلف گاڑیوں سے ٹکراتے ہوا میں فائرنگ کرتے دوبارہ شہر کی طرف واپس لوٹ گئے۔

اِس مرتبہ حنیف خاں بالکل غیر ارادی طور پر نذر محمد سے ملنے آیا تھا ——!
مکان کے سامنے قطعہ زمین پر جب اُس نے شامیانے اور دریاں بچھی دیکھیں تو ایک
لمحے کے لیے اُسے اپنے دل کی دھڑکن بے قابو ہوتی محسوس ہوئی۔

"خدا نہ کرے کہیں ماما نذر محمد ——"

اُس نے گھبراہٹ میں یہی رائے قائم کی اور وہاں سے ہٹ گیا۔

کچھ بزرگ سے لوگ اِن پر بیٹھے شاید قرآن خوانی کر رہے تھے۔ حنیف خاں کو دُور
سے اُن میں سے ایک آشنا چہرہ نظر آیا تو اُس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ یہ نمبردار احمد دین کا لڑکا
فیروز تھا ——!

وہ ایک کونے میں بظاہر اجنبیوں کی طرح اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ اب کسی طرح
فیروز کو اپنی طرف متوجہ کر سکے۔

اس امکان کو اُس نے نظر انداز نہیں کیا تھا کہ یہاں پولیس کے مخبر بھی ضرور موجود ہوں
گے۔ عین ممکن تھا کہ پولیس نے اِس علاقے ہی کو گھیرے میں لے رکھا ہو کیونکہ انھیں اس بات کی
اُمید ضرور ہوگی کہ حنیف خاں یہاں آئے گا ——!

تقریباً پندرہ بیس منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد اس نے فیروز کو جوتی پہن کر اپنی
طرف آتے دیکھا۔ شاید وہ کسی کام سے اسی محلے کے بازار کی طرف جا رہا تھا۔

وہ ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

تھوڑے فاصلے تک فیروز کا تعاقب کرنے کے بعد جب اُسے یقین ہو گیا کہ کوئی خطرے
والی بات نہیں ہے تو اُس نے پُشت سے اُسے مخاطب کر کے اپنی طرف متوجہ کیا ——!

حنیف خاں کو اپنے سامنے پا کر فیروز ایک لمحے کے لیے تو ٹھٹھک کر ہی رہ گیا۔ بے اختیار
اُس نے اپنی بانہیں کھولیں اور فیروز کو اپنی باہوں میں سمیٹ لیا ——!

دونوں ایک دوسرے کو گرم جوشی سے بغل گیر ہوتے تھے ——

ابھی تک دونوں خاموش تھے ——

حنیف خاں نے کوئی سوال نہیں کیا تھا نہ ہی فیروز نے اس سے کچھ دریافت کیا تھا۔

"یہ جگہ مناسب نہیں میرے ساتھ آجاؤ —— کہیں اور چلتے ہیں" ——

حنیف خاں نے اُسے کہا اور فیروز نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

فیروز کو اپنے ساتھ وہ یہاں سے کچھ دُور ایک باغ میں لے آیا تھا۔

یہ ایک تفریحی پارک تھا جس میں اس وقت کوئی خاص رش نہیں تھا۔ دونوں سر جھکائے
ایک کونے میں جا بیٹھے۔

فیروز نے حنیف خاں کو بغیر لگی لپٹی رکھے ساری داستان سُنا دی تھی، جب وہ اُسے
لوگوں کی زبانی سُنی زینب کی کہانی سُنا رہا تھا تو بے اختیار حنیف خاں کی آنکھیں بھر آئیں ——!

"حنیف خاں —— میں شروع ہی سے اس بات کا مخالف تھا کہ تم اپنی گاؤں کی
زمین فروخت کر دو۔ اوئے ہم ابھی اتنے کمزور نہیں ہوئے کہ اپنے ایک بزرگ کے گھرانے کی حفاظت
نہ کر سکیں۔ اُس گاؤں کا کون سا ایسا گھر ہے جس پر تمھارے باپ کے احسانات نہیں ہیں ——
کس کی ہمت تھی جو اس طرح وہاں گھس کر نذر محمد پر حملہ آور ہوتا —— تم نے اپنے کُنبے کو یہاں
بھیڑوں کے سامنے لا کر پھینک دیا۔ ارے ! یہ لوگ تو اپنی جان کی حفاظت نہیں کر سکتے کسی کی
کیا کریں گے —— حنیف خاں میرا باپ اور میرا سارا خاندان تمھارے ساتھ جینے مرنے کے لیے
تیار ہے۔ ابھی تک زمین کا باقاعدہ انتقال نہیں ہوا —— اگر رقم واپس لوٹانے کے لیے تمھیں
مہلت درکار ہے تو میں وہ بھی لے دوں گا —— لیکن خدا کے لیے اپنے گھر والوں کو اس جہنم
میں نہ رکھو۔ انھیں اپنے گھر میں واپس بھیج دو —— یہ میری ہی نہیں ساری برادری کی خواہش
ہے —— تمھارا بیٹا صرف تمھارا نہیں سارے شمشیر نگر کا بیٹا ہے —— ہم سب اس کی حفاظت
کے لیے کٹ مریں گے —— مجھے لگتا ہے یہ حکومت اگلے سات آٹھ مہینے کے بعد ٹوٹ جائے گی
اور نئے الیکشن ہوں گے۔ ایک مرتبہ جب فضل شاہ سرکاری عہدے دار نہ رہا تو ہم اس سے
بھی نمٹ لیں گے —— تم اس وقت پیش ہو جانا ہم بھی اپنی جان لڑا دیں گے —— تمھیں پھانسی
نہیں چڑھنے دیں گے ——"

فیروز نے اُسے سمجھایا۔

اور ——

اس کی بات حنیف خاں کے ذہن میں بیٹھ گئی۔

واقعی اس نے جو فیصلہ اپنے خاندان کو سرداروں اور فضل شاہ سے بچانے کے لیے کیا تھا۔ وہ اُن کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوا تھا۔

اس کے گاؤں کے لوگ مرتے مر جاتے لیکن اس طرح بے بسی سے زینب کے اغوا کا تماشا نہ دیکھتے۔ یوں بھی ایسی ایک کوشش کر کے اس کے دشمنوں نے پہلے ہی اس کے گاؤں کے مکینوں کو آزما لیا تھا اور اندازہ کر لیا تھا کہ آزمائش آنے پر یہ لوگ کمزور پڑنے والے نہیں تھے!!

" فیروز یار ——— تم واقعی کسی کرموں والی کے جنے ہو ——— مَیں ساری زندگی تمھارے احسانات نہیں اُتار سکوں گا ——— تم نے بالکل ٹھیک کہا ہے ——— واقعی مَیں نے ان لوگوں کو شہر میں لا کر غلطی کی ہے ——— اب انھیں واپس ہی جانا چاہیئے ——— مَیں مہلت نہیں مانگ رہا۔ تین لاکھ روپیہ انھیں ایک ہفتے میں پہنچا دوں گا ———

لیکن ——— مامے نذر محمد کی واپسی ایسے نہیں ہونی چاہیئے۔ مجھے قسم ہے میرے پیدا کرنے والی کی جب تک عمر دین کو یہ "بھاجی" واپس نہ موڑ دوں ——— مجھ پر زندگی حرام ہے ———"

اُس نے یہ کہتے ہوتے اُٹھ کر کھڑے ہونا چاہا۔

لیکن ———

فیروز نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے زبردستی دوبارہ بیٹھ جانے پر مجبور کر دیا۔

" تم پھر وہی غلطی کرنے جا رہے ہو حنیف خاں ——— تم ہو نتھو خاں کے بیٹے ——— لیکن تمھارا واسطہ بڑے مکار غنڈوں سے آن پڑا ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ ان ہی کے ہتھیار سے جنگ لڑی جاتے تو ہی بہتر ہے ——— اب کوئی قدم جذبات میں آ کر نہ اُٹھانا ——— تم اکیلے ہو۔ مَیں تمھاری بہادری پر شک نہیں کر رہا۔ لیکن دشمن کی فوج کے سامنے اکیلے کھڑے ہو جانے کو مَیں بہادری نہیں سمجھتا ——— جس آگ میں تم جل رہے ہو اس میں موراں والی کا نکڑا بھی جل رہا ہے جس کا مال عمر دین نے پکڑوا کر اُسے تفتیش بھی کٹوائی تھی اور اس کی بیوی کو بے عزت کرنے کی کوشش بھی کی تھی ——— اب نکڑے کو ذرا ہوش آیا ہے۔ مَیں آج ہی اُس سے رابطہ کرتا ہوں۔ تمھاری اور اس کی ملاقات کروا تا ہوں۔ وہ بھی جوان آدمی ہے تمھاری بہت قدر کرے گا۔ میرے تعلق والا ہے اور پھر دشمن کا دشمن ہمیشہ اپنا دوست ہوتا ہے ——— ایک تو ایک ہی ہوتا ہے حنیف خاں جب دو مل جائیں تو گیارہ بنتے ہیں ——— مَیں بھی تمھارے ساتھ ہوں گا لیکن منہ ڈھانپ کر ——— زینب ہماری بھی بیٹی تھی ——— ہماری برادری کی عزت تھی۔ ہمارا بھی کچھ فرض بنتا ہے ——— یا نہیں۔ تم اکیلے کیا سارے جہان سے لڑو گے ———"

اُس کے پاس فیروز کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں بچا تھا ———!

واقعی وہ اکیلا ساری دُنیا سے نہیں ٹکرا سکتا تھا۔

اُسے بھی جوڑ توڑ سے کام لینا تھا۔

اور ———

نمبردار احمد دین نہ صرف اس کام میں مہارت رکھتا تھا، بلکہ اس کا دل و جان سے ہمدرد بھی تھا۔

فیروز نے اس سے درخواست کی تھی کہ وہ اس وقت نذر محمد سے ملے بغیر ہی واپس لوٹ جائے کیونکہ اُسے بھی اس بات کا شک ہے کہ یہاں پولیس نے اس کی ممکنہ آمد کے پیشِ نظر ناکے لگا رکھے ہیں ——— اُس کو تو نذر محمد کے گھر تعزیت کے لیے آنے والے ایک دو آدمی بھی مشکوک دکھائی دیتے تھے ———!!

فیروز نے اس کے ساتھ اگلے روز رات کو ملاقات کا وعدہ کیا تھا۔

اس ملاقات کے لیے اُس نے یہاں سے بیس میل دُور اپنے ایک خاص آدمی کا ایڈریس دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ یہاں بڑے اعتماد اور اطمینان سے آ سکتا ہے۔

حنیف خاں بڑے بوجھل قدموں سے واپس لوٹا تھا۔

اُس نے اپنے گھر پہنچ کر سب سے پہلے اپنی جمع پونجی سنبھالی تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی نمبردار احمد دین کا زیرِ بار رہنا نہیں چاہتا تھا ———

دوسرے روز وعدے کے مطابق وہ شام ڈھلنے تک فیروز کے بتائے ٹھکانے پر پہنچ گیا ——— یہاں موراں والی کا نکڑا اور فیروز اس کے بے چینی سے منتظر تھے۔

نکڑے نے اُس کا استقبال بڑی گرم جوشی سے کیا تھا ———!

شیر کا بچہ

موراں والی کا نکرا کبھی عمر دین کا ساتھی تھا۔

لیکن ——

اپنی فطرت کے عین مطابق وقت آنے پر عمر دین نے اُسے بھی ڈس لیا اور مقامی پوسٹ والوں کے ساتھ مل کر اُس کا مال پکڑوا کر آدھا خود ہضم کر لیا اور آدھا مال پکڑنے والوں کی بھینٹ چڑھا دیا —— !

عمر دین نے اس پر اکتفا نہیں کیا تھا، بلکہ یار ماری کرتے ہوئے اُسے تفتیش بھی کٹوا دی تھی۔

وہ تو شاید جیل جانے کے بعد نکرے کا گھر بار بھی بکوا دیتا، لیکن اس مرحلے پر شمشیر نگر کے نمبردار احمد دین کے لڑکے فیروز نے اُس کا ساتھ دیا اور نہ صرف اُس کے بیوی بچوں کو عمر دین کے عتاب سے محفوظ رکھا بلکہ تمام خطرات مول لے کر اُسے جیل سے ضمانت پر بھی رہا کروایا ——

نکرے کو بہت زبردست کاروباری دھچکا لگا تھا۔

اُس کے پاس کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ صرف ایک "ساکھ" ہی رہ گئی تھی لیکن پلے دو کوڑیاں نہ ہونے کے سبب یہ ساکھ بھی کسی کام نہیں آسکتی تھی۔ سرحد پار کے سمگلروں کا اُس کے سر خاصا قرض چڑھ گیا تھا۔ ان حالات میں فیروز پھر اُس کے آڑے آیا اُس نے نکرے کے لیے ڈیڑھ دو لاکھ کا بندوبست کیا اور اُس کے سرحد پار چوری چھپے اپنے علاقے سے دو تین کامیاب چکر لگوائے تو نکرا کہیں اس قابل ہوا تھا کہ اپنی دنیا میں سر اُٹھا کر چل سکے۔

اس درمیان اُس کے دل میں صرف ایک ہی خواہش بار بار سر اُٹھاتی اور اُسے تڑپا کر رکھ دیتی وہ اپنے ہاتھوں عمر دین کی تکا بوٹی کرنا چاہتا تھا۔ جس نے اُس کی غیر موجودگی میں

اُس کی بیوی کو سارے گاؤں والوں کے سامنے گالیاں دی تھیں اور دھمکیاں دے کر گیا تھا۔

عمر دین کا گھر اُس سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا ——

وہ یہاں سے تیسرے گاؤں میں رہتا تھا۔ نکرا جب چاہتا اپنا حساب برابر کر دیتا۔

لیکن ——

اُسے علم تھا کہ گزشتہ ڈیڑھ دو سال سے وہ فضل شاہ کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ اور ان حالات میں اُسی سے ٹکرانا فضل شاہ کے عتاب کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا۔

زخم خوردہ سانپ کی طرح وہ اپنی بے بسی پر تلملا کر رہ جاتا۔

لیکن ——

عمر دین کا کچھ نہ بگاڑ پاتا۔

آج جب فیروز نے اُسے بتایا کہ تھوفاں کا مفرور بیٹا حنیف خان بھی عمر دین کے خون کا پیاسا ہو رہا ہے تو اُسے اپنی دلی مراد لہراتی نظر آئی۔ ایسے جواں مرد کا ساتھ میسر آنے کا مطلب تھا کہ قدرت کو اُس کی بے بسی پر رحم آ گیا ہے۔ ورنہ اُسے تو اب اپنی مردانگی بھی مشکوک دکھائی دینے لگی تھی۔

دونوں عمر دین کے ڈسے ہوئے تھے۔

دونوں کی غیرت پر عمر دین نے فضل شاہ کے کندھوں پر چڑھ کر ضرب لگائی تھی۔ چونکہ حنیف خان کو فضل شاہ کے نزدیک رہنے کا موقع ملا تھا۔ اس لئے وہ کبھی اُس کے رعب داب سے متاثر نہیں ہوا تھا وہ جانتا تھا فضل شاہ کی ساری بدمعاشی مقامی تھانے اور مفرور بدمعاشوں کے بل بوتے پر قائم ہے۔ جس روز پولیس اور بدمعاشوں کو یقین ہو گیا کوئی اُس سے بھی ٹکرا سکتا ہے۔ اُس روز وہ اپنا ہاتھ کھینچ لیں گے اور اُس دن فضل شاہ کی حیثیت زہریلے سانپ سے ایک کینچوے کی بن کر رہ جائے گی کیونکہ اُس کے زہر کے دانت نکل چکے ہوں گے —— !!

جہاں تک سرداروں کا تعلق تھا —— !

انہیں حنیف خان نے بڑا زبردست دھچکا لگایا تھا۔ سردار مرید، سردار رشید کا

اکلوتا بھائی تھا جس کی موت کے بعد سردار رشید کے لئے کھل کر سامنے آنا بہت مشکل تھا کیونکہ اب اپنے کنبے کا وہی سربراہ تھا اور باقی لوگ اس قابل نہیں تھے کہ اپنا دائرہ اختیار اُس کی طرح گاؤں کی حدوں سے باہر بھی پھیلاتے۔

سردار مرید کو قتل کر کے حنیف خاں نے اُسے یہ احساس دلا دیا تھا کہ وہ فضل شاہ کی معاونت کے باوجود اُس کے لئے کچھ حیثیت نہیں رکھتا۔

اور ——

دوسری طرف سردار رشید یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ اُس سے بڑا گدھا پلوال میں ابھی تک کوئی پیدا ہی نہیں ہوا۔

اُس نے زندگی میں سب سے بڑی غلطی ریاست شاہ سے ہاتھ ملا کر کی تھی۔

اپنے بھائی کی جان سے تو ہاتھ دھوتے ہی پڑے تھے جبکہ اُس کا دیرینہ اور مخلص ساتھی عالم داد بھی فضل شاہ کی مکّارانہ سیاست کی بھینٹ چڑھ چکا تھا۔ نتھو خاں کے بیٹے سے دشمنی الگ مول لی۔ ان حالات میں اگر عالم داد اُس کے ساتھ ہوتا تو بھی اُسے بڑا سہارا مل سکتا تھا۔

لیکن ——

اب تو وہ بالکل تہی دست تھا۔

یونین کونسل کی سیٹ اُس کے بھائی کی موت سے اُن کے ہاتھ سے نکل چکی تھی جس پر دوبارہ اُن کا قبضہ ہونا بالکل ناممکن سی بات تھی کیونکہ فضل شاہ نے اُس کے ساتھ سردار مرید کو چیئرمین بنانے کا وعدہ کیا تھا اُس نے سرداروں کے سارے خاندان کی کفالت کا بیڑہ نہیں اُٹھایا تھا۔

جس فضل شاہ کے جھانسے میں آکر اُس نے عالم داد جیسے اپنے دیرینہ اور مخلص ساتھی کو اپنا جانی دشمن بنا لیا تھا۔ اُس پر سردار رشید کو اب اتنا اعتماد بھی نہیں رہا تھا کہ وہ شہر میں اپنی نقل و حرکت ہی اُس کے علم میں لاتا۔

ایسے کینے اور ریا کار شخص سے کیا اُمید تھی کہ وہ کہیں اُس کا ہی صفایا نہ کروا دیتا —— !

سردار رشید کے پاس اس سوچ کے شواہد موجود تھے کہ ضرور فضل شاہ نے حنیف خاں

سے بھی اندر خانے کوئی معاملہ طے کر لیا ہوگا۔

اُس سے کسی بھی حرامکاری کی توقع کی جا سکتی تھی۔

اُس نے آج مدت کے بعد اپنی برادری کے لوگوں کو اکٹھا کیا تھا جنہوں نے اُسے یہی مشورہ دیا کہ وہ فوراً فضل شاہ کے چنگل سے نکلے اور عالم داد کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ازالہ کرے ——

برادری والوں نے سردار مرید کی طرف سے فضل شاہ کے جھانسے میں آکر حنیف خاں کی بیوی کو اغوا کرنے کی کوشش اور اُس کے نتیجے میں ہونے والے نتھو خاں کی بیوی کے قتل کا ذمہ دار بھی سردار مرید کو ٹھہراتے ہوئے اُس کے اس فعل کی کھل کر مذمت کی تھی۔

انہوں نے کہا تھا کہ ایسا گھٹیا اقدام کر کے سرداروں نے پلوال کی عزت کو داغدار کرنے کے سوا کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔

سردار رشید کے رضامند ہونے پر برادری کے بزرگوں کا ایک وفد عالم داد سے ملاقات کرنے جیل جا رہا تھا تا کہ دونوں کی صلح کروا کے اور اُسے صورتحال کی سنگینی کا احساس دلا کر دوبارہ دونوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا جا سکے۔

یہ ساری کوششیں فضل شاہ کو لاعلم رکھ کر کی جا رہی تھیں کیونکہ انہیں بھی اب فضل شاہ کے ساتھ طاقت کی بجائے سیاست سے مقابلہ کرنا تھا۔



ٹاما نوالی کے مکین شام ڈھلے اپنے گھروں کے آنگنوں میں بچھی چارپائیوں پر آرام کر رہے تھے۔ کھیتوں سے تھک کر لوٹنے والوں کے لئے اُن کی سوانیاں کھانوں کے خوان سجا رہی تھیں اور بزرگ اپنے حقے تازہ کر رہے تھے جب گاؤں کی فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اُٹھی —— !

نمبردار عمر دین کی حویلی سے شور برآمد ہو رہا تھا۔ چار گھڑ سواروں نے عمر دین اور اُس کے بھائی نیاز کو بندوق کی نوک پر اُن کے محفوظ گھر سے نکالا اور اب اُن کو اپنے گھوڑوں کے پیچھے باندھ کر گھسیٹتے ہوئے گاؤں کے کونے میں موجود چارہ کاٹنے والے ٹوکے پر لے

آئے تھے ــــ !

فائرنگ کی آوازیں اِس گاؤں کے مکینوں کے لئے کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔

لیکن ــــ

یہاں فائرنگ رات کے اندھیرے میں اکثر سمگلروں اور رینجرز کے درمیان ہوا کرتی تھی گاؤں میں اگر کبھی گولی چلتی تو عمر دین نمبردار کے گھر والوں کی طرف سے ہی کسی پر چلائی جاتی تھی۔

عمر دین نے گزشتہ ڈیڑھ سال سے جس تیزی سے عروج حاصل کیا اور جس طرح سرکار دربار میں اس نے اپنی ساکھ بنائی تھی اُس کے بعد سے تو گاؤں کے اکثر لوگ اُس سے کنّی کترا کر گزرا کرتے تھے ــــ !!

آج جب انہوں نے اپنے کچّے مکانوں کی منڈیروں اور چھتوں سے شام کے ملگجے اندھیرے میں کچھ گھڑ سواروں کو اُن کی درگت بناتے دیکھا تو وہ اِسے مکافاتِ عمل جان کر ہی سہم کر رہ گئے۔

"ٹامانوالی کے لوگو مجھے پہچان لو ــــ میں شمشیر نگر کے نتھو خاں کا بیٹا حنیف خان ہوں ــــ"

اچانک ایک قہر برساتی آواز نے گاؤں والوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

عمر دین اور اس کے بھائی نیاز نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا تھا۔ انہوں نے نتھو خاں کی ایک بیٹی کو اغوا کر کے بے آبرو کرنا چاہا ــــ وہ تو مر گئی، لیکن اِن موذیوں کو ہمارے حوالے کر گئی۔ انہوں نے سمجھ لیا ہو گا کہ نتھو خان مر گیا ہے اور اس کا بیٹا پولیس اور فضل شاہ سے چھپتا پھرتا ہے۔ اب میدان خالی ہے۔ لیکن میں اس علاقے کے ایک ایک بچے کو آج یہ پیغام دے جاؤں گا کہ مرنے کے بعد بھی نتھو خاں کی روح اِس علاقے پر ابھی صدیوں تک حکومت کرتی رہے گی ــــ ٹامانوالی کے باسیو! اپنے خاندان کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والوں کو میں عبرت کا ایسا نمونہ بنا کر جاؤں گا کہ پھر کسی کو شمشیر نگر کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی ہمت بھی نہیں ہو گی ــــ"

اُس کی بات کے خاتمے پر دوسرے گھڑ سواروں میں سے ایک نے للکار کر کہا۔

"مجھے بھی پہچان لو ــــ میں نکڑا ہوں ــــ نکڑا ــــ جس کی بیوی کو اِس احسان فراموش ذلیل انسان نے بے عزت کیا ــــ اِس نے میرے احسانوں کا بدلہ میری عزت پر حملے سے دیا ــــ اب یہ اپنے انجام کو پہنچے گا"۔

اِس کے ساتھ ہی انہوں نے ہوائی فائرنگ شروع کر دی ــــ

ٹامانوالی کے خوفزدہ مکینوں کی آنکھوں کے سامنے اب رومن اکھاڑہ سجا ہوا تھا ــــ!!

پہلے حنیف خاں نے اپنے گھوڑے کے ساتھ گھسیٹتے نیاز کو جھٹکا دے کر اپنے قدموں میں گرایا اور اس کے منہ پر زور دار ٹھوکر مار کر تھوک دیا۔ اس نے گاؤں کے لوگوں سے للکار کر کہا کہ اُس نے اپنے جن ناپاک ہاتھوں سے میری بہن کی عزت سے کھیلنا چاہا تھا وہ اب کبھی اس کے بدن کا حصّہ نہیں رہیں گے ــــ!

اپنے ساتھیوں کی مدد سے اُس نے نیاز کا ایک بازو چارہ کاٹنے والے ٹوکے میں دیا اور بے رحمی سے اُس کا بازو چارے کی طرح کاٹ کر پھینک دیا۔

اُس کے دوسرے بازو کے ساتھ بھی حنیف خاں نے یہی سلوک کیا اور ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپتے نیاز کو وہیں پھینک کر اُس کے دونوں کٹے ہوئے بازو اٹھا کر اپنے گھوڑے کی زین سے لٹکتے تھیلے میں ڈال لئے ــــ

اِس کے بعد عمر دین نمبردار کی باری تھی۔ جس پر موت کے خوف نے دہشت طاری کر دی تھی اور یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے اِس کی روح فرشتۂ اجل نے پہلے ہی سے قبض کر لی ہو ــــ!!

نکڑے اور حنیفے نے مل کر اس کی دونوں آنکھیں پھوڑ کر اُسے اندھا کر دیا تھا ــــ!!

انہوں نے دونوں بھائیوں کو نشانِ عبرت بنا دیا تھا ــــ!

اُن میں سے ایک اندھا اور دوسرا دونوں ہاتھوں سے محتاج ہو چکا تھا۔ دونوں کو نیم مردہ حالت میں چھوڑ کر وہ ہوائی فائرنگ کرتے فرار ہو گئے ــــ!!

جب تک پولیس یا فضل شاہ کے آدمی وہاں پہنچتے۔ حملہ آور اپنا کام مکمل کر کے جا چکے تھے۔ پولیس کی آمد سے صرف یہ ہوا کہ دونوں مرنے سے بچ گئے۔ انہیں ہسپتال

پہنچا دیا گیا۔ فضل شاہ کے ٹیلی فونوں پر چیخنے چلّانے سے دوسرے دن صبح ہونے پر شہر سے آئی پولیس کی ریزرو فورس نے سارے علاقے کو گھیرے میں لے کر اپنی دانست میں بڑے جنگی پیمانے پر ملزموں کی گرفتاری کی کارروائی شروع کر دی تھی۔

حنیف خان کا تو انہیں کوئی سراغ نہ مل سکا۔ البتہ شمشیر نگر کے قبرستان میں نتھو خاں کے پہلو میں بنی نذر محمد کی بیٹی کی قبر پر جس کی مٹی بھی ابھی پوری طرح نہیں خشک ہوئی تھی، پولیس کو نمبردار عمر دین کے بھائی نیاز کے دونوں کٹے ہوئے بازو مل گئے ـــــ!

یہ وہ ہاتھ تھے جو زینب کی عزت کی طرف بڑھے تھے۔

اور ـــــ

جنہیں حنیف خان نے تن سے الگ کر کے اُس کے قدموں میں لا کر ڈال دیا تھا!

"واہ شیر دیا بچیا"

ایس ایچ او چوہدری حاکم علی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

اپنے سرکاری فرائض کے باوجود یہاں پہنچنے والے پولیس کے جوان دل ہی دل میں حنیف خان کو جانے کتنی مرتبہ نذرِ عقیدت گزار چکے تھے۔ جس نے فضل شاہ جیسے موذی کی دشمنی مول لیتے ہوئے اور مفرور ہونے کے باوجود اپنی بے عزتی کا قرض تین روز بعد ہی چکا دیا تھا۔

یہاں موجود اکثر پولیس والے اُس کے لئے اپنے دل میں بے پناہ احترام محسوس کر رہے تھے۔ کبھی وہ لوگ نتھو خاں کے متعلق بھی ایسے ہی جذبات رکھتے تھے۔

نکّو کو پولیس نے شہر کے ایک تھانے سے برآمد کیا تھا۔ پولیس کے اپنے ریکارڈ کے مطابق وہ یہاں گزشتہ ۴۸ گھنٹے سے زیرِ حراست تھا۔ اُس پر شہر کے ایک سینما کے باہر دنگا فساد کرنے کا الزام تھا۔ پہلے دن پولیس نے اُس کی گرفتاری ڈالی تھی اور اگلے روز اُس کے خلاف پرچہ درج کر کے اُسے جوڈیشنل ریمانڈ پر جیل بھیجنے کی تیاریاں کر رہی تھی ـــــ

یہ شمشیر نگر کے نمبردار احمد دین کا کارنامہ تھا ـــــ!

باقی دونوں حملہ آوروں کی کوئی شناخت نہ کر سکا۔ جب مقامی ایس ایچ او چوہدری

حاکم علی جس نے حال ہی میں تھانے کا چارج سنبھالا تھا۔ ٹامانوالی پہنچا تو یہ دیکھ کر اُس کی حیرت گم ہو گئی کہ وہاں کا کوئی بھی مکین حملہ آوروں کی شناخت کرنے کے لئے تیار نہیں تھا!!

حاکم علی اور فضل شاہ کے آدمیوں کے لاکھ سر پٹخنے اور دھمکیاں دینے کے باوجود کسی نے بھی اپنا بیان لکھوانے سے انکار کر دیا تھا۔ مجبوراً حاکم علی کو گمنام حملہ آوروں کے خلاف پرچہ درج کرنا پڑا۔ اِس نے پولیس رپورٹ کے مطابق اِس حملے میں حنیف خاں کا ہاتھ ہونے کا شک ضرور ظاہر کیا تھا۔

لیکن ـــــ

کوئی واقعاتی شہادت اُسے میسر نہیں آ سکی تھی۔

پورے علاقے میں ایک مرتبہ پھر حنیف خاں کی دہشت پھیل گئی تھی ـــــ

کبھی اِس طرح لوگ نتھو خاں کی کہانیاں اپنے بچوں کو سنایا کرتے تھے آج حنیف خاں کا موضوعِ گفتگو بنا ہوا تھا۔ نذر محمد نے یہ ساری کہانی اخبارات میں پڑھی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اُسے اِس نوعیت کی کسی واردات پر خوشی ہوئی تھی۔

زینب کے اغوا اور پھر قتل سے جو بوجھ سا اُس کے دل و دماغ پر آن پڑا تھا وہ حنیف خان نے ایک ہی پل میں اُٹھا کر پرے رکھ دیا تھا۔ اُسے احساس ہوا کہ اب وہ بھی سر اُٹھا کر چل سکتا ہے۔ آٹھ دس روز بعد جب شمشیر نگر میں یہ خبر پہنچی کہ نذر محمد واپس آ گیا ہے اور حنیف خان نے اپنی ساری جائیداد اِس کے نام منتقل کر دی ہے تو لوگ حیران رہ گئے۔

اب فضل شاہ کے پاس اُس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا کوئی اختیار نہیں رہ گیا تھا کیونکہ حنیف خان نے اپنی زمین جائیداد نمبردار احمد دین کے ہاتھ فروخت کر دی تھی جس نے یہ جائیداد دوبارہ نذر محمد کو فروخت کی تھی۔ قانون میں جائیداد کے لین دین اور خرید و فروخت پر کوئی پابندی نہیں تھی اور نہ ہی ایسا کرنے والے پر کوئی گرفت ہو سکتی تھی۔ نذر محمد کی شمشیر نگر میں دوبارہ آمد فضل شاہ کے لیے نیک شگون نہیں تھا۔ دوسری طرف اُس نے سرداروں کے بدلتے ہوئے تیور بھی بھانپ لئے تھے۔ اُس کے گمراہ اور شیطانی ذہن نے اُسے سمجھایا کہ

جیسے یہ سب کچھ اُس کے خلاف کسی گہری سازش کا حصّہ ہے اور اُسے یوں لگا جیسے حنیف خان اور سرداروں کے درمیان صلح ہو گئی ہے۔ یہ بات تو اُسے جیل سے معلوم ہو چکی تھی کہ عالم داد سے سردار محمد رشید کی ملاقات کروا دی گئی ہے جس نے جیل سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں ساری برادری کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے عالم داد سے معافی مانگی تھی اور اُسے یقین دلایا تھا کہ آئندہ زندگی میں اُس سے کوئی اور گناہ تو سرزد ہو سکتا ہے۔

لیکن ——

وہ فضل شاہ کے چکر میں کبھی نہیں آئے گا۔

نمبردار احمد دین خاموش نہیں بیٹھا تھا۔ حالات پر اُس کی نظر تھی۔ جب اُس کے آدمیوں نے پلال سے اطلاع دی کہ سردار رشید اور عالم داد میں صلح ہو گئی ہے تو اُس نے موقعہ غنیمت جانا اور نذر محمد کو بھی مشورہ دیا کہ فوراً سرداروں سے رابطہ قائم کر کے حنیف خان کی اُن کے ساتھ صلح کروانے کی کوشش کرے۔

احمد دین میرا تو دماغ ہی کام نہیں کر رہا۔ میری طرف سے تمہیں مکمل اختیارات حاصل ہیں تم جو بھی چاہو کرو۔ میرے خیال سے جس طرح تم نے حنیف خان کا ساتھ دیا ہے اُس کے باپ کی روح خوش ہو گئی ہوگی —— اب بھی جو کچھ کرنا ہے تم ہی کرو گے“ ——

نذر محمد نے سنجیدگی سے کہا۔

اُس نے یہ بات یوں ہی نہیں کہہ دی تھی۔ اِن حالات میں واقعی اگر انہیں اُمید کی کوئی کرن یہاں دکھائی دی تھی تو وہ احمد دین اور اُس کے لڑکے ہی تھے جنہوں نے جی جان سے اُن کا ساتھ دیا تھا اور انہیں اِس قابل کیا تھا کہ اپنے باپ دادا کی زمین پر دوبارہ آباد ہوں۔

نذر محمد ایک بات تو بخوبی سمجھتا تھا کہ حنیف خان کتنا ہی بہادر کیوں نہ ہو جائے وہ مکاری اور ریاکاری میں فضل شاہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

سرکار دربار میں فضل شاہ کے بزرگوں نے جو ساکھ بنا رکھی تھی وہ آج اُس کے کام آ رہی تھی اور اِس محاذ پر حنیف خان اُس کے مقابلے میں بالکل تہی دست تھا۔ اُسے بہرحال سرداروں

کا تعاون درکار تھا جو کہ کسی حد تک تو اِس معاملے میں اُس کی مدد کر سکتے تھے۔ نذر محمد کی شدید خواہش تھی کہ اِس سے پہلے کہ حنیف خان کے جرائم کی فہرست اتنی طویل ہو جائے کہ پھر گولی مارنے کے علاوہ حکومت کے پاس کوئی چارہ ہی باقی نہ بچے وہ پولیس کے سامنے پیش ہو جائے سردار رشید سے اگر بات بن جاتی تو وہ یہ کام ضرور کروا سکتا تھا کہ اُس کی زندگی کی ضمانت پر اُسے شہر میں کسی اعلیٰ پولیس افسر کے سامنے پیش کروا دیتا —— !

حنیف خاں اِس مرتبہ واپس لوٹا تو ایک اور حیرت اُس کی منتظر تھی۔ نذیرہ موچی ایک لڑکی کے ساتھ گھر پر موجود تھا۔

”یہ کون ہے“؟

اُس نے چھٹتے ہی دریافت کیا تھا۔

”میری بیوی“ ——

نذیرے نے بڑے اطمینان سے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ جماتے ہوئے کہا۔

کیا مطلب ہے تمہارا —— تم نے شادی کر لی کیا؟

حنیف خاں نے حیرانگی سے پوچھا۔

”ہاں —— کیوں کیا میں شادی نہ کرتا“

نذیرے نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”نہیں یار۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں تو اِس بات پر حیران تھا کہ تم جیسے شخص کو بھی بالآخر شادی کا خیال آ ہی گیا“

حنیف خاں نے بظاہر ہنستے ہوئے کہا۔

اِس کا دل یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں تھا۔

لیکن ——

اِس نے اِس کا اظہار کرنا نذیر کے سامنے مناسب نہ جانا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ جو وہ کہہ رہا ہو وہ سچ ہو۔ دس پندرہ دن اِسی کشمکش میں گزر گئے۔

اس درمیان حنیف خاں نے اسے کریدنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے بھی کبھی نذیرے کو

اپنے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ نذیرے کو صرف اس بات کا علم تھا کہ اس کی بیوی کا نام صغراں ہے اور وہ بچپن ہی سے اس کی منگیتر بھی دونوں کے درمیان ایک طرح یہ خاموش اور شریفانہ معاہدہ تھا کہ وہ کبھی ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہیں رہیں گے کیونکہ دونوں ہی پولیس کو مطلوب تھے اور کسی ایک کی گرفتاری سے دوسرا کیوں مصیبت میں پڑے ——

ایک بات حنیف خان نے البتہ خاص طور پر محسوس کی تھی کہ یہ عورت جسے نذیرا اپنی بیوی کہتا تھا، اور تو سب کچھ ہو سکتی تھی۔

لیکن ——

کسی کی بیوی نہیں بن سکتی تھی ——

اس کی ہر ادا اور بات ذومعنی ہوتی تھی۔ نذیرے کی غیر موجودگی میں کم از کم دو مرتبہ اس نے حنیف خان پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی۔

یہ الگ بات کہ حنیف خان نے کبھی بھول کر بھی اس بات کا تصور نہیں کیا تھا کہ جو عورت نذیرے کی بیوی ہو وہ اس کے متعلق دل میں کبھی کوئی غلط گمان بھی لائے گا۔

اس کا بیٹا سات آٹھ ماہ کا ہونے کو آ رہا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ چند دنوں کے لئے صغراں کو دوبارہ یہاں لے آئے کچھ روز تو وہ اس اندیشے کے پیش نظر کہ ایسی عورت کی موجودگی میں صغراں کا یہاں آنا مناسب بھی رہے گا؟ چپ رہا۔

اب شدت سے اسے صغراں کی کمی محسوس ہونے لگی تھی اور اس کی خواہش تھی کہ جتنی جلدی ممکن ہے وہ اسے یہاں لے آئے۔ اسے صغراں کے بطن سے ابھی اور بچوں کو بھی جنم دینا تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ اکیلی سنتاں بھی کبھی کبھی کتنا بڑا المیہ بن جاتی ہے

آج بے اختیار ہو کر وہ اپنی بیوی کو واپس لینے جا رہا تھا ——!

اس مرتبہ اس نے نکّرے کے ذریعے اپنے گھر تک رسائی حاصل کی جواب ضمانت پر آ گیا تھا۔ پولیس نے اسے شاملِ تفتیش کر لیا تھا لیکن اس کے خلاف گواہی نہ ہونے کی وجہ سے اس کی ضمانت ہو گئی تھی، پھر جو ثبوت وقوعہ کے وقت اس کے پولیس کی حراست میں ہونے کا موجود تھا۔ اس کے بعد سے تو مقامی تھانے کو اس کے خلاف کوئی ڈھنگ کی بات سوجھ بھی

نہیں رہی تھی ——

نکّرے کے ڈیرے پر فیروز صغراں اور نذر محمد کو لے کر آ گیا۔ ساری رات بحث کرنے کے بعد بالآخر انہوں نے حنیف خاں کو اس بات کا قائل کر لیا تھا کہ وہ جنگ کا محاذ لمبا کرنے کے بجائے چھوٹا کر دیں اور سرداروں کے ساتھ اگر باعزت صلح کے مواقعے موجود ہوں تو صُلح کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ——

حنیف خان نے یہ بات انہیں صاف طور پر کہہ دی تھی کہ فضل شاہ کو ٹھکانے لگائے بغیر وہ پولیس کو گرفتاری پیش نہیں کرے گا۔ اس سلسلے میں اس نے مزید بات چیت کی گنجائش بھی باقی نہیں چھوڑی تھی ——

"جیسے تمہاری مرضی بیٹا —— ہم تو تمہارے ساتھ ہیں —— اب تم ہی برادری کے بڑے ہو" ——

بالآخر نذر محمد نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا تھا۔ حنیف نے بیٹے کو سینے سے لگا رکھا تھا لیکن۔

اس معصوم کو ابھی تک اس بات کا علم نہیں تھا کہ یہ شخص جس نے اسے اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔ اس کا باپ بھی ہے —— وہ اپنی ماں اور نانا ہی کو سب کچھ سمجھتا تھا۔ نذر محمد کے کہنے پر اس نے عابد کو اپنے نانا کے پاس ہی چھوڑ دیا۔

نکّرا خود انہیں ریلوے سٹیشن سے گاڑی پر سوار کرا کر آیا تھا۔ اس نے بھی حنیف خان کو یقین دلا دیا تھا کہ اس کی غیر موجودگی میں بھی نذر محمد یا اس کا خاندان خود کو اکیلے محسوس نہیں کرے گا ——!

حنیف خان گھر پہنچا تو نذیرا اپنی بیوی سمیت غائب تھا

اس نے اسی دوران صغراں کو بتا دیا تھا کہ نذیرے نے شادی کر لی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ نذیرے کی بیوی کو زیادہ منہ نہ لگائے۔ کیونکہ یہ عورت اسے ایک نظر نہیں بھاتی تھی ——

نذیرے کی واپسی قریباً ایک ہفتے بعد ہوئی ——

لیکن ——

بیوی کے ساتھ نہیں ، اکیلے —— !

"کہاں گئی تمہاری بیوی "—— ؟

حنیف خان نے پوچھا ۔

"وہ بھاگ گئی سالی —— بے وفا نکلی ۔خیر ہمیں کیا کوئی اور کرلیں گے ۔

نذیرے نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

اور ——

حنیف خان کو ساری بات سمجھ آگئی ۔اس نے جان لیا کہ اس موذی نے ابھی تک اپنا پرانا دھندہ نہیں چھوڑا۔آج بھی وہ مختلف شہروں سے عورتوں کو ورغلا کر لاتا اور اپنی ہوس پوری کرنے کے بعد انہیں آگے جسم فروشی کے کسی اڈے پر فروخت کر دیتا تھا۔

یہ بڑا مکروہ دھندہ تھا۔

حنیف خان کے لئے ایسے شخص کے ساتھ ایک منٹ کاٹنا بھی صدیوں پر بھاری تھا یہ اس کی بے پناہ مجبوری تھی کہ وہ ایسے ذلیل اور گھٹیا شخص کے ساتھ زندگی بسر کر رہا تھا۔

لیکن ——

اس مرتبہ اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ اس لعنت سے بھی اپنا پیچھا چھڑوالے گا۔شاید حنیف خان اب تک یہ کر بھی چکا ہوتا۔لیکن نذیرے نے اسے جس لائن کا چسکا لگا دیا تھا۔ اور جس طرح معمولی سی محنت اور حاضر دماغی سے ان لوگوں نے آخری کامیاب ڈاکہ مارا تھا اس کے بعد سے تو نذیرا اس کی کچھ زیادہ ہی مجبوری بن چکا تھا۔

اب اس کی بھی خواہش تھی ۔نذیرے کی مدد سے ایک دو جے ہاتھ مار کر کسی دوسرے شہر میں کوئی مکان خرید کر آرام سے زندگی بسر کرے اور نذیرے سے اپنی جان چھڑا لے۔ وہ جانتا تھا کہ نذیرے کو جس گندے کام کا چسکا ہے وہ اب اسے کبھی نہیں چھوڑے گا جب کہ حنیف خان کی یہ مجبوری تھی کہ اسے کچھ دنوں کے لئے ہی سہی صغراں کو بھی اپنے ساتھ رکھنا ہوتا تھا۔

اس نے ایک مرتبہ گھور کر نذیرے کی طرف دیکھا جس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ جمی ہوئی تھی اور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔گو کہ دونوں نے آج تک ایک دوسرے سے دریافت نہیں کیا تھا کہ وہ اپنے لوٹ کے مال کا کیا استعمال کرتے ہیں

حنیف خان کا دل کہتا تھا کہ اس موذی نے کسی دوسرے شہر میں کوئی جائیداد ضرور بنا رکھی ہے اور اپنے پیسے بھی کسی بنک میں جمع کرواتا ہے اسے قوی امید تھی کہ ایک روز وہ خود ہی بھاگ جائے گا لیکن خُدا جانے نذیرا کس مٹی کا بنا تھا یا پھر کون سی ایسی مجبوری تھی جس نے اسے ابھی تک حنیف خان سے باندھ رکھا تھا۔

پانچ چھ روز بعد ایک دن حنیف خان نے خود ہی اس سے پوچھ لیا۔

"کوئی نئی آسامی نہیں دیکھی —— "

"حنیفے یار—— اس مرتبہ تجھے ایسا ہاتھ مرواؤں گا کہ ساری زندگی نذیرے کو یاد کرے گا—— کروڑوں کا مال ہے کروڑوں کا —— بس یوں سمجھنا کہ تمہاری زندگی کا آخری ڈاکہ ہوگا۔جس کے بعد تم خود اتنے بڑے سیٹھ بن جاؤ گے تمہیں اس کی ضرورت ہی باقی نہیں رہے گی —— "

اس نے بڑی رازداری سے کہا۔

آٹھ دس روز بعد ایک دن اس نے حنیف خان کو ساری واردات سمجھا دی۔

اس مرتبہ اس نے یہاں سے قریباً ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر ایک دوسرے شہر میں ایک موٹی آسامی دیکھی تھی۔یہ شہر کی صرافہ انجمن کے صدر کا گھر تھا جس کی کوئی اولاد نہیں تھی اور جس کے پاس نذیرے کی اطلاع کے مطابق سونے کی کئی اینٹیں موجود تھیں۔اس نے گھر کے ایک نوکر کو جو کبھی کسی طوائف کے کوٹھے پر کام کرتے ہوئے نذیرے کا یار دوست بن گیا تھا۔اعتماد میں لے کر تمام معلومات حاصل کر لی تھیں۔

یہ بڑا عیاش آدمی تھا۔

"کل رات کو سالا بڑے شہر میں طوائفوں کی ایک تقریب میں شرکت کرنے جا رہا ہے ۔اُسے

کنجروں میں چودھراہٹ جمانے کا بڑا شوق ہے اور وہ بھی اپنی کوئی تقریب اس کے بغیر نہیں کرتے گھر پر اس کی موٹی بیوی اور ایک آدھ سالا رہ جائے گا جس کو قابو کرنا تمہارے لئے کچھ مشکل نہیں ہوگا ———

اس نے بالآخر ایک روز اس سے کہہ ہی دیا۔ اس دن دونوں دوسرے شہر کی طرف چل دیئے۔ محمود آباد وہ دوپہر کے وقت پہنچے تھے۔ دوپہر ہی کو نذیرا اسے سیٹھ کے گھر تک لے گیا جو ایک ماڈرن آبادی کے عین وسط میں بنا ہوا تھا۔

گھر کے دروازے پر ایک چوکیدار بیٹھا اونگھ رہا تھا۔

حنیف خان نے چاروں طرف گھوم پھر کر صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد اپنے ذہن میں ایک منصوبہ بنا لیا تھا اور اسی رات کو انہیں اس منصوبے کے مطابق کام کرنا تھا۔ اس نے اس مرتبہ حالات کی نزاکت کے پیش نظر مکان کے اندرونی حصے میں خود گھسنے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ ممکنہ مقابلے کی صورت میں نذیرا کچھ نہیں کر سکتا تھا جس کے یہاں امکانات موجود تھے ———

اس مرتبہ اس نے نذیرے کو سائیکل پر گیٹ کے نزدیک کھڑے رہنے کی ہدایت کی تھی۔ وہ سائیکل کے ذریعے اس علاقے سے نوکروں کے روپ میں بآسانی باہر نکل سکتے تھے یہاں کسی تعاقب کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔

گھر میں داخل ہونے کا مرحلہ اس نے آسانی سے طے کر لیا تھا۔ گھر کے بڑے دروازے سے ملحق ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں اس نے چوکیدار کو قابو کر کے پھینک دیا تھا۔

عین ان لمحات میں جب وہ مکان کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ رہا تھا اچانک ایک مصیبت اس کے سر پر آن پڑی۔

شاید یہ سیٹھ کے کوئی رشتہ دار تھے جو رات دیر گئے کسی کام سے اس طرف آئے تھے۔ انہوں نے اطلاعی گھنٹی بجانا شروع کر دی۔

گھر کے چوکیدار کو تو اس نے باندھ کر کوٹھڑی میں پھینک دیا تھا۔ اب دروازہ کون کھولتا دوسری طرف جو مہمان آئے تھے وہ شاید کچھ زیادہ ہی بے تکلف تھے کیونکہ اب تک چوکیدار کا دروازہ نہ کھولنا انہیں کھلنے لگا تھا۔ پہلے تو گھر کے مکین خاموش رہے لیکن مسلسل گھنٹی کی

زوردار آواز سن کر وہ بھی اپنے کمروں سے باہر آگئے اور یہ تین مرد اور دو تین عورتیں تھیں شاید نذیرے کو اس مرتبہ غلط اطلاعات ملی تھیں اور یہاں گھر میں اچھے خاصے لوگ موجود تھے۔

دو آدمی جو بڑے غصے میں تھے سیدھا چوکیدار کی کوٹھڑی کی طرف آئے۔

حنیف خاں نے انہیں اپنی طرف آتے دیکھا تو اسے اور کچھ نہ سوجھا اس نے اچانک کوٹھی کا دروازہ کھولا اور باہر دوڑ لگا دی۔

لیکن ———

اب خاصی دیر ہو چکی تھی۔ گھر کے مکینوں نے "چور چور" کے شور سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ شاید یہ کوئی مختلف قسم کی کالونی تھی۔ جہاں اس شور پر دوسرے گھروں کے دروازے بھی کھلنے لگے۔ جو لوگ سیٹھ کے گھر آئے تھے انہوں نے جب حنیف خاں کو بھاگتے دیکھا اور اس کے تعاقب میں "چور، چور" کی آوازیں بھی سنیں تو اپنی گاڑی اس کے پیچھے دوڑا دی۔

حنیف خاں کی مزید بدقسمتی یہ ہوئی کہ بھاگتے ہوئے اس نے اپنی شلوار میں جو پستول چھپایا ہوا تھا وہ بھی راستے میں کہیں گر پڑا

وہ سڑک پر منہ اٹھائے بھاگ رہا تھا۔ جب کالونی کی ایک سڑک سے نکلنے والے سکوٹر سے اچانک ٹکرا کر گرا اور پھر اسے دوبارہ اٹھنا نصیب نہ ہوا۔

کار سوار اس کے سر پر پہنچ چکے تھے

سکوٹر سوار بھی کوئی اتھلیٹ دکھائی دیتا تھا اور کالونی کے تین چوکیدار الگ تھے ان سب نے زمین پر گرے حنیف خاں کا مار مار کر بھرکس نکال دیا

حنیف خان کو تو شاید وہ جان ہی سے مار ڈالتے کیونکہ اس علاقے کا شاید ہی کوئی ایسا گھر تھا جس کا چوروں نے صفایا نہ کیا ہو۔ یہاں کا ہر مکین چوروں کا ڈسا ہوا تھا۔

وہ لوگ اپنا سارا غصہ حنیف خاں پر ہی نکالنے پر تلے ہوئے تھے۔

پولیس کی گشتی جیپ کے حوالدار نے ہوا میں تین چار گولیاں چلا کر لوگوں کو خوفزدہ کیا اور پھر ادھ موئے حنیف خان کو ہتھکڑی لگا کر اپنی جیپ میں ڈال کر تھانے لے آئے۔

ایک بدمعاش اور چور ہونے کے ناطے حنیف خان کے لیئے پولیس کی گرفت میں آنا تو کوئی نئی یا اچنبھے والی بات نہیں تھی۔

لیکن ـــــ

اس کا دل بار بار ایک ہی بات کہہ رہا تھا کہ اس مرتبہ نذیرے نے اس سے دھوکہ کیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ گذشتہ چوری میں ملنے والے ہیرے جواہرات کے زیورات ابھی تک اسی کے قبضے میں تھے۔ کیونکہ اس نے حنیف خان سے کہا تھا کہ وہ انہیں کسی دوسرے شہر میں کچھ عرصے بعد اچھے داموں فروخت کروا دے گا۔

حنیف خان بھی یہ بات سمجھتا تھا کہ ایسے زیورات کا مقامی سناروں کے پاس فروخت کرنا تو انہیں مشکوک کہا جا سکتا تھا۔ یوں بھی پولیس چوکس تھی اور ممکن ہے اس نے سناروں کی دوکان پر نظر بھی رکھی ہو۔

یوں بھی اس کی شہروں میں کچھ ایسی واقفیت نہ تھی۔ اپنی موجودہ حیثیت میں وہ مشتبہ حالت میں زیادہ گھومنا پھرنا اور زیر زمین دنیا کے باسیوں سے رابطہ رکھنا بھی پسند نہیں کرتا تھا

اسے اب یقین ہو چکا تھا کہ ڈیڑھ دو لاکھ مالیت کے وہ زیورات ہی دراصل اس کی گرفتاری کا باعث بنے ہیں اور نذیرے نے اس مرتبہ اس کے ساتھ بے ایمانی کر کے اسے ایک ایسے گھر میں داخل کر دیا جہاں سے اس کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ـــــ!

شاید یہی وجہ تھی کہ اس مرتبہ اس نے حنیف خان کے ساتھ گھر کے اندر داخل ہونے پر ہچکچاہٹ دکھائی تھی۔

لیکن ـــــ

تب حنیف خان نے اس کی کسی بات کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ اب جبکہ وہ پولیس کے شکنجے میں جکڑا جا چکا تھا تو اسے نذیرے کی ایک ایک حرکت پر شک ہونے لگا تھا ـــــ!!

لیکن اب سوائے پچھتاوے کے اس کے پاس رہ بھی کیا گیا تھا۔

یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ بھاگتے بھاگتے پستول گر گیا ورنہ اس کے ہاتھوں سے کوئی قتل بھی ہو جاتا اور پولیس بھی اسے نہ چھوڑتی۔

اب کم از کم اس کے پاس کوئی شناخت ایسی نہیں تھی جو اس کی اصلیت بتا سکتی ـــــ

"لو بیٹا حنیف خان اب ذرا قائم رہنا۔ ورنہ کتے کی موت مارے جاؤ گے"

اس نے دل ہی دل میں کہا اور فوراً ایک منصوبہ اس کے ذہن میں آ گیا۔ اس کے باپ نے اسے ایک ہی تربیت دی تھی۔ کہ پولیس کے قابو آنے کے بعد کبھی اپنے جرم کا اقرار نہ کرنا خواہ اس کی کتنی ہی زیادہ قیمت ادا کرنی پڑے۔

پولیس والوں نے اس کی تلاشی اچھی طرح کر لی تھی لیکن سوائے چند سو روپے کے اس کے پاس سے کچھ برآمد نہیں ہوا تھا۔

صبح جب اس کی حالت قدرے سنبھلی تو پولیس اس کے سر پہ سوار ہو گئی۔

"کیا نام ہے تمہارا"؟

"کہاں کے رہنے والے ہو"؟

"کیا کرنے آئے تھے؟"

وہ لوگ اس سے مختلف سوالات کر رہے تھے۔

لیکن ـــــ

حنیف خان جواب میں ان کی شکلیں ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو۔ وہ پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہا تھا۔

اوٹ پٹانگ باتیں کر رہا تھا۔

عجیب عجیب حرکتیں کر کے انہیں یہ باور کروا رہا تھا کہ اس کا تو ذہنی توازن ہی ٹھیک نہیں ہے۔

"اچھا سالے ایکٹنگ کرتا ہے ـــ ابھی دیکھتا ہوں تجھے ـــ بڑے دیکھے ہیں تیرے جیسے ـــ اگر طوطے کی طرح نہ بولنے لگا تو کہہ دینا"

ایک لمبے تڑنگے پولیس انسپکٹر نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا

"اسے ذرا لمبا کروا دیئے ـــــ"

اس نے اپنے جوانوں کو حکم دیا۔ جنہوں نے پلک جھپکتے ہی اس کو زمین پر اوندھے منہ لٹا دیا۔

دو پولیس والے اس کے بازوؤں پر اور دو اس کی ٹانگوں پر بیٹھ گئے۔ جبکہ پانچویں نے اس کی کمر پر وحشیانہ ڈنڈے برسانے شروع کر دیئے۔

لیکن ــــــ

کیا مجال کہ اس کی حالت بدلی ہو۔ وہ بدستور پاگلوں کی طرح چیختا چلاتا رہا ــــــ شام تک پولیس والوں نے اپنی دانست میں اس پر بڑے خطرناک تھرڈ ڈگری طریقے استعمال کر لئے تھے۔

لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

یہ سلسلہ آٹھ دس روز چلتا رہا ــــــ

اس درمیان پولیس نے اس کا ریمانڈ بھی لے لیا تھا۔ انہوں نے اپنی طرف سے کوئی ایسا غیر انسانی طریقہ نہیں چھوڑا تھا جو حنیف خاں پر نہ اپنا لیا ہو۔

لیکن ــــــ

کیا مجال جو اس کے پائے ثبات میں لغزش آئی ہو۔ اس کے بدن کی ہڈیاں ضرور سلامت رہ گئی تھیں۔ جہاں تک جسم کا تعلق تھا اس کے ایک ایک انچ پر پولیس تشدد کے نشانات پڑ چکے تھے ــــــ

پندرہ روز تک پولیس اور سی آئی اے سٹاف والے اس سے مغز ماری کرتے رہے۔ اس درمیان اس کے جسم پر سوائے سُرخ سُرخ آنکھوں کے اور کچھ سلامت نہیں رہا تھا۔ انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ گوشت پوست کا بنا ہوا انسان ہے یا کسی فولاد کا بنا ہوا جسم۔ جس پر کوئی بھی ضرب اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔ انہوں نے اب واقعی سوچنا شروع کر دیا تھا کہ یہ پاگل ہے یا پھر اس کا ذہنی توازن بگڑ چکا ہے۔

ابھی تک انہیں حنیف خاں نے اپنا کوئی نام بھی نہیں بتایا تھا۔ وہ ہر وقت اول فول بکتا رہتا۔ منہ ہی منہ میں جانے کیا بڑبڑاتا رہتا۔

لیکن ــــــ

ان کے کسی سوال پر وہ چونکتا بھی نہیں تھا۔

دو مہینے تک پولیس والوں نے اسے اپنے پاس رکھا۔ اس درمیان وہ اس سے مختلف

خدمات لیتے رہے۔ کبھی کوئی اپنی مالش کروا لیتا۔ کبھی اس سے صفائی کروا لیتے اور کبھی جوتے پالش کروا لیتے۔ قریباً تین ماہ بعد بالآخر پولیس والوں نے اس پر آوارہ گردی کا مقدمہ کر کے اس کا اپنی طرف سے محمد شریف ولد مشتاق احمد نام رکھ کر اسے جیل بھیج کر اپنی جان چھڑالی۔

٥

جیل پہنچ کر حنیف نے سکھ کا سانس ضرور لیا تھا۔

لیکن ــــــ

اس کے معمولات میں فرق نہیں آیا تھا۔ وہ صرف ایک سوال کا جواب دینے لگا تھا اور وہ سوال تھا۔ تمہارا نام کیا ہے جس کے جواب میں وہ پہلے تو پاگلوں کی طرح زوردار قہقہہ لگاتا پھر سوال کرنے والے کو چڑانے کے انداز میں کہتا محمد شریف ــــــ اور بس۔

اس سے آگے وہ کسی سے کوئی بات نہ کرتا۔

البتہ روٹی وہ معمول کے مطابق کھاتا رہا۔ اسی درمیان اسی کو "سائیں لوگ" سمجھ کر کچھ قیدی خدا خوفی کر کے اس کی مدد بھی کرنے لگے۔ کسی نے اسے تیل دے دیا اور کسی نے کبھی کچھ کھانے کو دے دیا۔ سگریٹ بیڑی وہ پیتا نہیں تھا نہ ہی ان لوگوں نے اس طرف توجہ دی ــــ !

اس کے سر اور ڈاڑھی کے بال بے تحاشا بڑھ چکے تھے۔ ایک دن جیل کے نائی کو اس کی حالت پر رحم آگیا اور اس نے حنیف خاں کا سارا سر مونڈ دیا۔

دو تین قیدیوں نے زبردستی اسکے جسم پر صابن مل کر اسے نہلا دیا۔ دو تین نے اس کے بدن پر تیل کی مالش کر دی۔ یہ سب لوگ وہ تھے جو اسے کوئی "پہنچا ہوا بزرگ" سمجھ کر اس کی سیوا میں جُتے ہوئے تھے۔

اسے جس بیرک میں رکھا گیا تھا۔ وہاں زیادہ دفعہ ۳۰۲ کے حوالاتی تھے جو قتل کے الزام میں جیل آئے ہوئے تھے۔

حنیف خاں کی خوش قسمتی تھی کہ جس شخص کے دماغ پر سب سے پہلے اس کے "سائیں" ہونے کا بھوت سوار ہوا اور اس نے حنیف خاں کی ٹہل سیوا شروع کی وہ ایک ہفتے بعد ہی مقدمے سے بری ہو گیا۔ جسے اس نے خالصتاً "سائیں جی" کی دعاؤں کا کرشمہ جانا۔ اس نے ساری بیرک کو

بتا دیا تھا کہ اگر انہوں نے بری ہونا ہے تو "بابا شریف سائیں" کی خدمت کریں۔

اور ——

وہاں اس کی خدمت کرنے کیلئے حوالاتیوں نے ایک دوسرے سے مقابلہ شروع کر دیا۔

ان لوگوں نے حنیف خاں کے کپڑے تبدیل کروا دیئے۔ اس کے لئے تین نئے جوڑے سل کر آ گئے ——

وہ ان ملزموں کو دن رات گالیاں نکالتا، دھکے دیتا اور ایک آدھ کو تھپڑ بھی رسید کر دیتا لیکن یہ لوگ اس کی گالیوں کو مار کو بھی عطیہ خداوندی جان کر قبول کر لیتے۔ وہ اسے بھی بابا جی کی کوئی ادا سمجھتے اور یہی گمان کرتے کہ بابا جی ان پر مہربان ہونے والے ہیں۔

"بابا شریف سائیں" کی اب جیل کے ملازمین بھی عزت کرنے لگے تھے اور اکثر اپنی ترقی کے لئے اس سے دعا کی التجا کرتے تھے۔

جواب میں بابا شریف سائیں انہیں ماں بہن کی گالیاں دیتا جس کا مطلب یہی لیتے کہ سائیں جی نے ان کی بات مان لی ہے اور اب ان کا کام ہو جائے گا —— !!

حنیف خاں دل ہی دل میں اپنی اس کامیابی پر پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اس کا حلیہ گو کہ بہت بدل چکا تھا لیکن ایک خوف اسے ہمیشہ دامنگیر رہا کہ کہیں کوئی اسے پہچان نہ لے۔

ایک روز بالآخر اس کی "تپسیا" رنگ لے ہی آئی۔ جب جیل خانہ جات کے آئی جی صاحب نے ایک غیر ملکی وفد کے ساتھ جیل کا دورہ کیا اور معمولی جرائم میں جیلوں میں بند قیدیوں کی رہائی کا سلسلہ شروع ہوا تو آئی جی صاحب نے چار ماہ سے جیل میں بند اس بے گناہ اور پاگل شخص کی رہائی کے احکامات بھی جاری کروا دیئے۔

قریباً سات ماہ کی جان توڑ اذیتیں برداشت کرنے کے بعد وہ بالآخر جیل کے دروازے سے باہر آ گیا تھا۔ جیل کے باہر آتے ہی اس نے پھر پاگلوں کی سی حرکات شروع کر دیں اور ناچنے لگا۔ ناچتے ناچتے وہ اچانک بھاگ کھڑا ہوا اور دو تین میل تک بھاگتا چلا گیا جب اسے اطمینان ہو گیا کہ کوئی اسے دیکھ نہیں رہا تو اپنی نارمل حالت پر واپس لوٹ آیا۔

اپنے گھر تک پہنچنے کے لئے اس نے بڑا طویل راستہ اختیار کیا تھا۔

صبح کا جیل سے نکلا وہ شام ڈھلنے پر گھر پہنچا تھا۔

لیکن ——

گھر کے دروازے پر کچھ اجنبی لوگ دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا، شاید یہ نذیر سے کوئی ملنے ملانے والے ہوں گے۔ اس نے سوچا اور اطمینان سے ان کے نزدیک پہنچ گیا

"کیا بات ہے بابا جی"——

ان میں سے ایک نے اس کی لمبی ڈاڑھی اور حلیے کو دیکھ کر کہا۔

"یہاں نذیر نامی ایک نوجوان رہتا ہے"

اس نے پوچھا۔

"گزشتہ پانچ ماہ سے تو ہم یہاں رہ رہے۔ اس سے پہلے کوئی اور کرائے دار تھا لیکن نذیر تو نہیں وہ تو کوئی میر صاحب تھے۔ بابا جی آپ نام تو نہیں بھول رہے"

اس نوجوان نے کہا۔

حنیف خاں کو دھچکا سا لگا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ نذیرا اپنی جان بچا کر بھاگ گیا ہے لیکن صغراں —— وہ کہاں گئی؟

اس نے محلے والوں سے پوچھنا مناسب نہ جانا اور نزدیکی چائے کے ہوٹل کی طرف چلا گیا۔

"کیا حال ہے بھائی صدیق —— کیا بات ہے بڑے صوفی بن گئے ہو بھئی —— جب سے اس علاقے سے گئے ہو اس طرف کا چکر بھی نہیں لگایا کوئی غلطی ہو گئی ہم سے"

چائے کے ہوٹل کے مالک نے اسے پہچانتے ہوئے کہا۔

"نہیں غلام علی یار بس اب زندگی ہی ایسی ہو گئی ہے جب سے بابا جی کے بیعت ہوئے ہیں۔ کہیں جانا ہی نہیں ہوتا"

اس نے غلام علی کی بات کا بھرم رکھتے ہوئے کہا۔

حنیف خان نے یہاں سے چائے پی تو ہوٹل کے مالک نے پیسے لینے سے انکار کر دیا اس کے پاس جیل میں ملنے والے نذرانوں سے کچھ پیسے ابھی تک باقی تھے جو اس نے سنبھال

کر رکھے تھے۔ غلام علی کا شکریہ ادا کر کے وہ باہر آ گیا۔

"عین ممکن ہے نذیرے نے اس کی گرفتاری سے خوفزدہ ہو کر راہ فرار اختیار کر لی ہو اور اس کی بیوی بھی اپنے میکے شمشیر نگر واپس لوٹ گئی ہو۔ کیونکہ نذیر کو یہی گمان ہو گا کہ جب پولیس حنیف خان پر تشدد کرے گی تو وہ اس کا نام بھی لے دے گا،،

تب حنیف خان نے بھی یہی سوچا تھا۔

اور ____

یہی سوچ کے وہ اپنے گاؤں کی طرف جا رہا تھا ____!

اس نے اپنے گھر جانے کی بجائے نمبردار احمد دین کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا ____!

"حنیف خاں ____ اوئے تو کہاں چلا گیا تھا یار ____ اتنا لمبا انتظار کروایا تو نے ____ تو کتنا ظالم نکلا ____ ہمیں خبر تک نہ دی تو نے ____،،

دروازے سے باہر آ کر فیروز اس کے ساتھ یوں بغل گیر ہوا تھا جیسے پچھلے کئی جنموں سے اس کا منتظر رہا ہو۔

"کیا حال ہے گھر بار کا ____،،

اس نے چھٹتے ہی سوال کیا ____

"سب ٹھیک ہیں ____ حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں حنیف خاں۔ سردار صلح کے لئے تیار ہیں اور فضل شاہ تو سنے گا تو حیران رہ جائے گا ____ فضل شاہ سے قدرت نے خود انتقام لے لیا ہے اس کے گردے فیل ہو چکے ہیں۔ حنیف خاں وہ زندگی موت کی کشمکش میں مبتلا ہے ____،،

فیروز اسے بیقراری سے ایک ایک تفصیل بتاتا رہا۔

لیکن ____

جو وہ سننا چاہتا تھا۔ وہ بات فیروز کی زبان پر نہ آ سکی، نہ ہی ماما نذر محمد نے جو تھوڑی دیر بعد وہاں آ گیا تھا کہی۔

صغراں یہاں نہیں تھی؟

کہاں گئی۔ اس کی صغراں؟ اسے اپنے دل کی دھڑکن رکنے کا احساس ہوا۔ چاچا احمد دین

نے نکڑے کی طرف آدمی بھیج دیا تھا۔ جس نے بڑی منت سماجت کی تھی کہ جب بھی حنیف خان آئے وہ اسے ضرور ملائیں۔

رات ڈھلنے تک نکڑا بھی وہاں آ گیا۔ اس کا رواں رواں حنیف خان کا احسان مند تھا۔

لیکن ____

حنیف عالم ہوش میں تھا ہی کہاں ____

اس کی حالت زخمی چیتے کی طرح تھی جسے کسی شکاری نے ایک گہری ضرب لگا کر تڑپنے کے لئے چھوڑ دیا ہو۔

صغراں کی جدائی کے غم نے اس کو باؤلا کر دیا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ صغراں خود کہیں نہیں جا سکتی۔ ضرور اس موذی نذیرے نے ہی اس کے ساتھ کوئی گھناؤنا کھیل کھیلا ہے۔ عین ممکن ہے اسے جرم و گناہ کی دنیا میں دھکیل دیا ہو؟

اس سے آگے سوچنے کی اس میں سکت نہیں تھی اس کی سوچیں منجمد ہو کر رہ جاتی تھیں

نذیرے کو وہ کہاں تلاش کرے؟

اس سوال کا اسے بار بار ایک ہی جواب سن رہا تھا کہ وہ کسی شہر کے کسی نہ کسی بازار حسن میں ضرور ملے گا۔ اسے اس گندے کام کا ایسا چسکا لگ گیا ہے کہ اب اس کے لئے اس سے نجات حاصل کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔

حنیف خان نے آخری مرتبہ جی بھر کر اپنے بیٹے کو دیکھا اور چپ چاپ وہاں سے نکل آیا ____

اسے اپنی منزل کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ ہر دفعہ جب وہ اپنے گاؤں سے واپس جاتا تو پہلے سے پلان کردہ راستے پر ہی سفر کیا کرتا تھا۔

لیکن ____

آج نجانے کیوں اس نے تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ دی تھیں۔

فیروز نے زبردستی اسے کچھ روپے دے دیئے تھے کہ وقت آنے پر واپس لوٹا دے! اس نے بھی نذر محمد کی طرح اس کی بہت منت سماجت کی تھی کہ حنیف خاں پولیس کے سامنے پیش ہو جائے۔

اس نے حنیف خاں سے کہا تھا کہ فضل شاہ قدرت کے انتقام کی گرفت میں آ چکا ہے. اس کے بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا. اس کے گردے ناکارہ ہو چکے ہیں ——

نذر محمد نے اسے بتایا تھا کہ اس خاندان میں زیادہ لوگ اس بیماری سے مرتے ہیں یہ عیاش طبع درندے اپنی حیوانی تسکین کے لئے سونے چاندی کے کشتے کھاتے ہیں اور ان کے گردے جو پہلے ہی شراب کے بے تحاشا استعمال اور زنا کاری سے خستہ حال ہو چکے ہوتے ہیں ختم ہو جاتے ہیں اسی طرح فضل شاہ کا باپ مرا تھا اور اسی بیماری نے اس کے دادا کی جان لی تھی ——

نذر محمد نے کہا تھا ——

"اگر ریاست شاہ گولی سے نہ مارا جاتا تو اس بیماری سے مرتا —— !"

عین ممکن تھا کہ جس طرح قدرت نے حالات کو اس کے حق میں ہموار کیا تھا. حنیف خاں بیش ہو جاتا. کیونکہ اب فضل شاہ کی بیماری کے بعد اس علاقے کی سب سے بڑی سیاسی قوت سردار تھے.

سرداروں کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ حنیف خاں کی دشمنی سے زیادہ دوستی ان کے لئے بہتر ہو سکتی ہے.

"بلوال" کی طرف سے نذر محمد تک پیغام بھی پہنچ چکا تھا اور اس کی طرف سے اشارہ ہونے پر علاقہ کے تین معززین نے اپنی ضمانت پر دونوں کی ملاقات کا اہتمام بھی کرنے کا وعدہ کیا ہوا تھا.

لیکن ——

حنیف خاں کو اس وقت سوائے صغراں کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا.

اگر نذیرے نے اس کا مال کھایا ہوتا تو وہ اسے معاف کر دیتا کیونکہ راتوں رات دولت حاصل کر لینا اس کے لئے کبھی کوئی مسئلہ نہیں رہا تھا.

اس نے تو حنیف خاں کو زندہ درگور کر دیا تھا.

وہ اپنی اگلی زندگی صغراں کے بغیر بسر کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا وفا کی اس دیوی نے موت کی دھار پر چلتے ہوئے اس کا ساتھ نبھایا تھا. اس کی جان پر جو بھی عذاب آیا ہوا اس کا سبب حنیف خاں ہی تھا. وہ خود نذیرے سے نہیں ملی تھی.

یہ حنیف خاں تھا جس نے نذیرے کا تعارف اس سے ایک قابلِ اعتماد ساتھی کی حیثیت سے

کروایا تھا. خدا جانے وہ کہاں تھی ؟

لیکن ——

اگر وہ زندہ تھا تو اسے یہاں ہونا چاہیئے تھا. حنیف خاں کے پاس —— !

"ماما —— اپنی بیوی کے بغیر اپنے گھر جاتے ہوئے میں کیا اچھا لگوں گا —— کیا جواب دوں گا برادری کو، جب وہ پوچھیں گے صغراں کہاں ہے؟ کیا بتاؤں گا انہیں؟ کیا تمہاری غیرت برداشت کر لے گی —— نہیں ماما —— میں نامرد ہو کر ایک لمحے کے لئے بھی نہیں جی سکتا —— میں صغراں کو ڈھونڈھ کر لاؤں گا. نہیں تو خود بھی واپس نہیں لوٹوں گا."

یہ تھی وہ آخری بات جو اس نے روانگی سے پہلے کہی تھی اس کی ان باتوں کا نذر محمد یا احمد دین کے پاس کوئی جواب نہیں تھا.

احمد دین نے اس سے کہا تھا کہ وہ اکیلا صغراں کو کہاں ڈھونڈھے گا اپنے ساتھ ہی کسی کو لے جائے

لیکن ——

اس نے یہ پیش کش بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا.

"میرے باپ نے مجھے ساری زندگی اکیلے اپنی جنگ لڑنا سکھایا ہے چاچا —— یہ میری لڑائی ہے. مجھ ہی کو لڑنی ہوگی. کوئی اور درمیان میں کیوں آئے."

اس نے دو ٹوک لہجے میں جواب دیا.

"فیروز تم نے جس طرح میرا گھر بار سنبھالا ہے اگر زندہ رہا تو اس احسان کا بدلہ ضرور چکاؤں گا بس میری ایک خواہش ضرور پوری کرنا کہ میرے بیٹے کو اپنے باپ دادا کے راستے پر نہ چلنے دینا اسے تعلیم دلانا میری خواہش ہے کہ وہ اچھا انسان بنے."

اور ——

وہ چلا گیا ——

o

حنیف خاں نے ڈیڑھ سال ملک کے ہر بازارِ حسن کی خاک چھاننے میں گزار دیئے ——

اس درمیان اسے دو مرتبہ صرف اس بات کا علم ہوا کہ نذیرا موچی فلاں جگہ دیکھا گیا.

لیکن ———

اس کا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں تھا۔

اُس نے اپنے گھر والوں سے کوئی رابطہ تو نہیں کیا۔ لیکن اپنے گھریلو حالات سے بے خبر بھی نہیں رہا۔ اس کی روانگی کے دو ماہ بعد ہی فضل شاہ گردے فیل ہونے سے مرگیا ——— اب شاہ پور میں سرداری پھر سے ریاست شاہ کی تیسری بیوی کے پہلوٹھی کے بیٹے عامل شاہ کے ہاتھ آگئی تھی لیکن عامل شاہ کو سب سے زیادہ عورتوں اور شراب میں دلچسپی تھی۔ ابھی تک اس نے الیکشن لڑنے کا باقاعدہ اعلان یا فیصلہ نہیں کیا تھا۔

اپنے بیٹے کو دیکھنے کے لئے اس کا دل کبھی بے اختیار مچلتا۔

لیکن ———

وہ بادل نخواستہ اپنی اس خواہش کو دبائے رکھتا۔ صغراں کے غائب ہونے کے بعد سے اُسے خود سے اپنے پیشے سے نفرت سی ہوگئی تھی وہ چاہتا تھا کہ اس کا منحوس سایہ اس کے بیٹے پر نہ پڑے تاکہ وہ الگ قسم کے ماحول ہی میں پرورش پائے۔

اس نے زیر زمین دنیا میں روابط بنا لئے تھے۔

اب اسے ایک اور آسان دھندہ مل گیا تھا وہ "مال" ادھر سے ادھر لے جاتا۔ اپنا حصہ وصول کرتا اور غائب ہوجاتا۔ کبھی ایک جگہ وہ ٹک کر نہیں بیٹھا تھا۔

اپنی صغراں کو ڈھونڈنے کے لئے اس نے بڑے کوٹھوں کی خاک چھانی تھی آج بھی وہ ملک کے دوسرے بڑے شہروں کے ایک قحبہ خانے میں ایک دلال کے ساتھ جا رہا تھا۔

ایک نیم روشن کمرے میں لڑکیوں کو بکاؤ مال کی طرح قطار میں بٹھایا گیا تھا۔ جب اچانک ایک چہرے پر اس کی نظر جم کر رہ گئی۔

اُسے یاد آرہا تھا کہ یہ چہرہ اس کا شناسا ہے وہ ضرور اس سے کہیں مل چکا ہے۔

لیکن کہاں ؟

یہ اُسے یاد نہیں آرہا تھا۔

"وہ لڑکی" ———

اس نے کسی فطری عمل کے تابع اس لڑکی کی طرف اشارہ کر دیا

"اپنا یار ہے۔ خوش کر دینا اسے ——— معمولی آدمی نہیں"

دلال نے اسی عورت کی طرف دیکھ کر آنکھ دبائی،

عورت چپ چاپ اس کے ساتھ ملحقہ مکان کے اس کمرے میں آگئی جہاں اسے معمول کے مطابق لایا جانا تھا

"تمہارا نام کیا ہے ؟" ———

حنیف خاں نے تنہائی پاتے ہی اس سے دریافت کیا۔

"چھوڑو حنیف خاں ——— نام میں کیا رکھا ہے ——— تمہاری بیوی کا بھی کوئی نام تھا۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تم اپنے پیسے پورے کرو۔"

حنیف خاں کو ایسے لگا جیسے اچانک اس نے بجلی کے ننگے تاروں کو چھیڑ لیا ہو۔

ایک زوردار جھٹکے نے اسے ایک دم سے بھولی کہانی یاد دلا دی ———

یہ شرلیفاں تھی ———

وہی عورت جسے نذیرا اپنی بیوی بنا کر لایا تھا اور جسے اس نے حنیف خان کی توقعات کے مطابق بازار حسن میں فروخت کر دیا تھا۔

"کہاں ہے صغراں" ——— ؟

اس نے وحشیانہ انداز سے شرلیفاں کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے اسے اتنی زور سے جھنجوڑا کہ شرلیفاں کی آنکھیں ابل پڑیں۔

اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔

قریباً ایک منٹ اسے اپنی حالت کو نارمل کرنے میں لگا۔ جس کے بعد اس نے دو چار لمبے سانس لئے اور حنیف خان کی طرف بڑی بے بسی سے دیکھا

"مار ڈالو مجھے ——— میں تو یوں بھی زندہ نہیں ہوں۔ اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ جسم کی زندگی کو زندہ رہنا کہتے ہیں تو ٹھیک ہے ——— لیکن اس سے تم صغراں کو نہیں مل سکو گے ——— حنیفے صغراں سے ملنے کے لئے مجھے نہیں، تمہیں مرنا پڑے گا ——— وہ میرے جیسی فاحشہ اور بے غیرت عورت

نہیں تھی۔ وہ اپنے گھر سے کسی یار کے ساتھ بھاگ کر نہیں آئی تھی ——— اسی لئے تو مر گئی ——
اسی نے تو اس بازار میں آنے کے سات آٹھ روز بعد ہی تیسری منزل سے چھلانگ لگا کر جان دیدی
تھی —— لیکن تم اسے ضرور مار ڈالو جس نے میری جیسی جانے کتنی لڑکیوں کو ورغلا کر آج جسم
فروش فاحشائیں بنا ڈالا ہے ——— حنیفے! تیری غیرت کو کسی اور نے نہیں، تیرے یار نذیر
موچی نے داؤ پر لگایا تھا ——— وہ اسے بھی اس کوٹھے پر فروخت کرنے لایا تھا —— میں تو
اسے کبھی نہ پہچان پاتی، لیکن جب وہ تمہارا نام لے کر اور چیخ کر کہا کرتی تھی کہ نذیرے حنیف خان
میرا بدلہ لے گا —— تو مجھے علم ہوا کہ وہ کون ہے" ———

اس کا سانس زور سے چل رہا تھا۔

ایک لمحے کے لئے رک کر اس نے اپنی حالت پر قابو پایا اور بولی۔

"حنیف خان مجھے صغراں نے بتایا تھا کہ وہ موذی اسے تمہاری پولیس کے ہاتھوں گرفتاری
کی خبر سنا کر بوکھلائی ہوئی حالت میں گھر سے باہر لے آیا تھا ——— اس نے صغراں سے یہی کہا تھا
کہ وہ اسے گاؤں پہنچا دے گا۔ لیکن فوراً گاؤں جانا خطرے سے خالی نہیں —— پھر وہ صغراں کو
اپنی ایک رشتہ دار عورت کے گھر لے آیا ——— تم جان سکتے ہو کہ یہ عورت کون ہو سکتی ہے؟ اس
بازار کی مشہور نائکہ رکھی بائی ——— مر گئی حرام زادی ——— اس کے جسم سے ایسے بدبو کے بھبوکے
اٹھ رہے تھے۔ اور گھر والوں نے اٹھا کر خیراتی ہسپتال میں پھینک دیا۔ وہیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر
گئی ——— !

اسے موقع ملا تو وہ مکان کی چھت سے کود کر مر گئی ——— کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی
ان لوگوں نے پولیس کو دے دلا کر معاملہ ختم کر دیا۔ خدا جانے اس بے چاری کو کفن بھی نصیب ہوا
یا نہیں —— خدا جانے —— "

جیسے جیسے وہ بول رہی تھی۔ حنیف خان کو اپنے دل میں تیز دھار بھالا اترنے کا احساس
ہو رہا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نادیدہ طاقت نے اسے اندر سے کاٹنا شروع کر دیا ہو ——
اس کے حلق میں ایک پھانس سی اٹک کر رہ گئی۔ اسے احساس بھی نہ ہو سکا کہ اس کی آنکھوں
نے اچانک ہی آنسوؤں کے دریا بہا دیئے تھے۔

اس کی ڈاڑھی ان آنسوؤں سے بھیگ چلی تھی ———

"حنیف خاں ——— یہاں سے نہ جانا۔ وہ ضرور آئے گا۔ آج نہیں تو کل ——— یا کسی
اور دن ——— وہ یہاں اکثر آتا رہتا ہے۔ کبھی ایک دو رات عیاشی کرنے اور کبھی کوئی نیا شکار
ان کو سونپنے ——— حنیف خاں اسے مار ڈال۔ تو اسے میرے سامنے لٹا کر میرے ہاتھ میں ٹوکا
دے دینا۔ حنیف خاں تجھے خدا رسولؐ کا واسطہ ہے اس کے ٹکڑے اپنے ہاتھوں سے کرنے
دینا —— مجھے اپنے ہاتھوں سے ——— "

وہ سسکیاں لینے لگی ———

"ہوش کر شریفاں —— اگر تو واقعی مرنے سے پہلے کچھ لمحوں کا سکون چاہتی ہے تو خود کو
بالکل نارمل کرلے ——— تیری کسی حرکت پر یہاں کسی کو شک نہیں ہونا چاہیئے —— یہی ایک صورت
ہے جس سے تیرے اور میرے کلیجے میں بھڑکتی آگ ٹھنڈی ہو سکتی ہے ——— ورنہ تو بھی میری
طرح سسک سسک کر مر جائے گی ——— "

شریفاں نے اس کی بات فوراً سمجھ لی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ وہ چند منٹ بعد ہی نارمل ہو گئی۔

ساری رات وہ اسے کرید کرید کر صغراں کی باتیں پوچھتا رہا۔ شریفاں نے اپنی دانست میں اسے
ایک ایک لمحے کی کہانی سنا دی تھی۔

علی الصباح وہ اس سے الگ ہو کر اپنے ٹھکانے پر آ گیا۔

دس دن تک اس نے صغراں کی قبر کا پتہ۔ لگوانے کے لئے ہر ممکن طریقہ اپنا لیا۔
لیکن ———

اس سے آگے اُسے کسی بات کا علم نہ ہو سکا۔ کہ ایک عورت نے چھلانگ لگا کر خودکشی کی
تھی جس کی لاش کارپوریشن والے دفن کرنے کے لئے لے گئے تھے۔

اگلے روز وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر کارپوریشن کے دفتر جا پہنچا۔ اس نے بڑی ہشیاری سے اس
کلرک کا پتہ لگایا جو اپنے رجسٹر میں ایسی لاش کا اندراج کیا کرتا تھا۔

شام ڈھلے جب اس نے مریل سے کلرک کے دروازے پر دستک دی تو ایک اجنبی کو اپنے سامنے دیکھ کر جس کی آنکھوں میں خون تیر رہا تھا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

"گھبراؤ نہیں ـــــ یہ لو۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے کلرک کے سامنے اس کی دو تین سال کی تنخواہوں سے زیادہ مالیت کے کرنسی نوٹ پھینک دیئے۔

اس نے اندازے سے وہ پتہ جو اسے شریفاں نے سمجھایا تھا بتا کر کلرک سے صرف یہ پوچھا تھا کہ اس گمنام لاش کو دفنایا گیا تھا۔

"وہ جس نے خودکشی کی تھی ـــــ"

کلرک کو اچانک جیسے بھولی ہوئی داستان یاد آ گئی۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ شخص گدھا دکھائی دیا۔ جس نے محض اتنی سی جائز بات پوچھنے کے لئے اس کے سامنے اتنے نوٹ پھینک دیے تھے؟

"بڑے قبرستان میں ـــــ بھئی میں خود گیا تھا ـــــ ابھی سال ڈیڑھ سال کی تو بات ہے ـــــ میں اس کی نشاندہی کر سکتا ہوں ـــــ لیکن تم کون ہو؟"

جواب میں اسے حنیف خاں نے ایسی نظروں سے دیکھا کہ بیچارہ سہم کر رہ گیا۔

"مم میرا مطلب ہے بھائی صاحب اتنی سی بات پوچھنے کے لئے اتنے پیسے دینے کی کیا ضرورت تھی"

کلرک کو اور تو کچھ نہ سوجھا۔ اس نے یہی کچھ کہہ کر اپنی جان چھڑانا چاہی

"نہیں۔ تم پیسے رکھو ـــــ اور یہ پیسے تمہیں زبان بند رکھنے کے لئے دے رہا ہوں ـــــ خبردار اگر زندگی میں کبھی بھولے سے بھی تمہاری زبان پر یہ لفظ آیا کہ کسی نے تم سے اس قبر کے بارے دریافت کیا تھا ـــــ"

حنیف خان نے اسے عجیب سی نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"ٹھک ٹھیک ہے"

کلرک کی گھگھی بندھ گئی

خدا جانے وہ کس کی قبر تھی جس کی اس نے نشاندہی کی ـــــ

لیکن-----

حنیف خاں اس کی قبر سے لپٹ کر گھنٹوں روتا رہا۔

اس نے اگلا سارا دن وہیں گزارا۔ اپنی آنکھوں نے سامنے قبر کی چار دیواری بنوائی کیونکہ اور دس بارہ روز تک اس کا نام و نشان مٹنے والا تھا--- اپنے خاندانی رواج کے مطابق اس نے قبر پر صغراں کے نام کی تختی لگوائی اور ساری رات اس کے سرہانے پاگلوں کی طرح بیٹھا رہا۔

اب اس پر دیوانگی طاری رہنے لگی تھی-----

اس نے اسی بازار میں مستقل اڈہ جما لیا تھا----

اپنے مستقل ٹھکانے کی اس نے اگلے ہی روز شریفاں کو نشاندہی کر دی تھی۔ جس نے خدا رسولؐ کی قسم کھا کر کہا تھا کہ وہ جیسے ہی نذیرے کی اطلاع پائے گی اپنی جان پر کھیل کر اسے مطلع کرے گی----!

○ ○ ○

نذیرے کا انتظار کرتے اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔

اسے یہاں قیام پذیر ہوئے قریباً چالیس روز ہونے کو آ رہے تھے اسی درمیان اس نے صغراں کی قبر پر فاتحہ پڑھنے میں ایک دن بھی ناغہ نہیں کیا تھا۔

اکتالیسویں روز اس کی مراد بر آئی۔ جب بازار میں ڈاکٹر کی دکان سے دوائی لینے کے بہانے شریفاں ایک اور لڑکی کے ساتھ آئی۔ اس دکان پر قریباً روزانہ حنیف خاں چکر لگایا کرتا تھا۔ لڑکی کو دوائی والی لائن میں لگا کر اس نے جب حنیف خاں کو یہ خوشخبری سنائی تو اس کا دل اتنا زور سے دھڑکا۔ جیسے ابھی جان کا پنجرہ توڑ کر باہر آن گرے گا----

زندگی میں اتنا کسی بات کا انتظار اس نے نہیں کیا تھا

وہ تو نجانے کب سے اس ساعت سعید کا منتظر تھا۔

اس گندے بازار کے ایک کونے میں کرائے پر لئے ہوئے ایک ٹوٹے پھوٹے کمرے کے ایک کونے میں رکھی گندی سی رضائی سے اس نے کلاشنکوف نکال کر اور اسے اپنے بازو کے نیچے دبا کر اوپر سے بڑی سی گرم چادر اس طرح اوڑھ لی کہ وہ اب اس کے جسم کا

حصہ ہی دکھائی دے رہی تھی۔

کمرے کے ایک کونے میں دھرے پلاسٹک کے کین کو اس نے کھول کر دیکھا۔ پٹرول کی پوری مقدار اس میں موجود تھی۔ وہ روزانہ جتنا پٹرول کم ہوتا۔ اتنا اس میں ڈال دیتا۔

آج اس پر ایک عجیب سانشہ طاری ہو گیا تھا---!

اس نے دوسرے ہاتھ سے کین اٹھایا اور اطمینان سے اپنی منزل کی طرف چل دیا

سورج اپنا سفر مکمل کر رہا تھا۔

شام کے منحوس سائے بازار میں پھیلے گناہوں کی سیاہی میں ڈھل رہے تھے۔ رات کی تیاریاں شروع تھیں۔ دکانیں سجنے لگی تھیں۔ بازار کی رونق بڑھنے لگی تھی۔

لوگ اپنے کاموں میں اس طرح منہمک تھے کہ کسی کو اس کی طرف دیکھنے کی مہلت ہی میسر نہیں تھی۔ حنیف خان بڑے اطمینان سے اس مکان تک پہنچا۔ اس کی سیڑھیوں کے نیچے بنی جگہ پر اس نے پٹرول کا کین آرام سے رکھ دیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اوپر پہنچ گیا۔

سامنے والے کمرے میں ایک ڈھلتی عمر کی موٹے جسم والی نائکہ۔اور کوٹھے کا دلال نذیرے کے ساتھ کسی بات پر زور دار قہقہے لگا رہا تھے۔ جب اس نے پاؤں کی زور دار ٹھوکر سے دروازہ کھول دیا۔

تینوں نے کسی برقی عمل کے تابع اپنی گردنیں روبوٹ کی طرح اس کی طرف گھمائیں۔ تو حنیف خان نے ان کی طرف کلاشنکوف تان رکھی تھی----!!

"حنیف خان تم----"

خدا جانے صرف یہ تین الفاظ ادا کرنے کے لئے نذیرے کو کتنا زور صرف کرنا پڑا۔

"ہاں میں---- تمہاری موت---- کتے کے پلے---- تم مجھ سے بچ کر کہاں جا سکتے تھے---- حرام خور---- ذلیل انسان تیرا انجام اس بازار کی تاریخ بن جائے گا----"

اس کی آنکھوں سے کون اور آواز سے قہر برس رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ اس کے منہ سے کوئی دوسری بات نکلتی۔ حنیف خان نے پورے زور سے لات نائکہ کی کمر پر رسید کر دی جس نے ہوشیاری دکھاتے ہوئے ایک طرف ہٹنا چاہا تھا اس کا منہ دیوار سے ٹکرایا اور زمین پر گر کر چیخنے لگی۔

"مم میرا کوئی قصور نہیں----"

دلال نے ہاتھ باندھ دیئے

"ہٹ جا----"

حنیف خان نے اتنے زور سے اسے کہا کہ وہ لرز کر پرے ہٹ گیا۔

اس نے نذیرے کو بندوق کی نوک پر سیڑھیوں کی طرف دھکیلا اور جیسے ہی وہ سیڑھیوں پر پہنچا پوری قوت سے حنیف خاں نے اس کی کمر میں لات رسید کی۔

نذیرا موچی لڑھکنیاں کھاتا سیڑھیوں سے باہر سڑک پر گر پڑا----

حنیف خاں فرشتہ اجل بن کر اس کے سر پر موجود تھا----

اس نے زمین پر گرے نذیر موچی کی ٹانگوں میں دو گولیاں ماریں اور وہ زخم خوردہ کتے کی طرح چیخنے لگا----

بازار میں شور مچاتی زندگی پر موت کے سائے منڈلانے لگے۔ حنیف خاں نے بڑے اطمینان سے پٹرول کا ٹین باہر نکالا اور اس پر الٹ دیا----

سارے بازار پر دہشت طاری تھی----

لوگ خوفزدہ ہو کر کونوں میں سمٹ گئے تھے

ابھی اس نے اپنی جیب سے ماچس نکالی ہی تھی جب سیڑھیوں سے چیختی ہوئی شریفاں نیچے اتر آئی----

نہیں حنیف خان---- خدا کے لئے نہیں، تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا----

اس نے اپنے ہاتھ میں گوشت کاٹنے والی چھری پکڑ رکھی تھی۔

حنیف خان نے خون ٹپکتی آنکھوں سے ایک لمحے کے لئے اس کی طرف دیکھا اور اپنا ہاتھ روک لیا۔ جیسے اسے چند سیکنڈ کی مہلت دے کر اس کے احسانات کا بدلہ چکانا چاہتا ہو۔

شریفاں بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اس پر پل پڑی۔ اس نے عالم وحشت میں اس کے جسم پر جانے کتنے گھاؤ لگا دیئے پھر نڈھال سی ہو کر گر پڑی----

نذیرا ذبح ہوتے بکرے کی طرح ڈکراتا ہوا اس سے رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔

لیکن----

حنیف خان کو جیسے اپنے گرد اگرد کی کچھ خبر ہی نہیں تھی۔

اس نے کین کا باقی پٹرول اس پر انڈیلا اور پرے ہٹ کر جلتی ہوئی ماچس کی تیلی اس پر پھینک دی۔

نذیرے کا گناہ آلود بدن یوں دھماکے سے جلا تھا جیسے اس میں بارود بھرا ہوا ہو۔۔۔۔

ایک ڈیڑھ منٹ تک اس کی چیخیں سنائی دیں پھر جیسے اس کا گلا ہی بند ہو گیا تھا۔

یہ منظر اس بازار کی تاریخ بن چکا تھا۔

کوٹھے سے پانچ چھ لڑکیاں بھاگ کر نیچے آ گئی تھیں جو دیوانہ وار اس کے بدن کے الاؤ کے گرد چیختی چلاتی ناچ رہی تھیں ان پر دیوانگی کا عالم طاری تھا نذیرے کی چیخ کے ساتھ وہ زیادہ تیزی سے قہقہے لگا کر چیخ چلا رہی تھیں۔

یہ وہ بدقسمت لڑکیاں تھیں جنہیں اس نے مختلف شہروں اور دیہاتوں سے ورغلا کر اغواء کیا اور اب انہیں عورت سے فاحشہ بنا ڈالا تھا۔

آہستہ آہستہ اس پر خاموشی طاری ہو گئی۔

کسی نے شاید پولیس کو خبر کر دی تھی تھانے والوں کو جب یقین ہو گیا کہ اب "تماشا" ختم ہو چکا ہو گا تو وہ بھاگتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔

لیکن-----

حنیف خان وہاں نہیں تھا

نیم پاگل شریفاں کو وہ دھکے مارتے تھانے لے گئے۔

اس روز رات گئے وہ آخری مرتبہ اپنے گھر میں داخل ہوا تو بے اختیار اپنے نیند میں سوئے بیٹے کو سینے سے لگا کر چومتا رہا۔

"بس ماما----- صبح میں پیش ہو جاؤں گا تم نے جو بندوبست کرنا ہے کر لو-----"

اس نے نذر محمد سے کہا جو حیرانگی اور بھیگی آنکھوں سے اس کی طرف ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔

ایم این اے کے امیدوار سردار رشید اور نزدیکی دیہاتوں کے پندرہ بیس معززین کی موجودگی میں ایس ایس پی کے سامنے انہوں نے حنیف خان کو پیش کر دیا-----!!

ڈیڑھ سال تک مقدمہ چلتا رہا۔

اس پر بے شمار الزامات تھے-----

لیکن-----

پولیس ملازمین نے یہاں بھی نااہلی کا مظاہرہ کیا اور ڈھنگ کا کیس بھی تیار نہ کر سکے ریاست شاہ کے قتل کا سارا بوجھ فضل شاہ اپنی زندگی میں عالم داد پر ڈال گیا تھا۔ اس کیس میں وہ بری ہو گیا۔

سردار مرید کے لواحقین نے اس سے صلح کر لی تھی۔

نذیرے کے بہیمانہ قتل کو وکیل صفائی نے جوش انتقال میں حنیف خان کا "انتقامی اقدام" ثابت کر دیا۔ نذیرے کے خلاف دس لڑکیاں عدالت میں پیش ہوئی تھیں جنہوں نے اس کی شخصیت کے ایسے گھناؤنے پہلو عدالت کے سامنے پیش کئے کہ سرکاری وکیل کے لئے اس کے قتل کی وکالت کرنا مشکل پڑنے لگا۔

جب یہ بے کس اور بے بس عورتیں جو آج زندہ درگو ہو چکی تھیں۔ عدالت کو چیخ چیخ کر اپنے جسموں پر ڈھائے تشدد کے نشانات دکھاتیں تو محترم جج صاحبان بے اختیار اپنی آنکھوں پر ٹشو پیپر رکھ لیتے۔

عمردین اور اس کے بھائی کو شدید زخم آنے کے جرائم میں اسے دس سال قید بامشقت ہو گئی۔ جس روز وہ جیل کی طرف جا رہا تھا اس روز پہلی مرتبہ اس کی مرضی کے خلاف اور اجازت کے بغیر نذر محمد اس کے پانچ سالہ بیٹے کو اس کی ایک جھلک دکھانے لے آیا-----"

حنیف خاں کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور چپ چاپ جیل چلا گیا ساری جیل اس کے لئے دیدہ و دل فراش راہ کئے ہوئے تھے۔

لیکن-----

وہ اب نتھو خان بدمعاش کا بیٹا نہیں ایک زخم خوردہ انسان تھا جس کے سینے پر سب سے گہرا گھاؤ اس کی بیوی کی موت کا تھا-----

سردار رشید کی مہربانیوں سے اسے دو تین ماہ بعد کسی نہ کسی بہانے پولیس گارڈ صغراں اور اس کے والدین کی قبروں پر لے جاتی تھی۔

تین سال مزید زندہ رہ کر نذر محمد نے جینے کا حق ادا کر دیا وہ ہر ہفتے باقاعدگی سے اپنی بیٹی کی قبر پر جاتا رہا۔ اس کی موت پر سردار رشید کی مہربانی سے جو اب شمشیر نگر کے تعاون سے ایم این اے بن چکا تھا۔ پیرول پر رہا کر کے پولیس اپنی حفاظت میں گاؤں لے آئی۔

اس کا بیٹا ایک وقت میں قرآن بھی حفظ کر رہا تھا اور سکول بھی جا رہا تھا----!

نذر محمد کی موت پر نمبردار احمد دین اس کنبے کا باپ بن گیا۔ اس نے نذر محمد کی دونوں بیٹیاں یوں بیاہیں کہ شمشیر نگر اور گرداگرد کے مکین انگشت بدنداں رہ گئے۔

مختلف معافیاں ڈال کر حنیف خاں کو سات سال بعد رہائی مل گئی----!

جیل کے دروازے پر شمشیر نگر اور دوسرے دیہاتوں کے سینکڑوں دیہاتی پھولوں کے ہار لئے اس کے منتظر تھے۔

ان میں سب سے نمایاں چہرہ حافظ عابد خاں کا تھا جو سکول کے ہوسٹل سے اپنے باپ کو لینے آیا تھا۔

آنسوؤں سے تر داڑھی اور ڈبڈبائی آنکھوں سے اس نے اپنی دونوں بانہیں عابد کاں کے لئے کھول دیں۔ بیٹا سینے سے لگا تو اس کے سینے میں دھکتے آلاؤ پر جیسے برف سی جم گئی۔

"ماں یاد آ رہی ہے ابا جی----"

عابد خان نے فیروز چچا کی کار میں اپنے باپ کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

حنیف خان نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور بچوں کی طرح سسک پڑا۔

"ابا جی---- آپ کیوں روتے ہیں---- میں ہوں نا---- آپ کا بیٹا عابد خاں' میں ہوں نا---- میں ساری زندگی آپ کی خدمت کروں گا----"

عابد خان نے بھرائی آواز میں کہا۔

"بس کر حنیف خاں---- تیرا بیٹا جوان ہو گیا ہے---- اوئے گھبرو بیٹوں کے باپ نئیں رویا کردے بزدل----"

فیروز کا گلا رندھ ہو گیا۔

دھوپ کی نرم کرنیں صغراں کی قبر کو تھپکیاں دے رہی تھیں۔ جب دونوں باپ بیٹا وہاں پہنچے----

وفا کی دیوی کی دعا کو اٹھے ان کے ہاتھوں پر ان کی آنکھوں سے آنسو تواتر سے ٹپک رہے تھے' جیسے ساون بھادون کی جھڑی لگ گئی ہو----

حنیف خان نے دعا کے اختتام پر اپنی آنسوؤں میں بھیگی ہتھیلیاں چہرے پر پھیریں تو

سارا چہرہ دمک اٹھا۔

اس کے گناہوں کی ساری سیاہی ان آنسوؤں کے ساتھ بہہ گئی تھیں----



۱۰ اپریل ۹۴ء

۸۴۔ راوی روڈ' لاہور